خلافت راشدہ
عصر حاضر میں فلاح انسانیت کیلئے جدید ترین معاشرتی نظام
زید حامد

نام کتاب: خلافت راشدہ

مصنف: سید زید زمان حامد

ناشر: براس ٹیکس، راولپنڈی

تقلیبِ حروف: براس ٹیکس ٹیم

کتابت و آرائش: وقار احمد صدیقی

تاریخ اشاعت: مارچ ۲۰۱۳ء

راولپنڈی، پاکستان

فون:051-5598046-7

موبائل:0321-5001370

ویب سائٹ:www.zaidhamid.pk

ای میل:zaidhamid@zaidhamid.pk

سیدی و مرشدی رسول اللہ ﷺ

کی خدمتِ اقدس میں

ہدیۂ عشق و ادب

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ِہندی، نطق اعرابی
کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا

(علامہ اقبالؒ)

فہرست

پیش لفظ

زیرنظر کتاب معروف تجزیہ نگار اور دفاعی مبصر جناب زید حامد کے خلافت راشدہ سے متعلق ان پروگراموں پر مبنی ہے جو ٹی وی ون پر نشر کیے گئے۔ مجوزہ پروگراموں کو تقلیب حروف یعنی ٹرانسکر ائیب (ریکارڈنگ کو حروف میں ڈھالنے کا عمل) کر کے کتاب کی شکل دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ کتابی صورت میں ڈھالتے ہوئے جملوں اور مواد کو اردو زبان اور گرائمر سے ہم آہنگ کرنے کی غرض سے معمولی تدوین عمل میں لائی گئی۔ بہرکیف پروگراموں کے مفہوم اور ہیت کو حد درجہ برقرار رکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

اس حوالے سے قارئین کے تعمیری مشورے اور تجاویز ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہوں گے۔

شہزاد مسعود رومی
سینئر تجزیہ نگار
براس ٹیکس

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
اے کہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

(اقبالؒ)

''میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سر بلند دیکھوں ۔میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں اور میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا''

قائداعظم محمد علی جناحؒ

(خطاب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

۱

خلافت راشدہ: ایک مثالی دور

خلافت راشدہ سے مراد وہ دور ہے کہ جب حضور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد چاروں خلفائے راشدین، سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ، سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا علیؓ، نے اپنے دور حکومت میں جو تہذیب، جو تمدن اور جو نظام قائم کیا وہ مستقبل کے تقاضوں سے اس قدر ہم آہنگ اور اتنا حیرت انگیز ہے کہ اب قیامت تک آنے والے کسی دور میں انسان اس سے بہتر نظام تشکیل نہیں دے سکتا۔ اُس دور میں انسانیت کو جو عزت اور مقام دیا گیا اور جو معاشرہ تشکیل دیا گیا اور جو اس کے روحانی، سیاسی، معاشی اور عسکری پہلو تھے وہ اس قدر حیرت انگیز تھے کہ جس کو بنیاد بنا کر آنے والے وقتوں میں مسلمانوں نے اپنی وہ تہذیب قائم کی کہ جس سے دنیا کی آنکھیں آج تک خیرہ ہیں۔ اس سے بہتر تہذیب انسانوں نے آج تک نہیں دیکھی۔ وہ ایسا معاشرہ تھا جو اپنے وقت کے لحاظ سے صدیوں آگے تھا۔ حتیٰ کہ آج اکیسویں صدی میں بھی وہ معاشرہ ایسا لگتا ہے جیسے صدیوں آگے ہو۔ اس سے پہلے رومی اور فارسی سلطنتیں تھیں۔ چین کا اپنا ایک نظام چل رہا تھا۔ مگر جس طرح ظلم وستم اس وقت جاری تھا اور ان بڑی طاقتوں نے انسان کو انسانوں کی غلامی میں دبایا ہوا تھا اس سے انسانیت کی دھجیاں بکھیری جاتی تھیں اور انسانی حقوق کو پامال کیا جاتا

تھا۔فساد پھیل گیا تھا سمندر میں اور زمین پر ان لوگوں کے ہاتھوں جو اس وقت دنیا میں حکومت کر رہے تھے۔ان کے مقابلے میں حضورﷺ ایک انقلاب برپا کرتے ہیں اور ایک روحانی پیغام لیکر آتے ہیں۔ آپﷺ کے تیئس سالہ دورِ نبوت میں سے دس سال مدینہ میں گزرے۔مدنی دور وہ ہے کہ جس میں پہلی مرتبہ ایک اسلامی نظریاتی ریاست تشکیل دی جاتی ہے۔اس ریاست میں حضورﷺ نے جو ریاستی حدود قائم کیں، جو اخلاقی، سیاسی اور معاشی نظام تشکیل دیئے، جو انسانیت کو رواداری اور مواخات کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں، وہ انسانوں کے تصورات سے بھی باہر ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ معاشرہ جہاں چند سال پہلے تک بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا اور پانی پلانے پر چالیس چالیس سال جنگیں ہوتی تھیں، اس معاشرے کے لوگوں کو آپﷺ نے فقط چند سالوں میں انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد وہاں پر جو نظام اور طرزِ حکمرانی قائم کیا گیا اس کا تسلسل یہ تھا کہ حضورﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد جب خلفائے راشدین کا دور آیا کہ جس کو ہم خلافت راشدہ کہتے ہیں، اس دور میں اسلامی ریاست مدینہ سے نکل کر ایک طرف تو فارسی اور رومی سلطنتوں سے ٹکرائی اور دوسری طرف چین کی طرف پھیلتی گئی، اور شمالی افریقہ اور نیچے یمن تک جزیرہ نما عرب میں اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔اس زمانے میں انسانیت نے اس سے بڑی روحانی ریاست نہیں دیکھی تھی جو مسلمانوں نے صرف تیس سال کے عرصے میں قائم کی۔اس کے بعد قائم ہونے والی بنوامیہ، بنوعباس، اندلس کی تہذیب اور آنے والے وقتوں میں عثمانی خلافت جب قائم ہوئی تو ان کی بنیادیں بھی اسی خلافت راشدہ کے نظام پر تھیں کہ جو اس وقت مدینہ کی اس ریاست میں ان خلفائے راشدین نے قائم کیا اور یہاں سے وسعت دے کر پوری انسانیت میں اس کو پھیلایا اور دنیا میں یہ انقلابی پیغام لے کر گئے۔آج یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس جدید دور میں خلافت راشدہ کا کیا کردار ہے اور کیوں ہم اس نظام کو قائم کریں؟

آج ہم دنیا میں تاریخ کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکے ہیں۔اکیسویں صدی کے آغاز پر اس کائنات میں ایک عظیم الشان تبدیلی آ رہی ہے یعنی تمام تر نظام تبدیل ہو رہے ہیں، روحانی طور پر بھی اور ظاہری دنیا میں بھی۔کفر نے بیسویں صدی کے آغاز میں اپنے نظام قائم کیے تھے جب انہوں نے پہلی مرتبہ فیڈرل

ریزرو بینک کے قیام کے بعد ایک سرمایہ دارانہ معاشی نظام تشکیل دیا۔اس کے بعد سیاسی جمہوریت قائم کی۔ اس کے مقابلے پر اشتراکیت اور آمریت کا ایک اور جابرانہ نظام متعارف کروایا اور دنیا کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انہوں نے خلافت اسلامیہ کے حصے بخرے بھی کر دیئے۔ اگر چہ وہ کمزور حکومت تھی مگر ایک مسلمان ریاست تھی جس کا ایک خلیفہ اور ایک مرکز تھا اور یہ وہی خلافت کا تسلسل تھا جو خلافت راشدہ سے چلا آرہا تھا۔ خلافت کا یہ جو نظام ہے، ہمارے دین کا بنیادی تصور ہے اور مسلمانوں کیلئے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انتہا پسند جنونی مسلمانوں اور دہشت گردوں کا دیا ہوا تصور نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایمان کا بنیادی جزو ہے۔اس سے پہلے اسلامی تاریخ کے تیرہ سو سالہ دور میں کوئی بھی وقت ایسا نہیں آیا کہ جب خلافت کو ختم کر دیا گیا ہو۔ جب چنگیز خان اور تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے مرکزِ خلافت کو تباہ کیا تو وہ بھی ایک عارضی خاتمہ تھا۔ مسلمانوں نے اس کے فوراً بعد ہی دوبارہ خلافت قائم کر لی تھی۔لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد کفار نے خلافت ختم کر دی اور آج تک مسلمان اسے دوبارہ قائم نہیں کر سکے۔

آج پوری دنیا کو کفر کے نظاموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ نظام تقریباً دو سو سال پہلے سے تشکیل پانا شروع ہو گئے تھے جب بینکنگ کا ادارہ قائم ہوا، معیشت پر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور کاغذی کرنسی کو فروغ دینا شروع کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ انیسویں صدی کے آخر میں ذرائع ابلاغ نے اپنے قدم مضبوطی سے جمانے شروع کیے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں برقی ذرائع ابلاغ بھی آ گئے۔ پھر کفر کے اس نظام کو نافذ کروانے کیلئے پہلی اور دوسری جنگ عظیم برپا کی گئیں۔ ایسے ایسے تصورات دیئے گئے کہ جن کا سوائے دیوانگی، جنون اور وحشت کے علاوہ کسی چیز سے واسطہ نہ تھا۔ مثلاً ڈارونزم، لبرل ازم، سیکولرازم، آزادیء اظہار رائے، آزادیء نسواں، جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت وغیرہ۔

اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

آزادیٔ نسواں کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں:

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

پوری انسانیت کو آوارہ اور تباہ و برباد کر کے غلام بنا دیا۔ انسانیت جس قدر ذلیل و رسوا اور محروم بیسویں صدی میں ہوئی ہے اس سے پہلے ہزاروں سالوں میں کبھی انسانوں پر اتنا ظلم نہیں ہوا۔ بیسویں صدی انسانوں پر ظلم کی صدی تھی۔ گزشتہ آٹھ سو سالوں میں اتنے انسان نہیں مارے گئے جتنے دجالی نظام نے بیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں ہلاک کر دیئے۔ تصور کیجئے کہ کفر نے کس قدر ظالمانہ، ناپاک اور پلید نظام انسانیت کے سر پر مسلط کر دیا ہے اور روشنیاں

اس کے گرد ایسی قائم کی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئی ہیں اور انہیں ایسا لگ رہا ہے کہ ان کیلئے جمہوریت، سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظام کے علاوہ کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے۔

صرف دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک یہ تقریباً بیس کروڑ سے زائد انسان قتل کر چکے ہیں۔ کہیں یہ جنگیں برپا کر کے، کہیں قحط برپا کر کے اور کہیں آپس میں قتل و غارت گری کروا کر۔ جس طرح روانڈا میں انہوں نے ہوٹو اور ٹٹسیز قبیلوں کی جنگ کروائی اور دو مہینے میں چھ سے آٹھ لاکھ لوگ مروا دیئے۔ پوری دنیا میں ان کا قتل و غارت آج بھی جاری ہے۔ کہیں بیماریاں پھیلا کر، ایڈز جاری کر کے، کہیں دوائیوں کی

ترسیل روک کر، خوراک کنٹرول کر کے۔ یہ نظام اس قدر ناپاک، شیطانی اور دجالی ہے کہ نا قابل یقین۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام

جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

قائداعظمؒ کو پاکستان میں تمام مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ مخلص سمجھتے ہیں اور ''روشن خیال'' مغرب پسند بھی قائداعظمؒ کو اپنا رول ماڈل خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں قائداعظمؒ کا اسلام چاہیے۔ قائداعظمؒ کا اسلام اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ۱۹۴۸ء میں کی جانے والی ان کی وہ تقریر دیکھ لیں جو انہوں نے سٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے کی۔ اس موقع پر قائداعظم نے کم وبیش وہی الفاظ دہرائے جو ہم بیان کر رہے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جدید معاشی نظام نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب کوئی معجزہ ہی انسانیت کو اس تباہی سے بچا سکتا ہے۔ اب اور کوئی راستہ انسانیت کے پاس نہیں رہ گیا۔ اس نظام نے دنیا میں بے شمار جنگیں برپا کروائی ہیں اور انسانوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ انسان کو غلام بنا دیا ہے۔ اب صرف انسان کے پاس فلاح کی راہ یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشی نظام عدل کی طرف لوٹیں۔ انہوں نے کہا کہ میں سٹیٹ بینک سے یہ توقع کرونگا کہ وہ پاکستان کے اندر ایک اسلامی معاشی نظام قائم کرے تا کہ یہ نظام آنے والے وقتوں میں پوری دنیا کے لیے رول ماڈل بھی بنے اور پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست میں بھی تبدیل کیا جا سکے۔ یہ قائداعظمؒ کی آخری تقریر تھی۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔

موجودہ کفر کے نظام کے تین بنیادی ستون اور پہلو ہیں۔ ایک اس کا سیاسی ستون ہوتا ہے۔ ہم سے کہتا ہے کہ جمہوریت اپنا لو یا آمریت۔ دونوں ہی کفر کے نظام ہیں۔ جس طرح دنیا کو تقسیم کرنے کیلئے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام ان کے لیے ضروری ہیں اسی طرح کفار نے دنیا کو سیاسی طور پر بھی تقسیم کرنے کیلئے دو سیاسی نظام دیئے ہیں اور دونوں کو یہ خود کنٹرول کرتے ہیں۔ دونوں کو صیہونی بینکار چلاتے ہیں۔

دونوں کے پیچھے وہی عالمی طاقتیں کارفرما ہیں چاہے جو کبھی اقوام متحدہ کے ذریعے کام کرتی ہیں اور کبھی عالمی بینکاروں کے ذریعے۔ ان کے پیچھے دراصل ہوتے وہی صیہونی ہی ہیں۔ وہ دنیا پر ایک بہت بڑی عالمی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیادیں صیہونیت پر استوار ہوں جسے شریعت کی اصطلاح اور حدیث شریف میں دجال کا نظام کہتے ہیں۔ ایک طرف یہ ہمیں دو سیاسی نظام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں۔ جمہوریت اختیار کرلو یا پھر آمریت۔ آمریت بری ہے لہذا جمہوریت اپنالو۔

دوسری طرف معاشی نظام بھی دو متعارف کروائے جاتے ہیں۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام اپنا لو۔ اگر وہ نہیں اپنانا چاہتے تو اشتراکیت اپنالو۔ اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ انسان کے پاس اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ آپ کو اب کرنا ہے اسی کفر کے نظام میں رہ کر ہی راستہ تلاش کیجیے۔ سیاسی اور معاشی نظام کے بعد جو تیسرا نظام یہ ہمیں دیتے ہیں وہ ان کا عدالتی نظام ہے۔ عدالتی نظام میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہی کچھ ہوگا جو ہم آپ کو بتائیں گے مثلاً سیشن کورٹ ہوگی، ہائی کورٹ ہوگی سپریم کورٹ ہوگی، انگریز کا بنایا ہوا قانون چلے گا، وہی وکیل ہوگا جو اس کو چلائے گا۔

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق

طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

گرمیِ گفتار اعضائے مجالس، الاماں!

یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اور پھر ذرائع ابلاغ کو ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ برنارڈ لوئیس مغرب کا بہت متعصّب اور بڑا مستشرق ہے۔ وہ عظیم سکالر مانا جاتا ہے۔ وہ اسلامی نظام کو بھی سمجھتا ہے اور پھر کفار کو یہ مشورے دیتا ہے کہ اسلامی دنیا کو کیونکر کمزور کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بہت تحقیق کر کے مغربی تہذیب کا موازنہ اسلامی تہذیب سے کیا ہے اور اس حوالے سے بہت سی کتب بھی لکھی ہیں۔ برنارڈ لوئیس اپنی کتاب میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ کفر کے نظام کی بنیاد دو پیشوں پر ہے۔ اور ذرا ہوش اور حیرت سے غور کیجیئے گا کہ یہ دو پیشے کونسے ہیں جو کفر

کے نظام کو سہارا دیئے ہوئے ہیں؟ ایک صحافت ہے اور دوسرا وکالت۔ صحافیوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے جھوٹ، پراپیگنڈہ اور کفر پھیلایا جاتا ہے۔اس نظام میں جھوٹ پھیلانے کی زبردست صلاحیت موجود ہے جس کے ذریعے انسانوں کوانسانوں کا غلام بنایا جاتا ہے۔ یہ بہت کثرت سے اور بہت بڑے پیمانے پر جھوٹ بولتے ہیں۔ان کے پاس بہت مضبوط ذرائع ابلاغ ہیں جن میں مصنوعی سیارے، نیوز چینلز، کیبل نیٹ ورکس، اخبارات اور رسائل شامل ہیں لہذا رائے عامہ تبدیل کرنے کے لیے صحافی انکی اہم ترین ضرورت ہیں۔ اسی لیے آزادیءصحافت اور آزادیء افکار کا یوں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور صحافیوں کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں جیسے صحافت سے زیادہ مقدس پیشہ کائنات میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ صحافی کے پروں پر پانی نہیں پڑسکتا۔ ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ ان کو روکا نہیں جاسکتا چاہے وہ جو مرضی جھوٹ بولیں، جو مرضی فراڈ کریں، جسے چاہیں رسوا کریں، قوموں کو تباہ کریں یا حکومتوں کے تختے الٹ دیں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ ''آزاد میڈیا'' ایک حقیقت ہے یا بی بی سی بہت سچ بولنے والا ادارہ ہے۔ میرے ایک دوست نے جو کہ Associated Press میں کام کرتے تھے، مجھے اندر کے راز بتائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں یہ ہدایات دی جاتی تھیں کہ ہمیشہ اسرائیل کو معصوم بنا کر پیش کرنا ہے، فلسطینیوں کو دہشت گرد ثابت کرنا ہے، ایرانیوں کو بنیاد پرست دکھانا ہے، پاکستانیوں کے متعلق یہ پراپیگنڈہ کرنا ہے کہ وہ سب طالبان ہیں اور ان کے ایٹمی ہتھیار دہشت گردوں کے قبضے میں جانے والے ہیں اور یہ مذہبی انتہا پسند قوم ہے لہذا اسے تباہ کر دینا چاہیے۔یعنی صحافیوں کو باقاعدہ ہدایات دے کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام کروایا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر خبر جو اے پی، اے ایف پی اور بی بی سی سے نکلتی ہے ان کے بنیادی معیارات یہی طے کرتے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی غیر جانبدارانہ صحافت نہیں کی جاتی۔ یہ تصور غلط ہے کہ ذرائع ابلاغ آزاد اور شفاف ہیں۔اس سے بڑا جھوٹ بذات خود کوئی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ میڈیا، جو چوتھا ستون ہے ان کی ریاست کا، ان کے کفر کے نظام کا، اس کا مقصد پوری کائنات میں غلط اطلاعات اور جھوٹ کو پھیلانا ہے۔اس کے ذریعے یہ لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کرتے ہیں۔

برنارڈ لوئیس کے مطابق کفر کے نظام کا دوسرا ستون وکلاء ہیں۔ جب بھی کفر کا نظام، جو کبھی اقوام متحدہ اور کبھی عالمی عدالت انصاف کے ذریعے، ہم پر مسلط کیا جاتا ہے اور ان کا معاشی نظام، جو آئی ایم ایف اور

ورلڈ بینک کی شرائط کے تحت ،ملکوں میں نافذ ہوتا ہے ،اس کے تمام معاہدے ان کے بین الاقوامی وکلاء لکھتے ہیں۔ یہ فیصلہ وہی کرتے ہیں کہ آئین کس طرح لکھا جائیگا؟ جمہوریت کے قوانین کیا ہونگے؟ کس ملک میں کتنی سیاسی جماعتیں ہونی چاہیں؟ انتخابات کس طرح کروائے جائیں گے؟ آج بھی امریکی ماہر یہاں آکر ہمیں لیکچر دیتے ہیں کہ جمہوریت کس کو کہتے ہیں؟ پارلیمانی جمہوریت کس طرح چلتی ہے؟ اس جمہوری نظام کے نفاذ کے لیے مختلف قسم کے کورسز کرائے جاتے ہیں اور ہمارے سیاسی رہنما بڑے ادب سے وہ لیکچرز سنتے ہیں اور انہیں چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ امریکہ نے ہمیں بتایا ہے کہ جمہوریت کس طریقے سے اس ملک پر مسلط کی جائے گی۔

اور اسی طرح ان کے معاشی و بینکاری کے نظام کی شرائط وقوانین وتبلیغ بھی ان کے وکلاء اور صحافی کرتے ہیں۔ یہ دو پیشے ایسے ہیں کہ جن کی بنیاد پر کفر کا پورا نظام چل رہا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا، یہ برنارڈ لوئیس کہہ رہا ہے، جو خود انکا راز دار آدمی ہے۔ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں ان کا تمام اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام زمیں بوس ہونے لگ گیا ہے کیونکہ یہ نظام ناقص اور انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔

اشتراکیت ختم ہوچکی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی خاتمے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ڈالر کی قدر کم ہوتی جارہی ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں امریکہ میں تقریباً دس لاکھ لوگ بے روزگار ہوئے ہیں۔ ساٹھ، ستر ہزار ڈالر سالانہ کمانے والے امریکی اب خیموں میں رہ رہا ہے۔ کیونکہ نوکری چھن جانے کی وجہ سے نہ وہ گھر کی قسط ادا کرسکتا ہے، نہ گاڑی کی۔ لہذا گاڑی بھی گئی اور گھر بھی۔ بذات خود وہ قوم بھی مظلوم ہے کیونکہ اس نظام نے ان کی اپنی قوم کو بھی تباہ و برباد کردیا ہے۔ اب

وہ ڈالر ختم کرکے نئی کرنسی لانے کی بات کررہے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ دنیا کی چھ ارب کی آبادی کو کم کرکے ایک ارب کردیں۔ یعنی چار سے پانچ ارب لوگوں کو یہ ہلاک کرنے جارہے ہیں۔ اس مقصد کیلئے

جنگیں، دوائیوں کی بندش، بیماریاں جیسے کہ برڈ فلو، سوائن فلو اور ایڈز وغیرہ اور خوراک کا قحط وغیرہ ان کے ہتھیار ہیں۔ انہی جیسے ظالموں کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ "شیطان نے انہیں چھو کر باؤلا کر دیا ہے"۔ یہ پاگل، دیوانے اور جنونی لوگ ہیں۔ ان کی ذہنیت فرعون جیسی ہے لہذا یہ اپنا نظام مستحکم کرنے کیلئے کروڑوں اربوں لوگوں کا خون کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ فرعون کو جب یہ پتہ چلا تھا کہ ایک بچہ پیدا ہوگا جو کہ اسکے نظام کیلئے خطرہ بنے گا تو اس نے ایک بچے کے خاتمے کیلئے لاکھوں بچے قتل کروا دیئے تھے۔ ان کو بھی یہ معلوم ہے کہ اگر کسی ملک میں اسلامی نظام قائم ہوگیا تو ان کے نظام کا خاتمہ یقینی ہے۔ اسی لیے جارج بش دو باتیں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمان بے شک اپنے عقائد پر عمل پیرا رہیں، نماز ادا کریں، حج کریں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر مسلمان شریعت کے نفاذ کی بات کریں گے تو ہم وہاں آگ لگا دینگے اور خلافت کی بات کرنے پر تو قیامت ڈھا دیں گے۔ جبکہ ہمیں حضور ﷺ کی احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری بھی یہی ہے کہ اگر خلافت قائم ہے تو اسے مضبوط کریں اور اگر خلافت نہیں ہے تو اسے قائم کریں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ایک ایسی خلافت ہے کہ جس کی بنیاد حضور ﷺ کی سنت اور مشن پر مبنی ہو اور اس خلافت کے قیام کی بشارت ہمیں نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ میں ہمیں واضح ملتی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ خلافت ختم ہو جائے گی اور پھر جو خلافت قائم ہوگی وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہوگی۔

آج کے دور میں یہ احساس زور پکڑتا جا رہا ہے کہ اگر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ آجائے تو وہ انسانیت پر احسان ہوگا۔ کیونکہ انسان نے اس سے بہتر نظام نہ پہلے کبھی دیکھا ہے، نہ پھر کبھی دیکھے گا۔ اگر ہم اس خلافت کا فقط دس یا بیس فیصد بھی نافذ کر دیں تو یقین کیجیئے کہ انسانیت اپنی معراج پا جائے گی۔ آج کے دور میں خلافت کے نظام پر لوگ کیا اعتراض کرتے ہیں؟ پاکستان میں ذرائع ابلاغ، دانشور طبقے اور سیاسی رہنماؤں کی طرف سے اس حوالے سے انتہائی مضحکہ خیز بحث شروع کر دی گئی ہے۔ ان لوگوں کی سوچ وفکر انتہائی محدود ہے یا پھر وہ کفر کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں کہ جو عوام کو اصل فکر اور سوچ کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ ایک طرف ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جمہوریت اس ملک کے مسائل کا واحد حل ہے اور آمریت سے زیادہ ناپاک نظام کوئی نہیں ہے۔ سیاسی رہنما فوجی حکومتوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ فوجی حکمران عذر پیش

کرتے ہیں کہ ہم حکومت اس لیے سنبھالتے ہیں کیونکہ سیاستدان حکومت چلانے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ یوں قوم اسی طرح تباہی کے دائرے میں گھومتی رہتی ہے۔

دوسری طرف ہمیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جدید مغربی طرز زندگی اختیار کرلو یعنی مادر پدر آزاد ہوجاؤ۔ جس میں دین، عزت وآبرو، ایمان سب چھوڑ دو، فحش حرکتیں کرو، اسی مغربی نظام تعلیم کے تحت انگریزی بولو۔ یا تو یہ نظام اپنالیں یا پھر اس کے ردعمل میں یہاں پر تحریک طالبان پاکستان جیسے دہشت گرد بیت اللہ محسود یا ملا فضل اللہ والی شریعت اپنالو۔ یعنی ملک میں فساد برپا کرواکے ان کی شریعت کے نام پر جاری دہشت گردی کو اسلام بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہ اسلام کا نظام ہے جو پاکستان میں آنے والا ہے یا جو پاکستان پر قبضہ کرنے جارہا ہے۔ یعنی ہمیں کہا جاتا ہے کہ بش یا بیت اللہ محسود میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو، جیسے کہ ہمارے پاس کوئی اور درمیانی راستہ موجود ہی نہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس ناپاک چکر سے نکلنے کیلئے تیسرا راستہ نکالیں۔ ہمیں نہ تو جدید جمہوریت چاہیے، نہ آمریت۔ ہمیں نہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام چاہیے نہ اشتراکیت، اور نہ ہی ہمیں یہ عدالتی نظام چاہیے جو کفر نے آج پوری دنیا اور پاکستان میں مسلط کیا ہوا ہے۔

اس کی ہم آپ کو دو مثالیں دیتے ہیں۔ پاکستان کو اس وقت دو بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ کرپشن اور دہشت گردی اور یہ دونوں کینسر پورا ملک ہڑپ کر گئے ہیں۔ اگر کوئی عدالتی نظام ملک کو درپیش قانونی مسائل حل نہیں کرسکتا تو ہم نے اس عدالتی نظام کا کیا کرنا ہے؟ پچھلے بیس سال کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک بھی کرپٹ آدمی کو جرمانے، پھانسی، کوڑوں اور قید کی سزا نہیں دی گئی۔ ملک میں دہشت گردی کا عفریت آئے بھی تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ لاکھوں لوگ شہید وزخمی ہوچکے ہیں اور ملکی سلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ مگر موجودہ عدالتی نظام کے تحت کسی ایک دہشت گرد کو بھی پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔ ملک دہشت گردی کی جنگ لڑ رہا ہے مگر عدالتی نظام تباہ ہوچکا ہے۔ گزشتہ تیرہ سال کے دوران کسی سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے کسی ایسے شخص کو پھانسی کی سزا نہیں سنائی جس نے خودکش حملہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ اگر یہ عدالتی نظام کرپشن اور دہشت گردی کا علاج نہیں کرسکتا تو پھر اسکا کیا فائدہ؟ یہ واضح ہوچکا ہے کہ یہ جج، یہ وکیل اور یہ عدالتی نظام بری طرح ناکام ہوچکا ہے۔ ایک مکان کے کرائے کا

مقدمہ بھی بیس بیس سال چلتا ہے تو پھر کونسا عدل اور کیسا انصاف؟ جب ملک میں عدالتیں انصاف مہیا نہ کررہی ہوں، دہشت گردی کی صورت میں فساد برپا ہوا اور ملک اور قوم تباہ ہورہے ہوں اور اسکے باوجود یہ کہا جائے یہی نظام تم ساری عمر اپنے سروں اور گردنوں پر مسلط رکھو تو پھر ہم کیا کریں؟

چونکہ یہ نظام کام نہیں کررہا لہذا اب ہمیں متبادل کو اپنانا ہے اور وہ متبادل نظام خلافت راشدہ ہے۔ یہ وہ نظام ہے کہ جس میں خلیفہء وقت کو بھی اپنی زرہ حاصل کرنے کیلئے عدالت سے رجوع کرنا پڑا اور عدالت نے خلیفہء وقت کے بجائے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ حضرت علیؓ اپنے سپاہی بھیج کر اس یہودی سے اپنی زرہ حاصل کرسکتے تھے مگر آپؓ نے عدالت سے رجوع کرنے کو ترجیح دی۔ اس رویے سے متاثر ہوکر وہ یہودی مسلمان ہوگیا۔ حضرت عمرؓ انتہائی جلیل القدر اور پرجلال خلیفہ تھے مگر آپؓ کے دور خلافت میں جب چادروں کی تقسیم ہوئی تو ایک بڑھیا نے بھی کھڑے ہوکر آپؓ سے یہ سوال کرلیا کہ ہم سب کو ایک ایک چادر ملی ہے، آپؓ کے پاس دو چادریں کیوں ہیں؟ جب تک آپؓ جواب نہیں دینگے ہم آپؓ کی بات نہیں سنیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی جب مسند خلافت پر فائز ہوئے تو لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ جب تک میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق چلوں، میری اطاعت کرنا۔ اگر خلاف ورزی کروں تو میری اطاعت مت کرنا۔ ایسی مثال کوئی اور نظام پیش کرسکتا ہے؟ اب بتایئے کیا وہ پتھر کا زمانہ تھا یا مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ ایک جدید ترین معاشرہ تھا؟

موجودہ معاشی نظام ہے ہی اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے جنگ۔ اس کی بنیاد سود در باء اور بینکاری نظام پر قائم ہے۔ جب پورے ملک کا معاشی نظام ہی اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے حالت جنگ میں ہوا اور اب جبکہ یہ نظام خود تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، ہمیں پھر بھی مجبور کیا جارہا ہے کہ یہی نظام اپنائے رکھو۔ یہی تمہاری دنیا و آخرت ہے اور اس کے علاوہ کوئی حل تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔ اس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

اور جہاں تک ہمارے سیاسی نظام کا تعلق ہے تو اس سے بڑا فساد اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ ڈھائی سو کے قریب سیاسی جماعتیں ہیں۔ استغفر اللہ۔ جو کتوں اور بلیوں کی طرح آپس میں لڑتے ہیں۔ نہ یہ ملک کا مفاد مدنظر

رکھتے ہیں، نہ دین کا اور نہ ہی امت وملت کی آبرو کا خیال کرتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں سیاسی رہنماؤں کیلئے کچھ اصول وضوابط مقرر کردیئے تھے۔ ایک شخص ان کیلئے ڈیڑھ روپے کی جرابیں خرید لایا۔ آپ نے یہ کہہ کر لوٹا دیں کہ ایک غریب ملک کے سربراہ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ڈیڑھ روپے کی جرابیں پہنے۔ جب گورنر جنرل ہاؤس کیلئے پینتیس سے چالیس روپے کا فرنیچر آیا تو اس میں ایک کرسی محترمہ فاطمہ جناح کیلئے بھی تھی۔ آپؒ نے فرمایا کہ اس کرسی کی قیمت بیت المال سے نہیں بلکہ فاطمہ سے لی جائے۔ قائداعظمؒ نے وزارت خزانہ کے علم میں لائے بغیر اپنے جہاز میں بھی ایک میز لگوائی تاکہ سفر کے دوران لکھنے میں آسانی رہے تو وزیر خزانہ نے اعتراض کیا کہ آپؒ نے اصول اور قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس پر قائداعظمؒ نے معذرت کی اور اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ اگر ہمارے بے شرم سیاستدان خلفائے راشدین والا کردار نہیں اپنا سکتے تو کم از کم قائداعظمؒ والا کردار ہی اپنا لیں۔ قائداعظمؒ کے مدنظر بھی خلفائے راشدین کا ہی کردار تھا۔ یہ بابرکت طرز زندگی اپنانے میں تو کوئی عار محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ قائد نے ایمانداری کا وہ معیار قائم کر کے دکھایا جو ہمارے موجودہ حکمران خوابوں میں بھی نہیں اپنا سکتے کیونکہ یہ حرام مال میں پلے ہوئے ہیں۔ یہ خیانت کی زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ مردار کھانے والے گدھ ہوں جو شاہین کی پرواز کا اندازہ ہی نہیں کرسکتا۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ اپنا شکار کیا ہوا جانور کھانے کا کیا مزہ ہوتا ہے۔ ہمارے سیاستدان بھی گِدھوں کی طرح مردار کھانے والے ہیں۔

اس لیے ہمیں اس قوم کو اب ان مثالی نمونوں کی طرف لے کر جانا ہے یہ بتانے کے لیے کہ ہمارے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام کس طرح کے تھے، انتظامیہ کیونکر کام کرتی تھی، وہ احکامات جو

سرکاری طور پر دربار خلافت سے جاری ہوتے تھے وہ کیا تھے؟ مسلمان حکمرانوں، گورنروں اور نوکر شاہی کو منتخب کرنے کا معیار کیا تھا؟ ان کا کردار کیا تھا؟ کیا وہاں جمہوریت تھی یا آمریت؟ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں ہونگی، چار سال بعد الیکشن ہونگے۔ کیا خلافت راشدہ میں یہ سب کچھ تھا؟ کیا تب سیاسی جماعتیں موجود تھیں؟ کیا حکومت اور حزب اختلاف کی خونریز قسم کی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں؟ کیا چار چار سال بعد انتخابات ہوتے تھے؟ کیا وہ کوئی تیسرا نظام تھا؟

آج ہمیں کفر کے نظام نے اتنا اندھا کر دیا ہے کہ ہمیں اپنی حقیقت، اپنی تاریخ نظر ہی نہیں آتی۔ عوام کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اسلامی سیاسی معاشی، معاشرتی اور عدالتی نظام ہیں کیا؟ ہمیں صرف انگریزوں کا نظام سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے۔ موجودہ نظام رومی قوانین کے مطابق ہے۔ پارلیمنٹ، سینیٹ وغیرہ جیسی اصطلاحیں بھی روم سے آئی ہیں۔ ہم لوگ رومی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں مگر اسلامی شرعی اصطلاحیں استعمال کرنے میں شرم آتی ہے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمیں چودہ سو سال پہلے والے دور میں لے جایا جارہا ہے۔ کیا آپ ہمیں پتھر کے دور میں لے کر جانا چاہتے ہیں؟ یہی اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں چودہ سو سال پہلے کے قوانین کیسے چلیں گے؟ اور وہ نظام خلافت کیسے قائم کیا جائے گا؟ خلیفہ کون ہوگا؟ کونسا مسلک نافذ کیا جائے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ بے شرم لوگ!!! جھوٹ بولتے ہیں۔ مکاری کرتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے جو نظام قائم کیا گیا تھا، کائنات نے اس سے بہتر نظام آج تک نہیں دیکھا۔ اقبالؒ وہ نظام قائم کرنے والوں کو پراسرار لوگ قرار دیتے ہیں۔ دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا تھے۔ پہاڑ ان کی ہیبت سے سمٹ کر رائی ہوجاتے تھے۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ایسی تہذیب قائم کی کہ جو چین سے لیکر شمالی افریقہ تک اور یورپ سے لیکر یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ موجودہ حکمران تو ایسی سلطنت کے قیام کا تصور بھی نہیں کر سکتے جہاں اس وقت تقریباً بیس سے پچیس کروڑ افراد رہا کرتے تھے۔ خلافت راشدہ میں ایک بھی جلوس یا ہنگامہ نہیں ہوا حکومت کے خلاف۔ امن عامہ کی صورتحال ایسی تھی کہ مہینوں عدالتوں میں کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوتا تھا۔ معاشی خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ لوگ زکوٰۃ لیکر پھرتے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ عدل کا یہ عالم تھا کہ عیسائی اور یہودی بھی انتہائی پرامن طریقے سے وہاں رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو ایک بھی عیسائی کو قتل نہیں کیا گیا۔ عیسائیوں نے بھی تسلیم کیا کہ ان کی کتابوں میں درج ہے کہ بیت المقدس شریف کی فتح کیلئے جو برحق حکمران آئیگا اس کی شان حضرت عمرؓ جیسی ہی ہوگی کہ خود پیدل ہیں مگر غلام کو اپنی سواری پر بٹھا رکھا ہے۔ آپؓ نے مدینہ سے بیت المقدس تک کا سفر اپنے غلام کیساتھ کیا۔ ان کے ہمراہ کوئی محافظ اور فوج نہیں تھی۔ ان کیلئے ٹریفک کی بھی کوئی بندش نہیں کی گئی۔ یہ اعلیٰ مثالی نمونے ان لوگوں نے پیش کیے کہ جن کے صدقے ہمیں سب کچھ ملا۔ اور ہمارے آج کے حکمران اب خود کو نعوذ باللہ ان سے بھی بڑا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پرانا دور تھا اور اب وہ واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اب وہ نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ بات حقیقت ہے کہ صرف ٹیکنالوجی تبدیل ہوئی ہے، انسان کی فطرت نہیں بدلی۔ انسان کی فطرت تو وہی ہے اور بندہ ءمومن کی ذمہ داری بھی۔ ہمیں اب اس دور کی طرف لوٹنا ہے جب ہمارے آباؤ اجداد نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز تھے۔

نگاہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز

یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

ہم نے اس دور کو دیکھنا ہے جہاں انہوں نے صداقت کا، عدالت کا اور شجاعت کا سبق پڑھا ہوا تھا۔ آج کی نسل کیلئے اقبالؒ کا پیغام بھی یہی ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور جن کی ہاں اور ناں میں اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے تبدیل کر دیتا تھا اور جن سے خدا خود پوچھتا تھا کہ بتا تیری رضا کیا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کیونکہ انہوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ سے وفا کی تھی۔ لوح محفوظ بھی ان کی تھی، قلم اعلیٰ بھی انہی کا تھا:

کی محمد ﷺ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

لہذا یہ جہاں ان کے سامنے ایسے سرنگوں کر دیا گیا تھا کہ وہ معجزات کرتے تھے۔ حیرت انگیز کارنامے ان کی زندگی میں معمول کی بات تھی۔ سیدنا عمرؓ نے فقط ایک خط لکھ کر دریائے نیل میں ڈالا اور اس نے ان کی مرضی کے مطابق چلنا شروع کر دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایران میں دریا کو حکم دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی فوج داخل ہو رہی ہے۔ خبردار! مسلمانوں کی کوئی چیز ضائع نہیں ہونی چاہیے اور دریا ان کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ کون لوگ تھے؟ وہ کونسا نظام تھا؟ وہ کونسا معاشرہ تھا؟ اور ایک خلیفہ کی بات اور اس کی برکت اتنے نیچے تک پہنچتی ہے کہ جب ایران کی فتح کے بعد وہاں سے مال غنیمت آیا تو اس میں ہیرے جواہرات، سونا چاندی کے اتنے ڈھیر تھے کہ حضرت عمرؓ نے حیران ہو کر دریافت فرمایا کہ یہ کون سی فوج ہے کہ جس کے سپاہی وہ خزانے لا کر جمع کروا رہے ہیں اور کوئی ایک اشرفی بھی اپنے پاس نہیں رکھتا، چوری نہیں کرتا، خیانت نہیں کرتا۔ ایک سپاہی جس نے سب سے زیادہ مال غنیمت جمع کروایا تھا، حضرت عمرؓ نے اسے بلوا بھیجا۔ جب وہ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اپنا چہرہ رومال سے چھپایا ہوا تھا۔ وہ بولا ''امیر المومنینؓ نے چونکہ بلوایا تھا لہذا میں حاضر ہو گیا ہوں مگر آپؓ نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اپنا تعارف بھی کراؤ۔ لہذا میں اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا کیونکہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، وہ اپنے رب کیلئے کیا ہے۔'' یہ کردار تھا ایک عام سپاہی کا بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حکمرانوں کا کردار خلیفہء راشد جیسا ہو تو ان کی برکت

کے اثرات نچلے طبقے کے شہریوں کو بھی ولی اللہ بنا دیتے ہیں۔

اب آپ بتائیے کہ وہ عہد مستقبل سے ہم آہنگ جدید ترین معاشرہ تھا یا پتھر کا دور؟ آج یہ اعتراض بے بنیاد ہے کہ ویسا معاشرہ قائم کرنے سے ہم کئی سو سال پیچھے چلے جائیں گے اور یہ کہ خلافت راشدہ کا نظام آج قائم نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں قائم نہیں کیا جا سکتا؟ اگر اس کا عشر عشیر بھی نافذ ہو جائے تو ہمارے دو جہاں کامیاب ہو جائیں گے۔اس کا ایک فیصد بھی ہم یہاں نافذ کر لیں تو ہمارے نصیب چمک جائیں گے۔

جس نظام میں اس وقت ہم رہ رہے ہیں، یہ کفر کا ناپاک ترین، پلید نظام ہے۔اس کا سیاسی، معاشی، عدالتی اور ابلاغی نظام مکمل حرام ہے۔ ہمیں اس نظام میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی تیسرا راستہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ہم رد کرتے ہیں اس بات کو۔ ہمیں نہ جمہوریت چاہیے نہ آمریت۔ ہم خلافت کی بات کرتے ہیں۔ہم ایک اسلامی معاشی نظام کی بات کرتے ہیں، ہم ایک اسلامی سیاسی نظام کی بات کرتے ہیں، ہم ایک اسلامی نظام عدل کی بات کرتے ہیں، جس نے پوری دنیا میں عدل کے وہ معیار قائم کیے تھے کہ انسانیت آج بھی انگشت بدنداں ہے۔

یہ مقصد ہے اس ساری کتاب کا۔ اس باب میں اس کا صرف پس منظر بیان کیا گیا ہے۔اگلے ابواب میں اس پس منظر کو مزید تفصیل سے بیان کیا جائے گا اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور کی مثالوں سے مسلمانوں کے اس نظام کی ایک جھلک دکھائی جائے گی کہ جس نے آنے والی صدیوں میں شاندار تہذیبوں کی بنیاد رکھی۔ جیسا کہ آٹھ سو سال تک اندلس میں، پھر اسی طرح عباسی اور عثمانی خلافتیں۔علاوہ ازیں ہم یہ بھی ثابت کریں گے کہ آج کے معاشی و سیاسی نظاموں اگر کوئی خیر ہے بھی تو وہ دراصل خلافت راشدہ سے ہی لی گئی ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظام موجود ہے۔ہم خلافت راشدہ کی طرف رجوع کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ آج کے دور میں ایک مسلمان ریاست اپنا نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی طرز پر کس طرح قائم کر سکتی ہے؟ (ان شاءاللہ)

۲

خلافت راشدہ کا فلسفہ

آپ اگر آج کی جدید دنیا میں سیاسیات کا مطالعہ کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ آج کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہمیں ہر قسم کا سیاسی نظام پڑھایا جاتا ہے، چاہے وہ جمہوریت ہو، آمریت ہو، ملائیت ہو یا موروثی بادشاہت۔ ان سب کا ذکر تو کیا جاتا ہے مگر خلافت کو نہیں پڑھایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت نظام خلافت اور خلافت کے تصور کو، لوگوں کی اجتماعی ذہنیت، فکر، سوچ اور معاشرے سے غائب کر دیا گیا ہے۔ جس طرح معاشی دہشت گردی کی کتاب میں ہم نے یہ کہا تھا کہ اس جدید سود اور رباء کے نظام کی جو حقیقت ہے وہ جان بوجھ کر ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نہیں پڑھائی جاتی تا کہ کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ یہ جعلی کاغذی کرنسی پر مبنی سود اور رباء کا نظام جو دنیا میں اس وقت قائم ہے، انسانوں کو غلام کس طرح بناتا ہے۔ یہ پورا نظام اور اس کے ذرائع ابلاغ، جو کہ Weapons of Mass Deception(WMD) ہیں، ان کے ذریعے یہ انسانیت کو گمراہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح تیرہ سو سال تک جو نظام مسلمان ریاستوں اور اسلامی تہذیب میں قائم رہا کہ جس کا آغاز خلافت راشدہ سے اور اختتام ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے سے ہوا، اسے جدید سیاسیات کی کتابوں سے یوں غائب کر دیا گیا جیسے کبھی وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس چودہ سو سال پرانے نظام کی وہ شکل دکھا کر یہ ثابت کریں کہ انسانیت کے پاس اب فلاح، بھلائی اور نجات کی کوئی اور راہ باقی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اب وہ دوبارہ اس روحانی طرز حکومت کی طرف لوٹیں اور اس سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدل کی طرف جائیں جو دنیا نے اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ کبھی اس کے بعد۔ دنیا میں بڑی بڑی تہذیبیں جو اس نظام پر قائم ہوئیں ان کا آغاز خلافت راشدہ سے ہوتا تھا۔ یہ نظام اپنی خالص، پاکیزہ اور مطہر شکل میں پہلے تقریباً تیس برس تک قائم رہا اور بعد میں آنے والی تمام مسلم تہذیبوں پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہر مسلمان تہذیب چاہے بنو امیہ ہوں یا بنو عباس، اندلس ہو یا خلافت عثمانیہ، وہ سب اپنا روحانی تعلق خلافت راشدہ سے ہی جوڑتے تھے۔ لہذا یہ ساری حکومتیں بھی خلافت ہی کہلاتی تھیں۔

آج بھی اگر آپ غور کریں تو ہم مسلمان اپنی اجتماعی نفسیات میں بھی خلافت کو نہیں بھلا سکے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے ہم بہت سے لفظ ایسے استعمال کرتے ہیں جن کا تعلق خلافت سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی ملک کے دارالحکومت کا ذکر کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اس ملک کا ''دارالخلافہ''، اور دارالخلافہ کا مطلب ہے، ''خلافت کا مرکز''۔ اسلام آباد پاکستان کا دارالخلافہ ہے۔ حالانکہ یہاں پر خلافت قائم نہیں ہے لیکن اسلام آباد کو دارالخلافہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ ہماری یادداشت میں، ہماری گفتگو میں، ہماری زبان میں، ہماری تاریخ میں یہ بات مضبوطی سے پیوستہ ہے اور ہم اپنے آپ کو خلافت سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہماری جڑیں ہیں وہاں۔

خلافت راشدہ کے اس نظام کا پاکستان کی پینسٹھ سالہ تاریخ میں کبھی بھی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ پوری دنیا کے تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ میں سے تو ان لوگوں نے خلافت راشدہ کے تصور کو ہی نکال دیا ہے۔ شاید ہی چند ایک سیاسی جماعتیں دنیا میں موجود ہونگی جو خلافت کی بات کرتی ہیں ورنہ تو اکثر مسلمان حکومتوں میں بھی خلافت کا نام لینا ایک ایسا گناہ ہے کہ جس کے لیے انہیں سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔ مشرق وسطیٰ اور تمام عرب ممالک میں اور جہاں پر بادشاہتیں قائم ہیں اگر آپ خلافت کا نام بھی لیں گے تو سزائے موت دی جاسکتی ہے۔ اتنی شدت ہے۔ دوسری طرف بنیاد پرست عیسائی صیہونی جارج بش خود اپنی

تقریروں میں کہتا ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو خلافت کا نظام دوبارہ قائم نہیں کرنے دیگا۔ یہ اس لیے ہے کہ انکی جان اور روح نکلتی ہے اس تصور سے کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

قوموں کو تقسیم کرنا ہے یا انسانوں کو اکٹھا کرنا ہے؟ اکیسویں صدی میں کفار کی سوچ، منصوبہ بندی اور انکی پوری حکمت عملی یہ ہے کہ انسانیت کو چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قوموں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حالانکہ اسلام اور خلافت کا مقصود انسانیت کو متحد کرنا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے بہت خوبصورت انداز میں واضح کیا:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود

اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام

جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم!

جب آپ حج پر جاتے ہیں تو وہاں پر دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا سے آئے ہوئے انسانوں کا لباس بھی ایک ہوتا ہے اور وہاں کوئی زبان، رنگ و نسل کی قید بھی نہیں ہوتی۔ حج مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماع ہے کہ کائنات میں اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ چالیس، پچاس لاکھ مسلمان بیک وقت ایک امام کے پیچھے رکوع وسجود کرتے ہیں۔ ایک ایسا نظم وضبط ہوتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام تعصّبات کہ جن کی بنیاد پر طاغوت نے آج انسانوں کو تقسیم کیا ہوا ہے، وہاں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں انسانیت اپنی خالص اور پاکیزہ ترین شکل میں نظر آتی ہے اور اگر ان خالص انسانی اقدار کو لیکر ایک تہذیب بنا دی جائے تو وہ آج کے دور میں خلافت

راشدہ کی ایک جھلک ہوگی۔خلافت راشدہ کو ہم اس لیے بھی زیر بحث لائیں گے، کیونکہ آج مسلمانوں میں ایک شدید بحث چل رہی ہے کہ جمہوریت ہو یا آمریت، بادشاہت ہو یا نیم جمہوری نظام، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا اشتراکیت۔مگر خلافت کی بات نہیں کی جاتی۔اس نظام پر بھی بات کرنی چاہیے۔آزادی اظہار رائے کی بات کرنے والوں کی زبان خلافت راشدہ پر آ کر کیوں بند ہو جاتی ہے؟

جس طرح یورپ اور امریکہ میں ہر قسم کی اظہار رائے کی آزادی ہے لیکن آپ یہ بات نہیں کر سکتے کہ ساٹھ لاکھ یہودی دوسری جنگ عظیم میں مرے بھی تھے کہ نہیں؟ ہولوکاسٹ ہوا بھی تھا کہ نہیں؟ وہاں پر ہولو کاسٹ کو چیلنج کرنے پر ہی جیل ہو جاتی ہے۔آپ کوئی علمی بحث بھی نہیں کر سکتے۔ان صیہونیوں نے اپنے نظام ایسے بنائے ہوئے ہیں کہ آپ ان کے مفادات کے خلاف بات ہی نہیں کر سکتے، اور آزادی اظہار رائے یہ سب خرافات، ڈھکوسلہ اور دھوکہ ہیں۔دین کو بے آبرو کرنے کے لیے، انبیاءؑ کی شان میں گستاخی کرنے کے لیے، بے ادبی کرنے کے لیے تو آزادی اظہار رائے ہے لیکن آپ یہودیوں کو یہ چیلنج نہیں کر سکتے کہ دوسری جنگ عظیم میں ساٹھ لاکھ یہودی تو مرے ہی نہیں تھے۔ یہ بات کرنے کی آزادی نہیں ہے۔آپ بے لباس، بے حجاب پھر سکتے ہیں لیکن سکارف لینے پر مسلمان بچیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ فرانس میں اور دیگر بڑے بڑے ممالک میں پابندیاں لگا دی گئی ہیں کہ بچیاں سکارف پہن کر اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نہیں جا سکتیں۔

یہ منافق لوگ ہیں اور ان کی تہذیبیں ان سے بڑھ کر درندہ صفت ہیں۔ جتنا خون ان کے ہاتھوں پر لگا ہوا ہے اور جتنی تکلیف انسانیت کو ان کے ہاتھوں پہنچی ہے، انسانی تاریخ نے ان سے پہلے کبھی اتنی درندہ صفت اور وحشی تہذیب نہیں دیکھی۔اقبالؒ نے جس طرح ان تہذیبوں، جدید جمہوریت اور آمریت کو بے نقاب کیا ہے وہ سب آگے جا کر بیان کیا جائے گا۔

خلافت راشدہ کے بارے میں بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنیادی طور پر جو چاروں خلفائے راشدین، سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ کا تیس سال کا دور بنتا ہے، اس دور کی روح اور حکمت کا موازنہ آج کے جدید دور کے سیاسی نظاموں کے ساتھ کیا جائے تا کہ انسانوں کو اندازہ تو ہو کہ ہم کس خیر

کے نظام کی بات کرر ہے ہیں۔ہم پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمیں پتھر کے دور میں لے جایا جار ہا ہے اور اس چودہ سوسال کے پرانے نظام کو آپ آج کے دور پر کیسے نافذ کریں گے؟ تو ایسے لوگوں کو آنکھیں کھول کر اور ذرا ہوش کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیے کہ خلافت راشدہ کے نظام سے زیادہ جدید اور مستقبل سے ہم آہنگ نظام تو آج تک کائنات میں بنا ہی نہیں ہے۔اس کا اگر ایک فیصد بھی آج دنیا پر لاگو کر دیا جائے تو یہ دنیا جنت بن جائے گی۔

ہم خلافت راشدہ کے نظام کو بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ اس کا موازنہ جدید سیاسی نظاموں کے ساتھ کرینگے۔جس سے موجودہ طاغوتی نظام کا ناپاک باطن لوگوں کے سامنے آجائے گا ان شاء اللہ۔ہم اس جدید نظام کو ادھیڑ کر رکھ دیں گے اور پھر خلافت راشدہ کا وہ پرنور اور بابرکت چہرہ لوگوں کے سامنے عیاں ہوجائیگا کہ جس کے بارے میں خود مسلمانوں کو بھی ابھی علم ہی نہیں ہے۔ہم صرف عقیدت میں تو پڑھ لیتے ہیں کہ چار خلفائے راشدین تھے مگر انہوں نے نظام کیا قائم کیا تھا، یہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔ اس نظام کو سمجھنے سے ہماری نئی نسلوں کے ذہن کھلیں گے۔انسان اگر اپنے فیصلے کرے تو اسے شعور کی بنیاد پر ہی کرنے چاہئیں۔موازنہ بھی سنجیدہ نوعیت کا ہونا چاہیے۔کم از کم فیصلہ تو سوچ سمجھ کر کریں کہ جمہوریت چاہیے، آمریت چاہیے، ملائیت چاہیے، بادشاہت چاہیے یا پھر خلافت۔خلافت ایک نظام کا نام ہے۔ اگر آج کے بادشاہ کا نام آپ خلیفہ رکھ دیں تو اس سے خلافت کا نظام تو قائم نہیں ہو جائے گا۔

خلافت کے کچھ طریقہء کار اور معیار ہیں۔اس میں ایک خاص قسم کا عدل اور اخلاقی معیار ہوتے ہیں۔ آپ ان معیاروں کو قائم کیجیئے تو خلافت کی جھلک نظر آئے گی۔وہ ایسے معیار ہیں کہ جن پر کائنات کا کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کرسکتا۔ایک ایسا معیار کہ جس میں خلیفہ کا بھی احتساب ہوتا ہے۔اتفاق رائے ہوتی ہے۔اجتہاد، اجماع اور شوریٰ ہوتی ہے۔لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف ہوتا ہے۔غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ایک اسلامی فلاحی مملکت ہوتی ہے۔اوران معیارات کو جب آپ ایک روحانی نظام میں پروتے ہیں تو خلافت وجود میں آتی ہے۔یہ تمام چیزیں کس کو بری لگتی ہیں؟ آج کے دور کے نظریات کے مقابلے میں خلافت کا تصور اتنا حیرت انگیز ہے کہ آپ جدید علم سیاسیات کی روشنی میں

خلافت کے نظام کو سمجھ ہی نہیں سکتے ،اور خاص طور پر خلافت راشدہ کے نظام کو تو بالکل ہی نہیں۔

اب ہم خلافت راشدہ کے نظریئے کی وضاحت کرتے ہیں کہ خلافت راشدہ ہے کیا؟ پہلے چار خلفاء سیدنا ابوبکرؓ،سیدنا عمرؓ،سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ ہیں۔ یہ جو خلافت کی ترتیب ہے کہ پہلے کون خلیفہ ہونگے اور ان کے بعد کون،اس میں خود اللہ سبحان وتعالیٰ کی مرضی ومنشاء شامل ہے۔اور اس کا اشارہ ہمیں قرآن میں بھی ملتا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے خلافت راشدہ کا۔قرآن پاک میں ایک بہت خوبصورت آیت ہے جو نبی ﷺ کے اصحاب کی تعریف پیش کرتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی صفات کیا ہیں۔ہم سب اور تمام تاریخ دان مانتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گزارا۔اس کے بعد یہ سب مانتے ہیں کہ دین کے معاملے میں شدت اور سب سے زیادہ مضبوطی کا مظاہرہ کرنے والے سیدنا عمرؓ تھے۔ یہ سب مانتے ہیں کہ سب سے زیادہ نرم دل سیدنا عثمانؓ تھے۔اور یہ بھی سب مانتے ہیں کہ زہد وتقویٰ اور معرفت میں عروج پر سیدنا علیؓ تھے۔اور قرآن میں خلفائے راشدین کی بالکل یہی ترتیب دی گئی ہے۔ قرآن پاک کی آیت کے ترجمے اور مفہوم کے مطابق: ''حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں'' (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) '' وہ کفار پر شدید ہیں'' (یعنی سیدنا عمرؓ) '' آپس میں بہت رحیم ہیں'' (یعنی سیدنا عثمانؓ) '' آپ ان کو دیکھتے ہیں رکوع وسجود کرتے ہوئے'' (یعنی سیدنا علیؓ)۔

صاحب بصیرت اور صاحب نگاہ لوگوں کی نظر میں یہ حیرت انگیز خصوصیات اور ترتیب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خلفائے راشدین کیلئے بیان کی ہے۔ ایک اور بات پر غور کیجئے کہ چاروں خلفائے راشدین حضور ﷺ کے رشتہ دار بھی ہیں۔ اس بات پر لوگ عام طور پر غور نہیں کرتے کہ ان کی رشتہ داریاں حضور ﷺ کے ساتھ کیا ہیں؟ دو سسر ہیں اور دو داماد ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عمرؓ سسر ہیں۔اور سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ داماد ہیں۔لیکن اس کے باوجود جب خلافت کا طریقہء کار بنایا جاتا ہے اور جب خلیفہ کا انتخاب ہوتا ہے تو رشتے داری کو کہیں پر بھی بیچ میں نہیں لایا جاتا۔

آجکل کے ہمارے سیاسی حکمرانوں کو دیکھیئے کہ ان کا حال یہ ہے کہ ان کی سیاسی جماعتیں خاندانی موروثی جائیدادیں ہیں۔ ہر سیاسی جماعت کسی نہ کسی خاندان کے نام سے چل رہی ہے۔ایک سیاسی لیڈر، پھر اس

کا بیٹا، پھراس کا بیٹا، یعنی نام نہاد جمہوری جماعتوں کا حال یہ ہے کہ بادشاہتوں کی طرح اولادیں حکومت کرتی ہیں۔ یہ کونسی جمہوریت ہے؟ ایک طرف تو بادشاہتوں کو برا کہتے ہیں اور پھر خود ہی سیاسی جماعتوں میں انہوں نے اپنی بادشاہتیں قائم کی ہوئی ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس خاندان کے علاوہ اس سیاسی جماعت کی قیادت کوئی اور کرسکے۔ ہمارے ملک میں دیکھ لیجیئے۔ انہوں نے پورے ملک کو اپنی ذاتی جائیداد بنایا ہوا ہے۔ سرکاری محفلوں اور انتہائی خفیہ ملاقاتوں میں بھی یہ اپنی اولادیں لیکر پہنچ جاتے ہیں۔ اپنے بچوں کو ساتھ بٹھاتے ہیں حالانکہ قانوناً ایسا کرنے کی بالکل بھی اجازت نہیں ہے۔ پورے ملک میں ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کوئی قانون کی حکمرانی ہے ہی نہیں۔ مرضی چل رہی ہے ان تمام نام نہاد جمہوری حکومتوں کی۔ یہ تو بڑے سے بڑے سے فرعون سے بھی زیادہ مطلق العنان حکمران بنے پھرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی نام نہاد جمہوریت۔ کم از کم ہمارے ملک میں تو یہی جمہوریت چل رہی ہے۔

خلافت راشدہ کی بات کرتے ہوئے ہم نے یہ جانا کہ وہ چاروں خلفائے راشدین جو بظاہر حضور ﷺ کے رشتہ دار بھی تھے اور ان کی جو مسند خلافت سنبھالنے کی ترتیب تھی، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہی تھی لیکن پھر بھی زمین پر جس طریقے سے اس کا عملی نفاذ ہوتا ہے وہ اتنا حیرت انگیز، اتنا شورائی، اتنا اجماع اور اجتہاد پر مبنی ہے کہ آج کی دنیا کا بڑے سے بڑا جمہوری نظام بھی اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

اب ہم آتے ہیں خلافت کی تعریف کی طرف کہ خلافت کہتے کس کو ہیں؟ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کی اصطلاح انسان کے لیے عمومی طور پر بھی استعمال کی ہے۔ قرآن پاک کی آیت ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے جارہا ہوں۔ تو ایک تعریف تو یہ ہے کہ ہر انسان عمومی طور پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ، نمائندہ اور نائب ہے۔ یہ تو ایک عمومی تعریف ہوگئی۔ لیکن ایک خلافت خاصہ بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص نمائندگی۔ مثال کے طور پر ہر دور میں جو نبی آئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے خاص خلیفہ ہیں۔ اور خلافت کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نائب، خاص بندے اور نمائندے کی حیثیت سے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نافذ کریں۔ یہ بہت بڑا روحانی مرتبہ ہے۔ یہ صرف ایک

سیاسی حکومت نہیں ہے۔ حضورﷺ کا جو مرتبہ ہے اس دنیا میں وہ اس قدر بلند ہے کہ حضورﷺ کا کہنا، اللہ کا کہنا ہے۔ حضورﷺ کا حکم، اللہ کا حکم ہے۔ حضورﷺ کی محبت، اللہ کی محبت ہے۔ حضورﷺ کا منع کر دینا اللہ کا منع کر دینا ہے۔ حضورﷺ کا مارنا، اللہ کا مارنا ہے۔ یہ مرتبہ اس عمومی خلافت سے جو ہر انسان کو عطا ہوئی ہے، سے بہت مختلف ہے۔ یہ خلافت خاصہ ہے اور ہم بھی اسی کی بات کر رہے ہیں۔

حضورﷺ کی ذات مبارک یا انبیاء کرامؑ میں جو خاص بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ تین بڑے بڑے سلسلے انکی ذات مبارکہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یعنی پہلے روحانی قیادت، جو انہیں ایک مرشد کے مقام پر فائز کرتی ہے۔ پھر دینی قیادت یعنی شریعت لیکر آتے ہیں اور پھر سیاسی قیادت یعنی دین کو قائم کرنا اور اسے نافذ کرنا بھی اس وجود کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ دینی، روحانی اور سیاسی قیادتیں جب ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں تو وہ وجود پھر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ءخاص بن جاتا ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض۔ اور یہ حضورﷺ کی شان ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت ہم اس طرح کرتے ہیں کہ جب سیدنا ابوبکر صدیقؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کچھ صحابہؓ نے آ کر آپؓ سے کہا کہ مبارک ہو آپؓ اس دنیا میں خلیفۃ اللہ ہو گئے۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کی تصحیح کی اور فرمایا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں بنا، میں تو خلیفۃ الرسولﷺ ہوں۔ یعنی اب میں نمائندہ ہوں رسول اللہﷺ کا۔ خلیفۃ اللہ تو صرف حضورﷺ ہیں۔ یعنی اب جو بھی خلافت آگے چلے گی، وہ رسول اللہﷺ کی خلافت ہوگی۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے واضح کر دیا کہ وہ خلیفۃ الرسولﷺ ہیں۔ تو خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ الرسولﷺ کا یہی باریک فرق ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے۔

آنے والے دور میں خلیفہ کو مختلف ناموں سے بھی پکارا گیا۔ مثلاً ظل الٰہی، یعنی اللہ کا سایہ۔ خلافت عثمانیہ والوں نے اپنے خلیفہ کو خادم الحرمین الشریفین کے نام سے بھی پکارا۔ یہ اصطلاح آج بھی رائج ہے اور سعودی بادشاہ اس کو اپنے لیے استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ خلافت کے مخالف ہیں۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بعد کے دور میں خلفاء کو مختلف خطابات دیئے گئے لیکن خلیفۃ الرسولﷺ وہ خطاب تھا جو خلافت راشدہ میں خلیفہ کو دیا گیا تھا یعنی حضورﷺ کے نمائندے۔

حضورﷺ کے جس اختیار کی ابھی ہم نے بات کی ہے کہ آپﷺ کا کہنا، اللہ کا کہنا ہے، آپﷺ کا

کرنا، اللہ کا کرنا ہے،اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنا تمام اختیار حضور ﷺ کو عطا فرما دیا ہے۔ اللہ رب العالمین ہے تو حضور ﷺ رحمت اللعالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر کائنات کا رب ہے تو آپ ﷺ پوری کائنات کے لیے رحمت ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دین کیا ہے؟ ہمیں تو وہی دین معلوم ہے جو حضور ﷺ نے ہم تک پہنچایا۔ ایک ہی مبارک زبان سے ایک لفظ نکلا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ قرآن ہے، دوسرا لفظ نکلا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حدیث ہے۔ ہم نے مان لیا۔ ہمیں تو نہیں معلوم کہ قرآن کیا تھا اور حدیث کیا تھی۔ جو حضور ﷺ نے فرمایا ہم نے اسے چوم کر سینے سے لگایا۔ ہمارے لیے وہ سب کچھ مقدس ہے جو ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ ہم کوئی فرق نہیں کرتے قرآن اور حدیث میں۔ کیونکہ دونوں ہی نبی ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہیں اور دونوں ہی اللہ کے حکم ہیں کہ جو حضور ﷺ دیں، وہ قبول کرلو اور جس سے حضور ﷺ روک دیں، اس سے رک جاؤ۔ تو جو خلافت کا نظام حضور ﷺ نے ہمیں بنا کر دیا ہے، وہ ہمارے لیے اسی طرح ہی مقدم ہے جیسے وہ اللہ کا حکم ہو۔ ہم تو اللہ کو نہیں جانتے۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں اللہ کو جتنا ہمارے نبی ﷺ نے ان کا تعارف کروایا۔

جب خلافت راشدہ کی بات ہوتی ہے تو یہ صرف دنیا کی سیاسی قیادت تک محدود نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا روحانی پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔ خلیفہ، اللہ کے رسول ﷺ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لہذا خلیفہ سے بغاوت اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے بغاوت ہوتی ہے۔ خلیفہ کے اختیارات اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ ظاہراً اگر آج کی دنیا میں ان کو دیکھا جائے تو کم عقل اور کم نظر لوگ اس کو بدعت کہیں گے۔ لیکن فقہ کے اندر وہ اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں بھی لے کر آ سکتا ہے، اپنے زمانے اور حالات کے مطابق، کہ جس کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن خلیفۃ الرسول ﷺ کو یہ خاص اختیار ہوتا ہے۔ اور اسکی مثالیں ہمیں خلافت راشدہ میں کثرت سے ملتی ہے۔ جیسے کہ پہلے فجر کی اذان میں **الصلوۃ خیر من النوم** کے الفاظ نہیں تھے۔ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں یہ الفاظ نہیں کہے جاتے تھے۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ فجر کی نماز ادا کرنے میں سستی کر رہے ہیں تو پھر آپؓ نے یہ جملہ فجر کی اذان میں شامل کروایا۔ **الصلوۃ خیر من النوم** ۔ یہ کتنا بڑا اختیار ہے۔ لوگ چونکے بھی، حیران بھی ہوئے کہ وہ چیز جو حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی، آپؓ شامل فرما رہے ہیں۔ تو یہ تھا خلیفہ کا اختیار جس کو تمام صحابہ

کرامؓ نے بھی قبول کیا۔ اور آج تک چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بھی یہ جملہ فجر کی اذان کا حصہ ہے۔ اسی طرح شراب پینے پر کوڑوں کی سزا حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی لیکن بعد میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا تو اس حد کو جاری کیا گیا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب حضور ﷺ نے یمن کی مہم پر روانہ کیا تو ایک اور قانون واضح کر دیا کہ حضور ﷺ کے نمائندے کا اختیار کیا ہوگا۔ پہلے حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ جب تم گورنر کی حیثیت سے اور نبی ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں جاؤ گے تو فیصلے کس طرح کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں قرآن سے فیصلہ کرونگا۔ یعنی جو قرآن میں احکامات آئے ہیں ان کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ حضور ﷺ نے بہت پسند فرمایا، اور فرمایا کہ جس کا مفہوم ہے کہ اگر تمہیں قرآن میں نہ ملے تو؟ یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ لوگ اس حدیث کا غلط ترجمہ کرتے ہیں کہ "اگر قرآن میں نہ ہو تو"۔ یہ غلط ترجمہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ "اگر قرآن میں تم کو نہ ملے تو؟" یعنی اگر تم نہ ڈھونڈ پاؤ۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ پھر مجھے آپ ﷺ کی سنت میں جو ملے گا، اس سے فیصلہ کرونگا۔ حضور ﷺ پھر بہت خوش ہوئے اور فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم کو میری سنت میں بھی نہ ملے تو؟ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر سنت میں نہ ہو تو کیا کرو گے؟ فرمایا اگر تمہیں نہ ملے تو کیا کرو گے؟ پھر حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا یعنی میں قرآن وسنت کی روشنی میں خود فیصلہ کرونگا۔ حضور ﷺ اس بات سے اتنے خوش ہوئے کہ آپ ﷺ نے برکت کی دعا دی۔ اور اس طرح آئندہ آنے والے تمام ادوار کیلئے قانون سازی کا یہی قاعدہ اور کلیہ بن گیا۔

یعنی پہلے انسان قرآن سے رجوع کرے گا۔ پھر حدیث اور سنت سے رجوع کرے گا۔ اور اس کے بعد اپنی رائے سے اجتہاد کرے گا لیکن اس رائے کی بنیاد شورائیت پر مبنی ہوگی جو قرآن کا حکم ہے۔ لہذا جو ترتیب بیان کی گئی ہے قانون سازی کیلئے اس کے مطابق فیصلے قرآن وسنت کی روشنی میں اجماع، قیاس اور اجتہاد کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ اجماع کہتے ہیں اتفاق رائے کو۔ مسلمان جب بھی آپس میں کام کرتے ہیں تو مشورہ اور اتفاق رائے سے کرتے ہیں اور پھر اسکے بعد فیصلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ دین اتنا متحرک ہے

کہ قیامت تک آنے والے ہر دور اور ہر ماحول میں اسی دین نے رہنا ہے۔ وہ معاملات، مسائل اور مشکلات جو کئی سو سال پہلے کے لوگوں کو پیش آئی تھیں، قدرتی بات ہے کہ آج کے دور سے بہت مختلف ہیں۔اور جدید دور کے مسلمانوں کو نئے مسائل اور نئی مشکلات کا سامنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دین میں اتنی گنجائش اور حرکت رکھ دی ہے اور ہمیں یہ اختیار دیا ہے کہ ہم شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے حسب ضرورت اپنے وقت کے لحاظ سے اجتہاد کریں۔ جدید مسائل کا حل قرآن و سنت میں تلاش کریں اور اگر ہم کو مسئلے کا حل نہیں ملتا تو پھر شورائیت کے ساتھ اجتہاد کریں۔ اگر کوئی فیصلہ قرآن وسنت کی حکمت کے خلاف نہیں ہے تو اس کو شروع کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ دین ہی کا حصہ ہے۔ دین میں بذات خود اجتہاد کر کے نئے راستے نکالنے کی اجازت ہے۔ یہ ایک بہت طاقتور روحانی تصور ہے۔

علامہ اقبالؒ شدید دکھی تھے اس بات پر کہ جب امت پر زوال آیا تو مسلمانوں نے اجتہاد ختم کر دیا۔ اجتہاد ختم ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ فقہ جامد ہو گیا، ٹھہر گیا۔ ایسے ہی جیسے بہتا ہوا دریا اگر کھڑا ہو جائے تو پھر وہ دریا نہیں رہتا، اس میں گندگی آجاتی ہے اور یہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ چلتا ہوا پانی پاک ہوتا ہے اور جامد پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ ہمارا دین تیز بہتے پانی کی مانند ہے۔ ہر دور میں، ہر ماحول میں، ہر علاقے میں حتیٰ کہ اگر ہم چاند پر بھی پہنچ جائیں تو ہمارا دین وہاں پر بھی ہماری رہنمائی کرے گا اور ہمیں بتائے گا کہ وہاں زندگی کیسے گزارنی ہے۔ یہ دین زمان و مکان میں محدود نہیں ہے۔ اگر اس تمام طاقت اور اختیار کو مکمل عملی طور پر استعمال کیا جائے تو اس کو نظام خلافت راشدہ کہیں گے۔

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکار عمیق
حلقہء شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!

خلافت راشدہ کے اندر، دینی، روحانی اور سیاسی، تینوں مرکز ایک ذات میں جمع ہو جاتے ہیں۔ سیدنا

ابوبکر صدیقؓ،سیدنا عمرؓ،سیدنا عثمانؓ،سیدنا علیؓ دینی رہنما بھی ہیں، جمعہ کا خطبہ بھی آپ پڑھتے ہیں اور امام کی حیثیت سے نماز بھی آپ پڑھا رہے ہیں۔عسکری اور سیاسی قیادت بھی آپ ہی کے پاس ہے۔آپ ہی کمانڈر انچیف ہیں۔آپ ہی امیر المومنین بھی ہیں۔اور ساتھ ساتھ آپ پوری امت کیلئے ایک مرشد اور روحانی رہنما بھی ہیں۔کائنات میں جو بھی ظاہری، باطنی و روحانی مسائل پیش آتے تھے،امت آپ کی ہی طرف رجوع کرتی تھی۔

قرآن پاک میں حضور ﷺ کی سنت یہ بیان کی گئی ہے کہ حضور ﷺ تزکیہ بھی فرما رہے ہیں،قرآن کی تلاوت بھی فرما رہے ہیں،حکمت بھی سکھا رہے ہیں اور پھر اس امت کے سیاسی و عسکری رہنما بھی ہیں۔یہ سارا عمل ہو بہو منتقل ہو جاتا ہے خلافت راشدہ کی طرف۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اطاعت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے حضور ﷺ کی اطاعت کرنا۔اور حضور ﷺ کی اطاعت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی اطاعت کرنا۔سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اس معیار اور مرتبے کو اس طرح برقرار رکھا کہ جب آپ جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، نبی ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد، یعنی خود خلیفہ بننے کے بعد،تو جس سیڑھی پر حضور ﷺ تشریف رکھتے تھے،آپؓ اس سے ایک قدم نیچے کھڑے ہوئے۔اور جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو حضرت عمرؓ اس سے بھی ایک سیڑھی نیچے کھڑے ہوتے تھے۔اور یہی ادب آپ ﷺ کے روضہ مبارک پر بھی ہے۔جو حضور ﷺ کی قبر مبارک بنی ہوئی ہے،حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قبر مبارک حضور ﷺ کی قبر کے بالکل ساتھ ہے لیکن تھوڑا نیچے کر کے ہے۔یہ وہی ادب ہے جو آپؓ نے خطبہ دیتے وقت ملحوظ رکھا۔اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی قبر مبارک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قبر مبارک کے ساتھ ہے لیکن ذرا نیچے کر کے ہے۔یہ تینوں قبورِ مبارک ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔پہلے ایک قبر مبارک ہے، پھر دوسری اس سے تھوڑا نیچے ہے اور پھر تیسری اس سے بھی ذرا نیچے۔یہ انتہا ہے ادب کی۔مکمل انتہاء۔یہ سیاسی قائدین کا تعلق نہیں ہے آپس میں۔یہ نبی ﷺ اور امتی کا تعلق ہے۔یہ اتنا حیرت انگیز تصور ہے کہ جہاں پہ اپنی جان، مال، عزت اور آبرو قربان کی جاتی ہے رسول ﷺ پہ۔اور اپنا سب کچھ قربان کیا جاتا ہے اس خلیفۃ الرسول ﷺ پہ جو حضور ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے تشریف لاتے ہیں۔ان کا وہی ادب اور تعظیم کی جاتی ہے جو صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کی کیا کرتے تھے۔

خلافت راشدہ ایک دینی، روحانی، مذہبی، عسکری اور سیاسی ملاپ کا نام ہے۔ دنیا کا کوئی سیاسی اور معاشی نظام اس کی مثال نہیں دے سکتا کہ جہاں پر حکمران مذہبی رہنما بھی ہو، روحانی پیشوا بھی ہو، سیاسی قائد بھی ہو اور عسکری سپہ سالار بھی اور سب کچھ ایک مرکز حکومت پر اکٹھا ہو جائے۔ وہ حضور ﷺ کا خلیفہ بھی ہو اور اس کی ہاں اور ناں میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی مرضی شامل ہو۔

حضرت ذوالقرنینؑ کی مثال قرآن میں دی جاتی ہے جو ایک بہت بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کے پاس یہی اختیار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جس کو میں دنیا میں سزا دونگا، اللہ اسے آخرت میں بھی سزا دے گا۔ جس پر میں دنیا میں رحم کرونگا، اللہ آخرت میں اس پر رحم کرے گا۔ اللہ کا مکمل اختیار اس اللہ کے ولی بادشاہ کے ہاتھ میں تھا جو ذوالقرنینؑ کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ طاقت اور اختیار جب حضور ﷺ کے خلفاء کے پاس، حضور ﷺ کے عشاق کے پاس، حضور ﷺ کے نمائندوں کے پاس تقسیم ہوتا ہے تو اسے خلافت راشدہ کہتے ہیں۔ جدید سیاسی فکر میں اس سے زیادہ متحرک اور مستقبل سے ہم آہنگ نظام وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہاں ہم نے خلافت راشدہ کے پس منظر اور علمی تصور پر بحث کی ہے۔ آگے جا کر ہم اس کے سیاسی، معاشی، عدالتی، عسکری اور انتظامی امور کو بھی زیر بحث لائیں گے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

۳

خلافت راشدہ کے مختلف پہلو

گزشتہ باب میں خلیفۃ اللہ اور خلیفۃ الرسول ﷺ کی تعریف پر بحث کی گئی۔ خلافت راشدہ کی صفات میں سب سے زیادہ نمایاں بات جو ہمیں حضور ﷺ کے حوالے سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جس مقام پر دینی، روحانی اور سیاسی طاقتیں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں، وہ خلافت راشدہ ہے۔ یعنی خلیفہ راشد کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی اور روحانی رہنما بھی ہے اور سیاسی اور عسکری قیادت بھی اس کے پاس ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک نبی کا کام ہے۔ حضور ﷺ کی ذات مبارکہ میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں امت کے حوالے سے کہ آپ ﷺ اس کا تزکیہ بھی فرما رہے ہیں، آپ ﷺ سیاسی رہنما بھی ہیں اور عسکری قائد بھی ہیں۔ یہ تمام خصوصیات سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ میں بھی منتقل ہوئیں اور خلافت راشدہ میں بھی دینی، سیاسی و عسکری طاقت ایک مرکز میں جمع تھی۔

خلافت راشدہ کے بعد یہ تمام عناصر بکھر گئے۔ اس نکتے کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آئندہ آنے والے وقتوں میں جب ہم اسلامی فکر کی بات کرتے ہیں تو اگر ان میں سے کوئی ایک جزو بھی ہم اپنا لیں تو خلافت تو شاید قائم ہو جائے مگر وہ خلافت راشدہ نہیں ہو گی۔ خلافت راشدہ کی تعریف ہی یہی ہے کہ جہاں

پر یہ تمام دینی، روحانی اور سیاسی طاقتیں دوبارہ ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ حضورﷺ نے اپنی احادیث میں بیان فرمایا ہے کہ خلافت دوبارہ قائم ہوگی، جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہوگی۔ ایسی خلافت کہ جس کی بنیاد نبوت پر ہوگی۔ اقبالؒ نے اس تصور کو اس طرح سے بیان کیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں جنیدی اور اردشیری ایک مرکز میں اکٹھی ہو جائے گی اور اللہ اس سے حکمرانی کا کام لے گا۔ جنیدی اور اردشیری کے اکٹھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جنید بغدادیؒ یہاں دینی اور روحانی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں جبکہ اردشیر ایران کا ایک بادشاہ جس کے پاس سیاسی و عسکری طاقت تھی۔ آنے والے دور میں جب یہ دونوں طاقتیں ملیں گی تو خلافت راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دوبارہ آغاز ہوگا۔

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی

کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

جب خلافت راشدہ چاروں خلفاء کے بعد بکھرتی ہے تو یہ بات نوٹ کیجیے گا کہ خلافت کی تین جہتیں، دینی، روحانی و سیاسی، الگ الگ دھاروں میں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ زمین سے خلافت ختم نہیں ہوتی بلکہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ بہت ہی نازک نکتہ ہے، جسے سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

خلافت، بنو امیہ اور بنو عباس کے بعد خلافت عثمانیہ تک پہنچی۔ یہ خلافت کا سیاسی پہلو تھا اور پوری مسلمان ملت تیرہ سو سال اس سیاسی حکومت کو بھی خلافت ہی تسلیم کرتی آئی ہے۔ یعنی خلافت بنو امیہ، خلافت بنو عباس اور پھر خلافت عثمانیہ۔ ہمارے بزرگوں نے ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت، عثمانی خلافت کو بچانے کیلئے
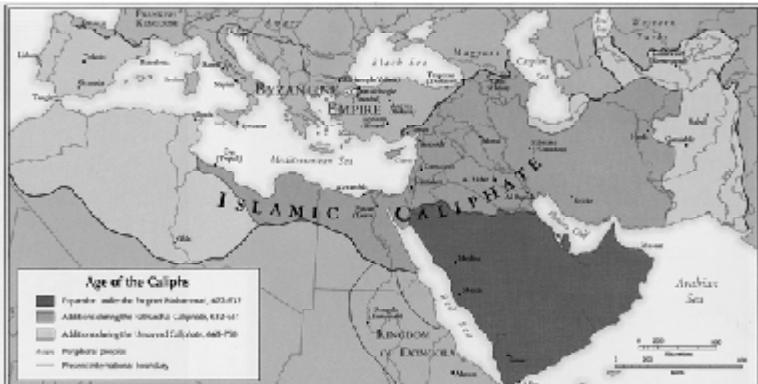
ہی چلائی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی جوہر اور تمام دوسرے بزرگوں نے اسوقت خلافت کو بچانے کے لیے تحریک چلائی۔ مگر ایک بات ذہن میں رکھیے گا کہ یہ خلافت دراصل خلافت راشدہ کی سیاسی جہت تھی۔ خلافت کی ذمہ داری ایک طرف تو دین کا اجراء کرنا، اسکا احیاء کرنا اور قائم و نافذ کرنا ہے۔ خلافت کی دوسری ذمہ داری امت مسلمہ کی حفاظت اور اس کا اس کا دفاع کرنا ہے۔ یہ خلافت کی بنیادی ذمہ داریاں ہیں۔ تو اس لحاظ سے خلافت بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانیہ یہ سب سیاسی خلافتیں تھیں جو تیرہ سو سال تک مسلمان ملت اور امت کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتی رہیں۔ کفار کو یہ موقع نہ مل سکا کہ مسلمان مملکت اور سلطنت میں داخل ہو کر ان کو تباہ و برباد کر سکے۔

ایک مسلمان ریاست ہوتی تھی ''نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر'' اور یہ مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ضامن ہوتی تھی۔ یہ جو بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانی خلافتیں گزریں ہیں، انکی تلواروں نے ہمیشہ امت کی حفاظت کی۔ بے شک اُس دور میں امت بکھری بھی، فتنے بھی آئے، آزمائشیں بھی آئیں، خیانت بھی پھیلی، ایسے خلیفہ بھی آئے جو خائن تھے اور ایسے بھی جو نیک تھے اور یہ خلافت بظاہر بادشاہتوں میں بھی تقسیم ہوگئی، یعنی خلیفہ کے بعد اس کا بیٹا خلیفہ بنتا رہا، مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود خلافت کی تلوار صدیوں تک امت کی آبرو کی حفاظت کرتی رہی اور اسی تلوار کی وجہ سے اس کی سیاسی و عسکری حیثیت بہت مضبوط رہی۔ خلافت راشدہ کے صرف ایک سیاسی جزو کی حامل اس خلافت کو ہمیشہ مسلمانوں کی سیاسی و عسکری طاقت کا مرکز سمجھا گیا اور تمام امت نے اس کو تسلیم کیا۔

خلافت بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانیہ، خلافت راشدہ اس لیے نہیں کہلاتیں کیونکہ خلافت راشدہ کے دو اور معیار یعنی ''مذہبی اور روحانی پہلو'' اس سیاسی خلافت سے جدا ہو کر الگ دھارے میں چلے گئے۔ مثال کے طور پر یہ کہ خلافت راشدہ کے بعد سیاسی خلافت تو چلی گئی بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانیہ کی طرف، لیکن جو مذہبی پہلو تھا، اس کے وارث علماء بنے۔ آپ ﷺ کی سنت اور شریعت کا احیاء کرنے کے وارث اور خلیفہ علماء ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور وہ تمام علماء جو بعد میں آ کر اس دین کی حفاظت اور تشریح کرتے رہے، حضور ﷺ نے ان کو اپنا وارث قرار دیا ہے۔ علماء نبیوں کے وارث ہوتے

ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو دین کے ظاہر کو سنبھالتے تھے۔کوئی محدث بن گیا یعنی اس نے حدیث کے علم پر عبور حاصل کیا۔کوئی فقہیہ بن گیا یعنی اس نے فقہ پر عبور حاصل کیا۔کوئی مجتہد بنے یعنی وہ اجتہاد کر کے دین کی خدمت کرتے رہے۔کوئی روایت کے علم پر عبور حاصل کر گیا۔کسی نے تفسیریں لکھنی شروع کر دیں۔گویا ایک تحریک تھی پوری امت کے دینی علوم کے خزانے کو سنبھال کر رکھنے کی۔خلافت کا مذہبی پہلوان علماء میں تقسیم ہو کر پوری امت میں پھیل گیا۔

خلافت کا تیسرا پہلو روحانی ہے۔اسکو اولیاء اللہ،فقراء اور صاحب بصیرت عارفوں نے سنبھالا۔شریعت علماء نے سنبھال لی اور طریقت ولیوں اور فقراء نے۔حسن بصریؒ،جنید بغدادیؒ،شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے بزرگ۔آج پوری دنیا میں طریقت کے جو سلسلے قائم ہیں مثلاً نقشبندیہ، چشتیہ،سہروردیہ، قادریہ،وہ انہی جیسے بزرگوں کے جاری کردہ ہیں۔نقشبندیہ سلسلے کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا ہے اور اسی طرح قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلہ سیدنا حضرت علیؓ سے جاملتا ہے۔

ان تمام سلسلوں میں بھی خلافت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔یعنی ایک مرشد اپنی خلافت آگے دیتے ہیں۔اگر آپ کسی بزرگ کا روحانی سلسلہ دیکھیں،مثلاً اگر نقشبندیہ سلسلے کے مرشد کا روحانی شجرہ دیکھا جائے تو وہ شجرہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے اور سیدنا ابوبکرؓ، حضور ﷺ سے فیض لیتے ہیں۔اسی طرح روحانی سلسلے کی خلافت چلتی ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔یہ ''سلاسل ذہبیہ'' کہلاتے ہیں یعنی (Golden Chains)۔گفتگو میں، فقہ میں،طریقت میں اور شریعت میں یہ اصطلاحیں استعمال ہوتی ہے۔

جو راوی ہیں،یعنی حضور ﷺ کی احادیث بیان کرنے والے لوگ، ان کا بھی سلسلہ ذہبیہ ہوتا ہے۔ایک سنہری زنجیر ہوتی ہیں جو ٹوٹتی نہیں ہے۔اگر امام بخاریؒ نے حضور ﷺ سے احادیث بیان کی ہیں تو حضور ﷺ تک بیچ میں جتنے راوی آئے ہیں ان سب کا ذکر امام بخاری کرتے ہیں۔اور وہ سارے کے سارے راوی اتنے خالص، اتنے پاکیزہ ہوتے ہیں کہ ان کی گواہی مانی جاتی ہے۔یعنی حضور ﷺ کی حدیث انہوں نے بالکل صحیح آگے بیان فرمائی۔اگر آپ احادیث دیکھیں تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ ان

صحابی سے روایت ہے پھر آگے ان دوسرے صحابی سے روایت ہے پھر آخری صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضورﷺ سے یہ سنا۔ یہ سلسلہ بھی حضورﷺ کی خلافت ہے اور یہ علماء بھی حضورﷺ کے دین کے وارث ہیں۔

حضورﷺ کی شریعت کو علماء نے سنبھالا، طریقت کو فقراء اور اولیاء نے اور سیاسی پہلو بنو امیہ، بنو عباس اور خلافت عثمانیہ میں ظاہر ہوا۔ لہذا خلافت راشدہ تین چشموں میں بکھر گئی۔ چودہ سو سال سے امت مسلمہ میں یہ تین چشمے چلتے چلے آرہے ہیں۔ ایک مقام آئیگا کہ جہاں پر یہ تینوں چشمے دوبارہ ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے جو کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہوگی۔

سیاسی خلافت ۱۹۲۴ء میں ختم ہوگئی جب خلافت عثمانیہ کو ختم کیا گیا۔ لیکن آج بھی علمائے حق، فقراء اور اولیاء، جو حضورﷺ کے دین کے اصل وارث ہیں، وہی شریعت اور طریقت کو لیکر چل رہے ہیں اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ تمام علماء اور اولیاء حضورﷺ کے وارث ہیں اور خلافت کا سلسلہ دینی اور روحانی طور پر آج بھی جاری ہے۔ جس خلافت کی بات ہم کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ جب دینی اور روحانی خلافت، سیاسی خلافت میں جمع ہو جائے گی تو خلافت کا وہ سیاسی نظام بنے گا کہ جس کے پاس معاشی، سیاسی اور عسکری قوت بھی ہوگی، جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور جو جدید دور کے جمہوری اور اشتراکی نظاموں کے مقابلے میں فلاح انسانیت کا عالمگیر روحانی نظام ہے۔

خلافت کے مکمل نظام کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں میں بہت سارے گروہ ایسے ہیں جو خلافت قائم کرنے کی بات تو کرتے ہیں مگر ان کی نظر میں خلافت صرف ایک سیاسی تصور کا نام ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک آدمی کو تعینات کر کے خلیفہ کا نام دے دیا جائے، تو اس سے خلافت کا نظام قائم ہو جائے گا۔ نہیں! اصل میں اگر خلافت راشدہ قائم کرنی ہے، جو حضورﷺ کی حدیث کے مطابق خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے، تو اقبالؒ کے الفاظ میں جنیدی اور اردشیری اکٹھی کرنی پڑے گی۔ یعنی تمام پہلوؤں کا اکٹھا ہونا لازم ہے۔ اگر آپ کسی موجودہ نظام کو خلافت کا نام دے دیں کہ جس میں روحانی اور مذہبی تصور نہ ہو تو وہ ادھوری خلافت ہوگی۔ وہ اسی طرح کی حکومت ہوگی جیسے سیاسی خلافتیں مختلف ادوار میں چلتی رہی ہیں۔ اب

ان پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ خلافت راشدہ تین چشموں میں بکھری ہوئی ہے۔

بہت سے لوگ آجکل یہ بات کہتے ہیں کہ اسلام کی سیاسی فکر جمہوریت سے بہت ملتی جلتی ہے اور اسلام تو ہے ہی جمہوریت۔ بہت سے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلام تو آمریت ہے اور اس میں ایک خلیفہ ہوتا ہے جو حکم چلاتا ہے۔ پھر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو ملائیت ہے، یہاں تو ملا کی حکومت ہوتی ہے، وہ تو سب مولوی ہوتے ہیں اور جمعہ کا خطبہ بھی وہی پڑھاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بادشاہت ہے۔ وہ لوگ بنوامیہ اور بنوعباس کو دیکھتے ہیں اور ان کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ خلافت کا اسلامی تصور تو ہے ہی بادشاہت کیونکہ بنوامیہ اور بنوعباس کی خلافت تو بادشاہتوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

چونکہ مسلم سیاسی فکر اور مغربی علم سیاسیات کی کتابوں میں بھی کبھی خلافت راشدہ کو پڑھایا ہی نہیں جاتا کہ خلافت کے نظام کیا تھے۔ اس لیے آئندہ ابواب میں ہم بیان کرینگے کہ خلافت راشدہ کا معاشی نظام کیا تھا؟ سیاسی نظام کیا تھا؟ انتظام کیسا تھا؟ عدلیہ کیسی ہوتی تھی؟ معاشرتی انصاف کیسا تھا؟ اور ہم آپکو مثالیں دے کر سمجھائیں گے کہ خلافت مغربی جمہوریت نہیں ہے۔ مغربی جمہوریت کی جو شکل آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ چار سال کیلئے آدمی منتخب ہوتا ہے، انتخابات ہوتے ہیں، سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں، خلافت میں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ خلافت راشدہ کا مغربی جمہوریت سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر کوئی خلافت کے نظام کو آمریت سمجھتا ہے کہ ایک پارٹی یا ایک فرد کی حکومت ہو جیسا کہ چین میں ایک پارٹی کی آمریت قائم ہے یا بہت سے ملکوں میں ایک فرد کی آمریت ہوتی ہے تو خلافت میں ایسی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ آمریت میں تو ایک مطلق العنان حکمران ہوتا ہے جو ظالم ہوتا ہے۔ کسی کو اٹھاتا ہے، کسی کو مارتا ہے۔ وہ کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ جو اسکا حکم ہوتا ہے، وہی ملک کا قانون ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ میں ہمیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ملتی۔ وہاں تو اللہ اور رسول ﷺ کا حکم چلتا ہے۔ وہاں تو اتنا اتفاق رائے ہے، اتنی عاجزی ہے، انکساری ہے کہ لوگوں کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ محفل میں خلیفۂ وقت کون ہے اور عوام الناس کون ہے۔ خلیفۂ وقت جب بیت المقدس کو فتح کرنے آتے ہیں تو پیدل چل رہے ہوتے ہیں اور غلام اونٹ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آمریت تو ایسی نہیں ہو سکتی۔

پھر کہا جاتا ہے کہ خلافت ملائیت ہوتی ہے یعنی کہ ملاّ کی حکومت۔ یہ معاملہ بھی اس لیے نہیں ہے کہ خلافت راشدہ میں ملاّ یا علماء کا الگ سے کوئی گروہ تو تھا ہی نہیں۔ ہر فرد مجتہد تھا۔ ہر فرد عالم تھا۔ ہر فرد اللہ کے رسول ﷺ کا تربیت یافتہ تھا۔ ہر فرد دین کی سطح پر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پڑھا لکھا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ اس طرح ہیرے بکھرے ہوئے تھے کہ کہ جس کو چاہو چن لو۔ وہ ہر ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھے۔ خلیفہء وقت کمانڈر انچیف بھی ہیں۔ خلیفہء وقت جمعہ کا خطبہ بھی پڑھا رہے ہیں اور فتوے بھی جاری کر رہے ہیں۔ خلیفہء وقت قاضی بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ روحانی مرشد بھی جو کہ تزکیہ اور تربیت بھی فرما رہے ہیں اور اللہ کے اتنے بڑے ولی اور فقیر ہیں کہ کائنات کے عناصر پر بھی ان کی حکومت ہے۔ کوئی دریا کو حکم دے رہے ہیں اور کوئی حشرات الارض کو۔ یہ کون سے پر اسرار وجود ہیں؟ کیا جمہوریت، ملائیت، آمریت اور بادشاہت ایسی ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں!

یہ اتنا مختلف پہلو ہے کہ اسکی لطافت اور روحانیت کو سمجھے بغیر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ خلافت راشدہ کے پھل اور اسکی خوشبو سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ بہت حیرت انگیز پہلو ہے۔ انسانیت نے اس سے پہلے نہ یہ نظام و معاشرہ کبھی دیکھا اور نہ ہی بعد میں۔ ہم یہ اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ آئندہ آنے والے وقتوں میں اگر ہم اسکا عشر عشیر بھی اپنے ملک میں نافذ کر سکیں، تو ہمارا پاکستان جنت بن جائیگا۔

یہاں پر ہم علامہ اقبالؒ کی مدد لینا چاہیں گے کیونکہ اقبالؒ کے بغیر ہمارا کوئی کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ اقبالؒ نے ماشاءاللہ خلافت اور بادشاہت کے فرق کو واضح کیا ہے ان کی ایک بہت اعلیٰ نظم ''خلافت اور ملوکیت'' کے نام سے ہے۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

عرب خود را بہ نور مصطفیٰ ﷺ سوخت

چراغ مردہ مشرق برا فروخت

''عربوں نے اپنے آپ کو نورِ مصطفیٰ ﷺ سے منور کر لیا۔ مشرق کے بجھے ہوئے چراغ کو روشن کر دیا۔''

بنیادی طور پر خلافت راشدہ حضور ﷺ کے نور سے منور ہوئی ہے۔ خلافت راشدہ وہی اختیار رکھتی تھی جو اختیار حضور ﷺ نے اپنے فقراء اور خلفاء کو دیا تھا۔ کیونکہ وہ دینی، روحانی اور سیاسی مرکز ہے لہذا اسکا اختیار

وہی ہے جو نبوت کا اختیار ہے۔اور اقبالؒ مزید کہتے ہیں کہ:

ولیکن آن خلافت راہ گم کرد

کہ اول موموناں را شاہی آموخت

مگراب انہوں نے وہ خلافت گم کردی ہے کہ جس نے پہلے پہل مسلمانوں کو دنیا میں حکومت کرنا سکھایا۔

اقبالؒ کو بہت رونا آتا تھا، بہت دکھ تھا اس بات کا کہ خلافت کو تباہ کر دیا گیا۔حالانکہ ۱۹۲۴ء میں جو خلافت گم ہوئی، وہ سیاسی خلافت تھی مگر اس کے باوجود امت مسلمہ کی عزت وآبرو کی محافظ تھی۔امت کی تلوار تھی۔

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قباء

اپنوں کی سادگی بھی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

جب خلافت کا اختتام ہو گیا تو اقبالؒ خون کے آنسو روئے۔کہتے ہیں:

خلافت بر مقام ما گواہی است

حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ہمارے مقام پر گواہی خلافت ہے۔مسلمانوں کا جو مقام ہے، جو اعلیٰ کردار ہے، عروج، عزت و آبرو ہے، اس پر جو مہر ہے، وہ خلافت ہے۔اور جدید بادشاہتیں جو کہ آمریت ہیں، وہ مسلمانوں پر حرام ہیں۔

انہوں نے بالکل واضح کردیا کہ خلافت بادشاہت سے الگ ہے۔آجکل دنیا میں صرف ویسی بادشاہتیں نہیں ہیں کہ کہیں کوئی شخص بادشاہ
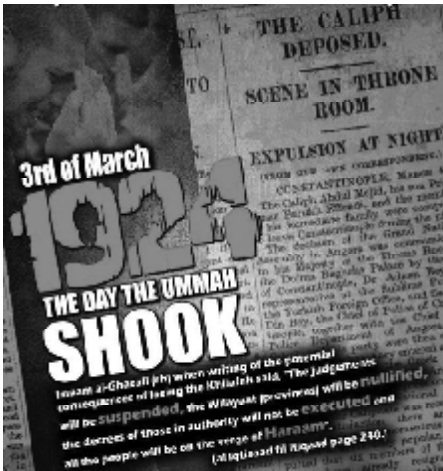
بن گیا۔آجکل بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کی بھی بادشاہتیں ہیں۔افراد نے بھی بادشاہتیں بنائی ہوئی ہیں۔ صرف نام بدلے ہوئے ہیں۔کہیں اسکو جمہوریت کہتے ہیں مگر درحقیقت مطلق العنان، ظالم، جابر آمریتیں ہیں۔سابق سوویت یونین میں کمیونسٹ پارٹی تھی۔ کہنے کو پارٹی کی حکومت،لیکن ظالم اور جابر آمریت تھی۔ چین میں جو کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہے وہ بھی اچھے خاصے ظالم اور جابر حکمران ہیں۔اقبالؒ مزید کہتے ہیں:

ملوکیت ہمہ مکر است ونیرنگ

خلافت حفظ ناموس الٰہی است

بادشاہت تو سراسر فراڈ اور دھوکہ ہے۔اور خلافت دین کی عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہے۔

یہاں واشگاف الفاظ میں فرق بیان کیا جارہا ہے کہ خلافت نہ تو بادشاہت ہے نہ ملکویت اور نہ ہی آمریت۔پھر کہتے ہیں۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است

نظامش خام وکارش ناتمام است

ابھی تک زمانے میں انسان غلام ہیں۔ابھی تک انسان نے جتنے بھی سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام بنائے ہیں۔وہ ناکام ہیں۔نامراد ہیں۔بیکار ہیں۔

اس وقت پوری دنیا میں کوئی سرمایہ دارانہ نظام کا غلام ہے اور کوئی اشتراکیت کا۔یہ سارے انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں۔کسی ایک انسان کی خام فکر جوز بردستی پوری دنیا پر مسلط کی جارہی ہے۔جب آپ کسی اور کے قانون اور فکر پر چلتے ہیں تو انسان انسان کا غلام ہوجاتا ہے۔جب آپ اللہ کی مرضی پر چلیں تو انسان آزاد ہوتا ہے۔تو اقبالؒ یہاں پر یہی بات کررہے ہیں کہ جو بھی انسان کا بنایا ہوا نظام ہے، چاہے وہ بادشاہت ہے، جمہوریت ہے، آمریت ہے یا ملائیت ہے، یہ انسانوں کو انسانوں کا غلام بنائے ہوئے ہیں۔انسان کا بنایا ہوا نظام ناتمام ہے، بیکار ہے، ناکام ہے۔اقبالؒ مزید کہتے ہیں کہ میں ان حضورﷺ کا

غلام ہوں کہ جن کے دین میں بادشاہت حرام ہے۔

غلام فقر آن گیتی پناہم

کہ دردینش ملوکیت حرام است

یہاں پر اقبالؒ جس ملکویت اور بادشاہت کو حرام قرار دے رہے ہیں، وہ سیکولر ہے۔لا دین ہے۔اس بات کو سمجھنا ضروری ہے۔اگر آپ انسانیت کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی سردار یا لیڈر تو ہوتا ہی ہے۔ قبیلے سے شروع کیجیئے اور بڑی بڑی سلطنتوں تک چلے جایئے۔ ہمیشہ بادشاہتی نظام رہا ہے۔ انسانوں کی ہر تہذیب میں کوئی نہ کوئی بادشاہ ضرور ہوا کرتا تھا چاہے چین ہو یا یورپ۔ یونان کی تہذیب ہو یا رومی اور فارسی سلطنتیں۔ ہمیشہ بادشاہ کا تصور رہا ہے۔ پہلے سردار ہوتا تھا۔ پھر راجہ بن گیا۔ پھر کئی راجے مل کر مہاراجہ بنا۔ پھر مہاراجوں پہ ایک بادشاہ بنا اور کئی بڑے بڑے بادشاہوں پر ایک شہنشاہ ہوا۔

قرآن میں بھی اگر آپ دیکھیں تو بادشاہوں کا ذکر موجود ہے۔ حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ تھے۔حضرت ذوالقرنینؑ بھی بادشاہ تھے۔بادشاہتی نظام انسانوں میں رائج رہا ہے مگر دین جس بادشاہتی نظام کو حرام قرار دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں مطلق العنان بادشاہ کی مرضی چلتی ہے جیسا کہ نمرود اور فرعون۔اگر بادشاہ شریعت کے تابع ہو تو وہ بادشاہت دین میں حرام نہیں ہے۔

آپ کو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی مثال دیتے ہیں۔سلطان صلاح الدین ایوبیؒ مصر اور شام کے سلطان تھے۔وہ بادشاہ ہیں مگر خطاب ''سلطان'' کا ہے۔وہ فوجی سپہ سالار بھی ہیں اور حتمی عدلیہ بھی، مگر وہاں پر اعلیٰ ترین حکم شریعت کا چلتا ہے، سلطان کا نہیں۔انتظامی اور عسکری معاملات میں سلطان کی مرضی ضرور چلتی ہے مگر اللہ کی زمین پر نظام اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا ہے۔لہذا سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی حکومت وہ حکومت ہے جو اللہ کے ولیوں کی حکومت ہوتی ہے، جو حضرت ذوالقرنینؑ کی حکومت تھی، جو حضرت سلیمانؑ کی حکومت تھی۔ یہ لوگ تھے تو بادشاہ مگر یہ وہ بادشاہت نہیں تھی جو سیکولر ہوتی ہے، جس میں ایک شخص کی مرضی چلتی ہے، جس میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔

سلطان کا تصور دین میں یہ ہے کہ جو خلافت کے تحت کام کرتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ بھی عباسی خلافت کے وفادار تھے۔ مغل بادشاہوں نے بھی بادشاہتیں بنائیں، ٹیپو سلطان، سراج الدولہؒ اور انکے علاوہ بھی جہاں جہاں مسلمان بادشاہتیں بنتی گئی ہیں، سلطان بنتے چلے گئے ہیں، وہ سب کے سب خلیفہء وقت کی طرف ہی رجوع کرتے تھے اور جب خلیفہ ان کو اختیار دیتا تھا، خلعت بھجواتا تھا، منظوری دیتا تھا، تب دنیا میں ان کی ساکھ قائم ہوتی تھی۔ ایک اخلاقی طریقہء کار ہوتا تھا۔ امت مسلمہ میں بڑے بڑے بادشاہ ایک طرف تو شریعت رائج کرتے تھے اور دوسری طرف وہ خلیفہ سے اختیار لیتے تھے۔ یہ سند لی جاتی تھی کہ ہم اس بڑے مسلمان مرکز کے تحت کام کررہے ہیں کہ جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کو دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی تصورات دنیا کے کسی اور نظام میں نہیں ہیں۔ آپ کسی اور سیاسی سوچ اور فکر سے ان کا موازنہ بھی نہیں کرسکتے۔ نہ آپ اسے جمہوریت کہہ سکتے ہیں، نہ یہ آمریت ہے، نہ یہ کوئی سیکولر بادشاہت ہے کہ جس کے بارے میں اقبالؒ نے کہا کہ میں ان حضور ﷺ کی امت کا غلام ہوں کہ جن کے دین میں وہ بادشاہتیں حرام ہیں۔

اسی طرح وہ بادشاہتیں جو شریعت کی پابند ہیں وہ دین میں نہ صرف جائز اور حلال ہیں بلکہ ان کو قائم کرنے کا بھی حکم ہے۔ یہی بات اقبالؒ نے کی کہ جب جنیدی اور اردشیری مل جائیں گے یعنی جب روحانی اور مذہبی جہت سیاسی اور عسکری طاقت کے ساتھ مل جائے گی تو پھر وہ اختیار حاصل ہوگا جسے آپ چاہے سلطان کا نام دیں، خلافت کا نام دیں، بادشاہت کہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ بادشاہت دین کی روحانی اور ظاہری شریعت کو نافذ کررہی ہے اور اصل کمانڈ اور کنٹرول اللہ اور اسکے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور حکم اللہ کا نافذ ہورہا ہے تو پھر اس بادشاہت کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔

اب آتے ہیں تھیوکریسی کے مغربی تصور کی طرف۔ تھیوکریسی کی دو تعریفیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تعریف تو یہ ہے کہ مولوی کی حکومت ہو یعنی ملاّ طبقہ حکومت کرے۔ دوسری تعریف یہ ہے کہ وہاں پر اللہ کا قانون نافذ ہو۔ اسلامی سیاسی تصور میں ملاّ کی حکومت نہیں ہوتی مگر شریعت ضرور نافذ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی حکومت تھیوکریسی نہیں بھی ہے اور ہے بھی۔ جہاں تک مولوی کی حکومت کا تعلق ہے تو مسلمان

تہذیب وتاریخ میں کبھی بھی تھیوکریسی نافذنہیں ہوئی۔لیکن اگرتھیوکریسی کی یہ تعریف کی جائے کہ وہاں اللہ کا قانون نافذ ہوتا ہے،شریعت نافذ ہوتی ہے،تو پھر چودہ سوسال کی اسلامی تاریخ میں لاکھوں مثالیں ایسی ہیں کہ بادشاہوں نے بھی شریعت نافذ کی ہے۔اسکوآپ تھیوکریسی کہیں گے یا مطلق العنان بادشاہت؟ نہ یہ تھیوکریسی ہےاور نہ ہی ایک آمر کی بادشاہت۔کیونکہ ایک بادشاہ ہے جوشریعت نافذ کررہا ہے۔

یہ ایسے حیرت انگیز پہلو ہیں کہ جنہیں آپ جدید سیاسیات کی رائج زبانوں میں بیان بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے دین کی اصطلاحیں مثلاً شریعت،تقویٰ،برکت،طریقت،ان کا تو آپ انگریزی میں ترجمہ بھی نہیں کرسکتے۔انگریزی میں تو ایسے لفظ ہی ایجادنہیں ہوئے ہیں جوان روحانی اصطلاحات کی نمائندگی کرسکیں۔ اسی طرح جب ہم اپنی سیاسی فکر کی بات کرتے ہیں،خلافت اورروحانی سیاست کی بات کرتے ہیں،جنیدی اوراردشیری کی بات کرتے ہیں،تو جدیدمغربی سیاسی فکراسے سمجھنے میں بھی بری طرح ناکام ہوجاتی ہے۔ ہم خود ہی ان کی تشریح کریں گے،خود ہی سمجھائیں گےاورخود ہی بڑےفخر سے اپنے ورثے کواپنائیں گے کہ جس کوہم خلافت راشدہ کہتے ہیں۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی
آئینِ جواں مرداں! حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

۴

خلافت راشدہ اور دیگر نظاموں کا تقابلی جائزہ

خلافت راشدہ کے نظام کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے ہم اس دور کے حالات کا تھوڑا سا تقابلی جائزہ لینا چاہیں گے کہ جن میں خلافت راشدہ قائم ہوئی اور پھیلی۔ اس وقت دنیا کے حالات کیا تھے؟ اس زمانے کے سیاسی، معاشی اور عسکری طاقت کے مراکز کیا تھے؟ جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں عالمی طاقتیں یا سپر پاورز کہا جاسکتا ہے۔ خلافت راشدہ کا موازنہ اُس نظام سے کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ آپ کو یہ اندازہ ہو سکے کہ خلافت راشدہ کے نظام میں وہ کیا قوت اور خیر تھی کہ اس نے اپنے دور کے پہلے سے قائم شدہ طاقت کے تمام مراکز کو ہلا کے رکھ دیا بلکہ کچھ کو تو اڑا کے ہی رکھ دیا۔ یہ نظام کیوں اتنا مختلف تھا کہ دنیا نے اس سے پہلے یا اس کے بعد ویسا کوئی نظام نہیں دیکھا۔ یہ نظام جب اپنے عروج پر پہنچا تو اس کا اپنے زمانے کی عالمی طاقتوں سے براہ راست تصادم ہوا۔ ان عالمی طاقتوں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی تھیں۔ ایسی ایسی حکومتیں تھیں کہ جو صدیوں سے آباد تھیں۔ ایسے ایسے خاندان تھے جو نسل در نسل حکومت کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کے پاس اپنے وقت کی جدید ترین عسکری طاقت بھی تھی اور وہ بے شمار مالی وافرادی وسائل سے بھی مالا مال تھے۔ وہ طاقتیں صدیوں تک دنیا میں اپنا لوہا منواتی رہی تھیں۔ ایک طرف

فارسی سلطنت تھی جو کہ صدیوں سے قائم تھی جبکہ دوسری جانب رومی سلطنت بھی کئی ہزار سال پرانی تاریخ رکھتی تھی اور تیسری طرف مشرق کی بڑی تہذیب چینی سلطنت تھی۔ یہ اُس وقت کی دنیا کی عظیم طاقتیں تھیں اور دنیا کے تمام تر اہم ترین علاقے یعنی مشرق وسطیٰ، ایشیا کوچک، وسطی ایشیا، یورپ اور چین، انہی تین عظیم سلطنتوں کا حصہ تھے۔

خلافت راشدہ کا موازنہ ہم انہی تین بڑی سلطنتوں کے نظام حکومت سے کریں گے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس نئے نظام خلافت میں کیا خصوصیات، طاقت اور شدت تھی کہ جو دیگر حکومتی نظاموں میں نہیں تھی؟

پہلے رومی سلطنت کی بات کرتے ہیں۔ رومی سلطنت بت پرست تھی اور اس کے حکمران دنیا میں ظالم ترین حکمرانوں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ وہاں غلاموں کے حقوق تھے نہ ہی عورتوں کے۔ مفتوحہ اقوام کے ساتھ تو جانوروں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ان تہذیبوں میں انسانی حقوق کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔ اگر آپ اس وقت کی پرانی رومی تاریخ کا مطالعہ کریں کہ جس میں حضرت عیسیٰؑ کے دور کی رومی سلطنت کی اصلیت دکھائی گئی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسان کس طرح انسانوں کی غلامی میں پسا ہوا تھا۔ رومی سلطنت کا دائرہ کار افریقہ کے شمال تک پھیلا ہوا تھا۔ یورپ، ایشیا میں موجودہ ترکی، شام، لبنان اور مصر وغیرہ پر بھی رومیوں کی حکومت تھی۔ اس کی ایک شاخ مشرقی بازنطینی سلطنت کہلاتی تھی۔ اس کی قسطنطنیہ

میں الگ بادشاہت تھی۔حضرت عیسیٰؑ کے دنیا میں تشریف لانے کے چند سو سال بعد اس رومی سلطنت نے ظاہراً عیسائیت تو قبول کر لی مگر انہوں نے عیسائیت کو اس طرح قبول کیا کہ اس کی شکل ہی بگاڑ کر رکھ دی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائیت کا مرکز آج بھی اٹلی (روم) میں ہے۔اس کی شروعات اسی وقت ہوئی تھیں کہ جب رومی سلطنت نے عیسائیت کو مذہب کے طور پر قبول کیا تھا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضور ﷺ کو اس دنیا میں بھیجا کیونکہ عیسائی مذہب اب اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا تھا۔اسوقت انجیل میں بے شمار تبدیلیاں کی جا چکی تھیں ۔ جو ہدایت کا سرچشمہ سیدنا عیسیٰؑ لے کر آئے تھے، اس میں رومی سلطنت نے بہت سے بت پرستانہ اور مشرکانہ تصورات شامل کر دیئے تھے۔ اس لیے ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جو انسانی حقوق، محبت اور نرمی سیدنا عیسیٰؑ لیکر آئے، وہ تمام تصورات عیسائی رومی سلطنت میں ناپید ہو چکے تھے اور یہ ظالمانہ، جابرانہ اور فرعونیت پر مبنی سلطنت بن چکی تھی۔حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی الہامی کتاب انجیل کی اس طرح دھجیاں اڑائی گئیں کہ پھر اس کے بعد انسانیت کی ہدایت کیلئے اور کوئی راستہ ہی موجود نہیں تھا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رحمت بنا کر بھیجا۔

رومی سلطنت گو کہ مذہباً عیسائی تھی، مگر اس میں انسانیت بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ بادشاہتیں انتہائی ظالم تھیں۔اس قدر ظلم کیا جاتا تھا کہ انسانوں کو بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا جاتا اور باقی دنیا تماشا دیکھتی۔صرف تفریح کیلئے غلاموں کو آپس میں لڑوا کر قتل کروادیا جاتا۔آج بھی روم میں ایسی مقتل گاہوں کے نشانات موجود ہیں جہاں پر یہ مقابلے منعقد کروائے جاتے تھے۔انسانیت پر

ظلم وستم کی انتہاء ہوتی تھی۔ یہ ساری مشرکانہ اور ظالمانہ روایات رومی سلطنت نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے باوجود بھی برقرار رکھیں۔ جدید دور میں اس پر بڑی بڑی فلمیں بھی بنی ہیں۔ ان کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسانیت پر اس سے زیادہ ظلم نہیں ہوسکتا تھا۔

آج کل جس برائے نام جمہوریت کی بات کی جاتی ہے، اس کے تجربات بھی بنیادی طور پر روم سے ہی شروع ہوئے۔ سینیٹ، پارلیمنٹ، سٹیٹ، ریپبلک وغیرہ کی اصطلاحیں وہیں سے آئی ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے کے دور کی بات ہے مگر ان کی وہ جمہوریت چل نہیں سکی۔ اس کے بعد پھر وہی بادشاہت آگئی اور ظلم کا نظام چلتا رہا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب خلافت راشدہ قائم ہورہی تھی، اس وقت تک وہ تمام علاقے جہاں رومی سلطنت قائم تھی یعنی مشرق وسطیٰ، (شام، لبنان، مصر) شمالی افریقہ اور پورا یورپ، وہاں یہی ظالمانہ اور جابرانہ آمریتوں کا نظام قائم تھا۔

اس کے مقابلے پر عراق، ایران، خراسان اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں فارسی سلطنت قائم تھی۔ ظلم، جبر اور انسانوں کو غلام بنانے میں فارسی سلطنت بھی رومی سلطنت کا ہی دوسرا روپ تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کے لوگ آتش پرست تھے اور رومی عیسائی۔ لیکن طرز حکومت ایک ہی جیسا تھا۔ دونوں جگہ بادشاہتیں قائم تھیں۔ دونوں جگہ شدید ظلم وستم جاری تھا۔ انسانوں پر انسانوں کی حکومت تھی۔ انسانی حقوق کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔ غلاموں کے ساتھ تو جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا۔ انسانیت ظلم کی چکی میں پس رہی تھی۔ اقدار، اخلاقیات، اصول اور جنگی قوانین تو تھے ہی نہیں۔ یعنی یہ تصور کرنا بھی کہ جانوروں یا غلاموں کے بھی حقوق ہوتے ہیں یا مفتوح قوم کے بھی کچھ حقوق ہونگے، ناممکن تھا۔ فوجیں جب شہروں میں جاتیں تو آبروریزی، عصمت دری، قتل وغارت اور لوٹ مار کرتیں اور گاؤں کے گاؤں جلا ڈالتیں اور لوگوں کی عبادت گاہیں تباہ کردی جاتیں۔ بالکل ایک ہی جیسی خصوصیات تھیں رومی اور فارسی سلطنتوں کی

باوجود اس کے کہ ایک خود کو عیسائی کہلواتی اور دوسری آتش پرست۔

اسی طرح ایک تیسری طاقت تھی کہ جس کا مرکز چین تھا۔ چین میں کچھ لوگ بدھ مذہب تھے اور کچھ سورج کی پوجا کرتے تھے۔ آنے والے دور میں چنگیز خان بھی سورج کی پوجا ہی کیا کرتا تھا۔ مگر ان کا بھی وہی طرز حکومت تھا جو رومی اور فارسی سلطنتوں کا تھا۔ تینوں سلطنتوں کے مذاہب مختلف تھے مگر باقی سارا نظام تقریباً ایک جیسا ہی تھا۔ تینوں جگہ نسل در نسل بادشاہتیں چلی آ رہی تھیں۔ تینوں میں شدید ظالمانہ نظام رائج تھے۔ تینوں معاشرے طبقات میں تقسیم تھے۔ غلام سب سے نچلے درجے میں تھے۔ اس کے بعد جن قوموں پر حکومت قائم تھی، ان کے الگ درجات تھے۔ مساوات کا کوئی تصور نہیں تھا یعنی یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ تمام انسان برابر ہیں اور کالے کو گورے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ افریقہ کا اس سے بھی زیادہ برا حال تھا اور اس زمانے کے سب افریقی بت پرست مشرک تھے اور کئی قبائل تو آدم خور بھی۔ یہ تھی پوری دنیا کی حالت۔ اس میں یہ تینوں سلطنتیں دنیا کی بڑی عالمی طاقتیں تھیں۔ ان کے پاس لاکھوں کی افواج تھیں، اس دور کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور ہتھیار بھی کہ جس میں گھڑ سوار فوج، منجنیقیں، جو کہ اس دور کا توپخانہ تھا، اور پھر بڑے بڑے بحری جہاز یعنی اس دور کی بحریہ۔

اس کے مقابلے میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان فوجی کارروائیوں کے ذریعے اسلامی ریاست کے دائرہ کار کو اب جزیرہ نما عرب سے باہر تک پھیلایا جائے گا۔ اس فیصلے کے

فارسی سلطنت کا نقشہ

نتیجے میں وہ مسلمان جو جزیرہ نما عرب میں رہتے تھے اور پہلے کبھی کسی حربی کارروائی کیلئے باہر نہیں نکلے تھے، وہ بیک وقت رومی اور فارسی سلطنتوں سے ٹکرائے۔ عراق اور شام پر ایک ساتھ حملہ کرنے کیلئے دو لشکر بھیجے گئے۔ پندرہ سال سے بھی کم عرصے میں فارسی سلطنت کو بالکل لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ فارسی سلطنت کی سرحدیں چین سے ملتی تھیں۔ مسلمان عراق، ایران، خراسان، افغانستان اور وسطی ایشیا فتح کرتے ہوئے کاشغر تک جا پہنچے یعنی کہ موجودہ سنکیانگ۔ آج سنکیانگ میں جو مسلمان بستے ہیں، وہ صحابہ کرامؓ کے دور میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ مسلمان فوجیں سنکیانگ سے آگے نہیں جا سکیں۔ وہاں پہ مسلمان فوجوں کو روک دیا گیا لیکن مدینہ سے نکلیں تو عراق، ایران، افغانستان، وسطی ایشیاء اور پھر سنکیانگ تک ایک مسلسل مسلمان پٹی ہے۔

حیرت انگیز طور پر ایک طرف تو مسلمانوں نے پوری ایرانی سلطنت کی بساط کو لپیٹ دیا اور چین کے بھی تمام مغربی صوبے مسلمانوں نے لے لیے جبکہ دوسری طرف شام، لبنان، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کے تمام علاقے جو کہ رومی سلطنت کا حصہ تھے، بھی مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ رومی سلطنت کے پاس یورپ کے علاوہ صرف موجودہ ترکی اور قسطنطنیہ کا علاقہ ہی رہ گیا تھا۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں یعنی شمالی افریقہ سے لیکر سنکیانگ تک کے لوگوں نے مسلم فتوحات کے ساتھ ہی اسلام بھی قبول کر لیا۔ آج بھی نقشہ اٹھا کر دیکھ لیجیئے، یہ علاقے اب بھی مسلمان ہیں۔ یہاں کے لوگ خلافت راشدہ کے دور میں ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے مسلمان ہونے کی وجہ کیا تھی؟

وہ علاقے جن پر رومیوں اور ایرانیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا، وہاں کے بہت سے لوگوں نے عیسائی، پارسی یا بدھ مذہب قبول کر لیے تھے لیکن جب مسلمان وہاں پہنچے تو وہاں کی مقامی آبادی نے اپنے اپنے مذاہب چھوڑ کر جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ کیوں؟ یہ تاریخ کا اتنا بڑا سوال ہے کہ جس کا کوئی ماہر عمرانیات جواب نہیں دے سکتا۔ ہوتا تو یہ ہے کہ جو قوم آپ پر قبضہ کرتی ہے، آپ کو اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ آپ آزادی کے حصول کے لیے تحریک مزاحمت شروع کر دیتے ہیں۔ افغانستان میں آج لوگوں نے عیسائیت قبول کر کے امریکی فوج کو خوش آمدید نہیں کہا بلکہ وہ امریکہ کے خلاف مزاحمت کر رہے

ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ قبضہ کرنے والی قوتوں کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کی جاتی ہے۔ کیونکہ مقامی لوگ، جو صدیوں سے وہاں رہ رہے ہوتے ہیں، انہیں اپنے نظام، اپنے مذہب سے ایک محبت ہوتی ہے، ایک پیار ہوتا ہے، ایک قوم پرستی کا جذبہ ہوتا ہے، ایک وفاداری ہوتی ہے اور وہ اپنی حکومتوں کے ساتھ ملکر جارح فوج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن خلافت راشدہ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان فوجیں جہاں بھی داخل ہوتی ہیں، وہاں کے لوگ اُن پر فتح حاصل کرنے والی نئی قوم کے مذہب، اقدار اور روایات کو قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو یہ کیا جادو تھا؟

ہم نے یہ دیکھا ہے کہ رومی سلطنت کی بنیاد عسکری اور معاشی طاقت پر تھی۔ بنیادی طور پر وہ آمریت اور ظالمانہ حکومت تھی۔ یہی معاملہ ایرانی اور چینی سلطنت کے ساتھ بھی تھا۔ مذہب رکھنے کے باوجود ان کی کوئی نظریاتی، روحانی اور اخلاقی بنیاد نہیں تھی۔ اس کے برعکس خلافت راشدہ کے دور میں جب اسلامی ریاست پھیلنا شروع ہوئی تو اس کے پاس معاشی طاقت تھی نہ عسکری۔ وہ صرف روحانی اور نظریاتی بنیادوں پر پھیلنا شروع ہوئی۔ ایک نیا نظام، ایک جدید نظریہ اور ایک ایسی روحانی نسل کہ جو اُس زمانے میں کسی نے کبھی دیکھی نہ سنی۔ وہ جنگی قوانین اور اخلاقیات کہ جن کی نبیوں کے ساتھ نسبت کے بارے میں لوگوں نے قصے کہانیوں میں تو شاید سنا ہو، لیکن ایک پوری قوم یہ مزاج رکھتی ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں رومی بادشاہ نے اپنا ایک سفیر مدینہ بھیجا تا کہ وہ پتہ کر کے آئے کہ یہ کون لوگ ہیں جو کہ پوری دنیا پر قبضہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جب وہ سفیر مدینہ پہنچا تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ اہل مدینہ نے کہا کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہوتا بلکہ ہمارے امیر المومنین ہوتے ہیں۔ اُس سفیر کے لیے امیر المومنین والی بات بہت حیران کن تھی۔ تاہم اس نے پوچھا کہ ان کا محل کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی محل بھی نہیں ہے بلکہ مسجد نبوی کے ساتھ ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ وہ سفیر مزید حیران ہوا۔ اس نے پھر پوچھا کہ میں ان کو کہاں مل سکتا ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ ابھی ان سے نہیں مل سکتے کیونکہ بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اور امیر المومنینؓ وہ اونٹ ڈھونڈنے ریگستان گئے ہوئے ہیں۔ اس سفیر پر دہشت طاری ہو گئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے پوری دنیا

فتح کر لی ہے اور ان کا امیر المومنین اتنا سادہ ہے کہ بیت المال کا اونٹ ڈھونڈ نے خود گیا ہوا ہے۔ وہ سفیر ریگستان چلا گیا اور دیکھا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے آرام فرما رہے ہیں۔ وہ سفیر حضرت عمرؓ سے مخاطب ہوا ''عمرؓ! آپ انصاف کرتے ہیں لہذا سکون سے سوتے ہیں۔ ہمارے بادشاہ ظلم کرتے ہیں، اسی لیے ہزاروں سپاہیوں کی موجودگی میں بھی انہیں اپنی جان کا خوف رہتا ہے''۔اس سے خوبصورت تجزیہ اس دور کے سیاسی ومعاشی نظاموں کا ہو ہی نہیں سکتا اور اس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ الفاظ بذات خود ہی بتا دیتے ہیں کہ اس وقت کا سیاسی ومعاشی نظام کیا تھا اور اس وقت کی بڑی بڑی طاقتیں کن ظالمانہ نظاموں کے تحت چل رہی تھیں اور ان کے مقابلے پر خلافت راشدہ کس قدر روحانی اور الہامی نظام حکومت تھا۔

تاریخ میں اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت خالد بن ولیدؓ کی سر براہی میں مسلمان فوج نے ایک ساتھ رومی اور ایرانی سلطنتوں پر حملے کیے تو دشمنوں نے مسلمان فوج میں ایک جاسوس بھیجا۔ اس جاسوس نے کئی دن مسلمان فوج کے ساتھ گزارے۔ واپس جا کر اس نے اپنے بادشاہ کو بتایا کہ میں نے دنیا میں آج تک ایسی فوج کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لوگ رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کو رات کے وقت دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ساری ساری رات عبادت کرتے ہیں اور اتنے متقی اور پرہیز گار ہیں کہ گویا مسجدوں میں بیٹھنے والے راہب ہوں۔ اور اگر دن میں دیکھو تو ایسے شہسوار کہ جیسے دنیا میں ان سے زیادہ بہادر اور جنگجو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

اسلام آنے سے پہلے اور بعد بھی دنیا میں جب کافر فوجیں علاقے فتح کرتی تھیں تو وہاں تباہی و بربادی پھیلا دی جاتی تھی۔انسانوں کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ چنگیز خان تو انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنایا کرتا تھا۔ اس کے مظالم تو تاریخ میں مشہور ہیں۔ بغداد کی پندرہ لاکھ کی آبادی کو اس نے ایک ہفتے میں ذبح کر دیا۔ ایک بھی مسلمان وہاں زندہ نہ بچا۔ دجلہ کا پانی پہلے مسلمانوں کے خون سے سرخ ہوا

اور اس کے بعد کتابوں کی سیاہی سے اس کا رنگ سیاہ ہو گیا۔

صلیبی جنگوں کے دوران صلیبی نائٹس جو کہ پوری عیسائی دنیا کی نمائندگی کرتے تھے، جب انہوں نے بیت المقدس شریف فتح کیا تو اتنا قتل عام کیا کہ مسلمانوں کا خون مسجد عمر میں کفار کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں کے نومولود بچوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر دیواروں پر مارا جاتا اور ان کے سر کھول دیے جاتے تھے۔ یہ واقعات خود عیسائی مورخین نے بیان کیے ہیں۔ صلیبی نائٹس اعلیٰ ترین تربیت یافتہ فوجی ہوتے تھے۔ اگرچہ وہ مذہب کے نام پر جنگ لڑ رہے تھے مگر ان کی اخلاقیات کا عالم یہ تھا کہ نہ عورتوں کا لحاظ کرتے، نہ بچوں کا۔ ساری ساری رات شراب پیتے اور بدکاری کرتے۔ لوٹ مار کرنا ان کا پیشہ اور شیوہ تھا۔

اس کے مقابلے میں خلافت راشدہ اور اس کے بعد کے دور کی مسلمان فوجیں جب دنیا میں کسی جگہ جاتیں تو ان کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ہم محمد بن قاسمؒ کے حوالے سے سنتے ہیں کہ انہیں جب ہندوستان بھیجا گیا تو انہوں نے عدل وانصاف کا جو معیار قائم کیا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ہندو ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ ان کی مورتی بنا کے رکھا کرتے تھے کہ یہ کوئی انسان نہیں بلکہ دیوتا ہیں۔ کسی عام انسان میں اتنی اخلاقیات نہیں ہوسکتیں کہ وہ فاتح بھی ہو اور اس کے باوجود مفتوح قوم کی اتنی عزت کرے کہ ہندو عورتوں کے سروں پر دوپٹے بھی رکھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ جو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے سپہ سالار تھے، ان کا کردار یہ تھا کہ ایک عیسائی عورت کا بچہ گم ہو جاتا ہے تو وہ عیسائی عورت اپنی فوج کو کہنے کی بجائے مسلمان سلطان سے درخواست کرتی ہے کہ میرا بچہ مجھے ڈھونڈ دیجیئے کیونکہ ہمارے بادشاہ اور جرنیل یہ کام نہیں کر سکتے۔ ہمیں

بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا سپہ سالار اتنا نیک ہے کہ وہ یہ کام کردے گا۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اس عورت کا دکھ دیکھ کر آنسوؤں سے روئے اور پھر مسلمان فوج کو یہ حکم دیا کہ اس عورت کے بچے کو تلاش کر کے اسکی ماں کے حوالے کیا جائے۔ سلطان اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے کہ جب تک بچہ ماں سے ملا نہ دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے ایک گھوڑا طلب کیا اور ماں بیٹے کو عزت کے ساتھ عیسائی لشکر کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ کونسا کردار تھا؟ یہ کونسی اخلاقیات تھیں؟ یعنی جو تقابلی جائزہ ہم دینا چاہتے ہیں وہ انسان کے تصور سے بھی باہر ہے۔

عام انسان کے سوچ وتخیل میں بھی وہ معاشرہ نہیں آ سکتا کہ جس کی بنیاد خلافت راشدہ کے دور میں رکھ دی گئی تھی ۔ وہ مسلمان ریاست جو اس وقت بے سر و سامانی کے عالم میں اٹھی ، چند ہی سالوں میں اسکی سرحدیں ایک طرف تو چین سے جا ملیں، تو دوسری طرف مسلمان شام، فلسطین اور شمالی افریقہ کو فتح کرتے ہوئے بحر اوقیانوس تک جا پہنچے۔ اس پر اقبالؒ نے ایک مشہور شعر بھی کہا تھا۔

دشت تو دشت، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

حضرت علیؓ کے دور خلافت تک مسلمان تہذیب اتنی پھیل چکی تھی کہ اس سے پہلے دنیا نے اتنی بڑی تہذیب نہ دیکھی تھی۔ مسلمان جہاں جہاں فتح کے جھنڈے گاڑتے ، وہاں کی سو فیصد آبادی بھی مسلمان ہو جاتی اور آج تک مسلمان ہے، ماشاء اللہ۔ مسلم دنیا کا قلب (مشرق وسطیٰ) خلافت راشدہ کے دور میں ہی فتح ہوا تھا۔ اگر مقامی آبادیوں کو تلوار کے زور پر مسلمان کیا گیا ہوتا تو بعد میں تو انہیں کوئی مجبوری نہیں تھی ، وہ لوگ دوبارہ اپنے اپنے مذاہب پر لوٹ سکتے تھے۔ مگر اسلامی تاریخ میں ہمیں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی کو تلوار کے زور پر مسلمان کیا گیا ہو۔ تلواریں ٹکرائی ہیں تو رومی اور ایرانی سلطنتوں سے ٹکرائی ہیں، عوام الناس سے نہیں۔ اس پوری مہم کے دوران جو شمالی افریقہ سے چین تک برپا ہوئی کہیں بھی کسی نہر کو بند نہیں کیا گیا، کہیں درخت نہیں کاٹے گئے، فصلیں نہیں جلائی گئیں، کسی عورت کی بے حرمتی نہیں کی گئی، کسی بچے کو قتل نہیں کیا گیا، کسی عبادت گاہ کو نہیں جلایا گیا اور نہ ہی کسی کا مال لوٹا گیا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں کہیں کوئی اور ایسی

مثال ملتی ہے؟

اس مسلمان فوج کی روحانیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بپھرے ہوئے دریا کو حکم دیتے ہیں اور پھر مسلمان فوج دریا میں داخل ہو جاتی ہے اور دریا ان مجاہدین کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ ایرانی فوج یہ منظر دیکھ کر یہ کہتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوتی ہے کہ ''دیواں آمدند، دیواں آمدند'' یعنی دیو آ گئے دیو آ گئے۔ اخلاقی اقدار کا یہ عالم تھا کہ ایرانی سلطنت کی فتح کے بعد جب ان کے صدیوں سے جمع کیے ہوئے خزانے نکلنا شروع ہوئے اور انہیں سینکڑوں اونٹوں پر لاد کر مسجد نبوی لایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی حیران رہ گئے کہ یہ کونسی فوج ہے جو ایک ایک اشرفی، ایک ایک موتی اور درہم لا کر جمع کرا رہی ہے۔ کسی کی نیت خراب نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ نے وہ خزانے لانے والے ایک سپاہی کو بلا بھیجا۔ وہ سپاہی چہرہ چھپا کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا کہ امیر المومنینؓ! آپؓ کا حکم تھا کہ آپؓ سے ملوں تو میں ملنے آ گیا ہوں مگر مجھے چہرہ دکھانے اور نام بتانے پر مجبور مت کیجیئے گا کیونکہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنے رب کے لیے کیا ہے، دنیا کو دکھانے کیلئے نہیں۔ یہ کردار تھا عام مسلمان سپاہیوں کا جبکہ امیر المومنینؓ کا اپنا یہ حال تھا کہ بیت المال کا گمشدہ اونٹ ڈھونڈنے بھی خود جایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ جب بیت المقدس شریف فتح کرنے گئے تو اس حوالے سے وہ واقعہ بھی تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ جب دنیا نے دیکھا کہ امیر المومنینؓ اس حالت میں بیت المقدس شریف میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کا غلام اونٹ پر سوار ہے اور وہ خود پیدل۔ عیسائی بھی مسلمانوں کے خلیفہ کے اس کردار کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عیسائیوں نے یہ خود تسلیم کیا کہ ان کی مقدس کتابوں میں بھی یہ لکھا تھا کہ جو شخص بیت المقدس شریف فتح کرے گا، وہ اسی شان سے بیت المقدس میں

داخل ہوگا۔ حضرت عمرؓ فقط اپنے غلام کے ہمراہ مدینے سے فلسطین تک کا سفر طے کرتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی سیکورٹی یا محافظ دستے نہیں ہوتے۔ کیا کائنات میں کوئی ایسے نظام حکومت کی مثال بھی پیش کرسکتا ہے کہ جس کو خلافت راشدہ کہتے ہیں؟ آج جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ نظام نافذ ہونا چاہیے تو بعض لوگوں کو کیوں اعتراض ہوتا ہے؟ لوگ اس ظلم کے نظام کو تو قبول کرتے ہیں جو رومی، ایرانی اور چینی سلطنتوں میں قائم تھا اور آج بھی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام حکومت کی شکل میں مسلط ہے لیکن خلافت راشدہ سے ان کی جان نکلتی ہے۔ حالانکہ انسانیت کی فلاح اسی نظام میں ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے

وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی

یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار

اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

۵

جدید جمہوریت اور آمریت

اس سے پہلے کہ ہم خلافت راشدہ کے نظام کی بات کریں، یہ بہت مناسب ہوگا کہ ہم جدید جمہوریت اور آمریت کی بات بھی کریں کیونکہ ہمارے ہاں علم سیاسیات میں اب یہی دو نظام ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ آمریت کے مقابلے میں جمہوری نظام ہونا چاہیےاور جمہوریت انسان کی تمام تکلیفوں کا مداوا ہے۔نعوذ باللہ! جمہوریت کو آج کے جدید دور کا خدا بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ اس دور کے عظیم فلسفی اور مفکر علامہ اقبالؒ نے جمہوریت کے بارے میں کہا ہے کہ:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

یعنی وہ جمہوریت کہ جسے تم آزادی کی نیلم پری سمجھ رہے ہو کہ جس سے تمہیں آزادی اظہار، اخوت، مساوات اور آزادی نصیب ہوجائے گی اور ہر کوئی مادر پدر آزاد ہوجائیگا، وہ جمہوریت اصل میں ظلم و استبداد کا دیو ہے جو پاؤں مارتا چلا آرہا ہے۔ یہ وہ نظام حکومت ہے کہ جس میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں، تولانہیں کرتے۔اس باب میں ہم جمہوریت اور آمریت کے ان بتوں کو توڑیں گے، ان شاءاللہ۔

آج اگر آپ دنیا میں رائج اس جمہوری نظام حکومت کو دیکھیں تو اس کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔مثلاً برطانیہ میں پارلیمانی جمہوریت ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے مضحکہ خیز طور پر بادشاہت کو بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ملکہ بھی اپنی جگہ پہ ہے اور اسکے علاوہ ایک پارلیمانی نظام بھی، جہاں انتخاب کر کے وزیراعظم لایا جاتا ہے۔اسی طرح امریکہ میں صدارتی جمہوریت ہے جہاں صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔امریکہ میں پارلیمانی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں ہے۔لہذا جدید دنیا میں جمہوریت کی بھی مختلف شکلیں موجود ہیں۔

ایران میں بھی ایک طرح کی جمہوریت ہے۔ وہاں بھی انتخابات ہوتے ہیں۔ ایران میں بھی ایک ایسا سیاسی نظام رکھا گیا ہے کہ جس کے تحت پورا ملک انتخابات میں حصہ لیتا ہے اور ووٹ ڈالتا ہے مگر اس کے باوجود ایران میں کوئی سیاسی جماعتیں نہیں ہوتیں۔ایران کے انتخابات پہ یہ لوگ جتنا مرضی اعتراض کرتے رہیں مگر کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہاں شفاف انتخابات نہیں ہوئے یا وہاں جمہوریت نہیں ہے۔ایران کو یہ آمریت نہیں کہتے بلکہ جمہوریت ہی کہتے ہیں۔

ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ جمہوریت کا سیاسی نظام زیادہ تر سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں ہی چلتا ہے۔ دنیا میں جہاں بھی سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے وہاں پر یہ جمہوریت کو فروغ دیتے ہیں جبکہ آمریت کو وہاں آگے لایا جاتا ہے کہ جہاں انہوں نے اشتراکی معاشی نظام بنا رکھے ہیں۔تیسرے سیاسی نظام یعنی

بادشاہت کا ہم بعد میں ذکر کریں گے۔سعودی عرب اور خلیج میں بادشاہتیں قائم ہیں مگر معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہی ہے۔فی الحال ہم جمہوریت اور آمریت کی بات کرتے ہیں۔

جمہوریت کے نظام حکومت میں یہ سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور بینکار یہ تماشا مچاتے ہیں کہ اگر پاکستان ہے تو یہاں دوسو سیاسی جماعتیں پیدا کردیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جب وہ مغربی سیاسی نظریات کو باہر سے لاکر مسلط کرتے ہیں، تو اس میں کئی قباحتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔کئی سو سیاسی جماعتوں کا کوئی احتساب نہیں ہوتا۔علاقائی، لسانی، قومی، فرقہ وارانہ اور قبائلی، غرضیکہ جس مرضی بنیاد پر آپ سیاسی جماعت چاہیں بنالیں اور رجسٹر کرا کر ایک طوفان بدتمیزی برپا کردیں۔حالانکہ مغرب میں انہوں نے یہ کیا ہوا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ میں دو ہی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔امریکہ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن ہیں اور برطانیہ میں ٹوری اور لیبر پارٹی وغیرہ ہیں۔اور جو الیکشن اور سلیکشن ہوتی ہے وہ انہی چند جماعتوں سے ہی ہوتی ہے۔اگر آپ ان دونوں جماعتوں کے پس منظر کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں جماعتوں کے پیچھے ایک ہی مخصوص بین الاقوامی صیہونی سرمایہ داروں اور بینکاروں کا گروہ ہے۔آپ کو نظر یہ آتا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں کی آپس میں شدید لڑائی ہورہی ہے۔انتخابات میں حصہ لیا جارہا ہے، مقابلے کیے جارہے ہیں۔کبھی ٹوری اقتدار میں آرہی ہے تو کبھی لیبر۔کبھی ڈیموکریٹس حکومت سنبھال رہے ہیں تو کبھی ری پبلکن۔اصل میں وہی صیہونی بینکار اور سرمایہ دار جو کہ ان کے پورے معاشرے کو کنٹرول کررہا ہے، وہی اس پورے سیاسی عمل کو بھی کنٹرول کررہا ہوتا ہے۔

Under captilasim man exploits man; under socialism reverse is true.

A Polish Proverb

تیری حریف ہے یا رب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے بچاری فقط امیر و رئیس

سرمایہ دار اس جمہوری سیاسی نظام کی اس لیے زیادہ حمایت کرتے ہیں کیونکہ اس نظام میں پیسے کے زور پر

جوڑ توڑ اور خرید و فروخت کر کے انتخابات کا نتیجہ تبدیل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا اور طاقتور میڈیا بھی انہی سرمایہ داروں کے پاس ہے جو دنیا میں نام نہاد جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں۔ تو یہ لوگ اپنے جمہوری نظام کے فروغ کیلئے اور انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے کیلئے ذرائع ابلاغ کا استعمال کرتے ہیں، یعنی ذہن سازی کرتے ہیں۔ یہ انکے weapons of mass deception ہیں یعنی بڑے پیمانے پر دھوکہ دینے کے ہتھیار۔ انسانوں کی ذہن سازی کیلئے یہ لوگ ذرائع ابلاغ پر جھوٹ بولتے ہیں اور غلط بیانی کرتے ہیں۔ اس مغربی تہذیب کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ دنیا میں جس طرح یہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں کے ذہن تبدیل کرتے ہیں، یہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی بہت طاقتور اور خوفناک صلاحیت ہے۔ عالمی سطح پر صحیح معنوں میں ذہن سازی کی جاتی ہے۔ ان کی خبر رساں ایجنسیاں مثلاً اے ایف پی، Reuters اور اے پی وغیرہ روزانہ کئی ارب انسانوں پہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس بات سے آپ ان کی طاقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ دن کو رات اور سیاہ کو سفید بنا کر دکھاتے ہیں اور دنیا ان پر یقین کرتی ہے۔

اس سارے جمہوری نظام میں ایک آوارگی ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ''بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے''۔ کسی بھی معاشرے میں اکثریت ہمیشہ جاہلوں کی ہوتی ہے، چاہے وہ امریکہ کا معاشرہ ہی کیوں نہ ہو۔ سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں PHD's کی تعداد دیکھ لیں، وہ تھوڑی ہی ہوگی۔ ان پڑھ، پرائمری اور سیکنڈری سطح پر لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے

جیسے آپ معاشرے میں علمی معیار کو بڑھاتے جائیں تو پڑھے لکھے اوراعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ کم ہوتے جاتے ہیں اور ہجوم آبادی ہمیشہ لاکھوں، کروڑوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان جیسے معاشرے کی ہی مثال لے لیجیے یہاں پر اکثریت ان پڑھ اورذات برادری میں منقسم ہے۔اسی لیے یہاں پرلسانیت اورقومیت کی بنیادوں پر چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی ہیں جن کا اثر ورسوخ بہت ہی محدود علاقوں پر ہوتا ہے۔ اس بات کی کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ انکے نظریات اور مالی وسائل کہاں سے آرہے ہیں۔بیسیوں سیاسی جماعتیں پاکستان میں ایسی ہیں کہ جو بھارت، اسرائیل، امریکہ یا روس وغیرہ سے پیسے لے رہی ہیں اوران کا مقصد پاکستان کوتوڑنا ہے۔کوئی پختونستان بنانے کی بات کرر ہاہے،کوئی بلوچستان آزاد کرار ہاہے،اورکوئی سندھودیش یا جناح پور بنار ہاہے۔ایک ایسے ماحول میں کہ جب سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کا سرے سے کوئی احتساب ہی نہیں ، پاکستان میں یہ جمہوریت ہمارے بجائے ہمارے دشمنوں کیلئے زیادہ فائدہ مند ہے۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتیں بھی دراصل خاندانی موروثی جائیدادیں ہیں اوران میں سے کسی بھی سیاسی جماعت میں اندرونی انتخابات نہیں ہوتے۔ پہلے ہم بادشاہتوں کے حوالے سے یہ سنا کرتے تھے کہ اموی خاندان، عباسی خاندان یا عثمانی خاندان کی حکومت ہے۔ان نام نہاد سیاسی جماعتوں میں بھی موروثیت پائی جاتی ہے۔ پیپلز پارٹی سے اگر بھٹو خاندان کو نکال دیا جائے تو پیپلز پارٹی ختم ہوجائے گی۔مسلم لیگ (ن) میں سے شریف خاندان کو نکال دیں تو مسلم لیگ (ن) ختم ہوجائے گی۔ایم کیو ایم میں سے اگر الطاف حسین کو نکال دیں تو یہ دہشت گردگروہ خود ہی ختم ہوجائے گا۔حقیقی معنوں میں یہ سیاسی جماعتیں نہیں بلکہ شخصی اور خاندانی بادشاہتیں ہیں۔جمہوریت کا تو ڈھکوسلہ اور دھوکہ ہی رہ گیا ہے۔

ان سیاسی جماعتوں میں کوئی کارکن نیچے سے اٹھ کران قائدین کی جگہ نہیں لے سکتا۔اس سارے کھیل میں جب آپ مختلف سیاسی جماعتیں بناتے ہیں، چاہے امریکہ اور برطانیہ میں بھی، تو جس شخص کو آزادسوچ کے ساتھ آنا ہوتا ہے، وہ آ ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہ ان سیاسی جماعتوں میں سے کسی ایک کی سیڑھی کا سہارا نہ لے۔ لہٰذا جو لوگ ان سیاسی جماعتوں کو کنٹرول کرتے ہیں اوران کو پیسے دیتے ہیں، وہ کسی آزادسوچ اورفکر والے شخص کواس سیڑھی سے اوپر آنے ہی نہیں دیتے۔ یہ گمراہ سیاسی جماعتیں نظریاتی طور پر بظاہر اپنے اپنے مختلف ایجنڈے رکھتی ہیں، مگر حقیقتاً ان کو وہی بین الاقوامی صیہونی سرمایہ داراور بینکار کنٹرول کرتے ہیں۔

جارج گیلوے

جارج گیلوے نے برطانیہ میں تیسری جماعت ''Respect Party'' کے نام سے بنائی۔ وہ ایسا آدمی ہے جو شکل سے تو انگریز لگتا ہے مگر اندر سے مسلمان ہے۔ اسکا حلقہ جہاں سے وہ انتخاب لڑتا ہے، وہاں بھی سارے بنگلہ دیشی، ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان رہتے ہیں۔ وہاں سے وہ ایم پی منتخب بھی ہوجاتا ہے۔ صاف ستھرا آدمی ہے۔ کھل کر بات کرتا ہے اور پورے مغربی نظام کو ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ نہ وہ ٹوری پارٹی کا ہے، نہ لیبر پارٹی کا۔ اس نے اپنی الگ جماعت بنائی ہے۔ لیکن اس بیچارے کو نہ بولنے دیتے ہیں، نہ سامنے آنے دیتے ہیں۔ اس بات کے باوجود کہ لندن میں اسکا حلقہ کافی مضبوط ہے، اس کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔

رون پال

اسی طرح امریکہ کے سیاسی نظام میں رون پال ایک تیسری آواز تھی جس نے وقت کے صیہونی بینکاری نظام اور بین الاقوامی سرمایہ داروں کو چیلنج کیا۔ اس نے کہا کہ فیڈرل ریزرو بینک ایک دھوکہ ہے اور اسکا احتساب ہونا چاہیے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کو دوبارہ سونے اور چاندی کے نظام پر لوٹ جانا چاہیے۔ اس نے بینکاری نظام کو بھی چیلنج کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسکو ذرائع ابلاغ سے ہی غائب کردیا گیا حالانکہ وہ اوباما کے مقابلے پر کھڑا تھا۔ مگر اسکے باوجود پاکستان میں اور بیشتر دنیا میں کسی نے اسکا نام ہی نہیں سنا تھا۔ یہ ہے مغربی ذرائع ابلاغ کی طاقت۔

جمہوریت کے حامی یہ کہتے ہیں کہ (No two domocracies go to war) یعنی دو جمہورتیں کبھی آپس میں جنگ نہیں کرتیں۔ اس سے بڑی خرافات دنیا میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ دنیا میں جتنی قیامت اور ظلم وستم جمہوریت نے بپا کیا ہے، اتنا تو چنگیز خان نے بھی نہیں کیا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جو ظلم وستم برطانیہ اور امریکہ نے کیا، اسکی مثال نہیں ملتی۔ کروڑوں انسان ہلاک کیے۔ دنیا پر ایٹم بم ایک

جمہوریت نے ہی گرائے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے لیکر اب تک تقریباً بیس کروڑ سے زائد انسان ان جنگوں میں موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں جنہیں (Winless Wars of International Finance) یعنی عالمی سرمایہ داروں کی نہ ختم ہونے والی جنگیں کہتے ہیں۔ یہ لوگ کہیں قحط برپا کروا کے، کہیں جنگوں کے ذریعے، کہیں بیماریاں پھیلا کر، کہیں خوراک کی رسد کنٹرول کر کے، کہیں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں کے ذریعے انسانوں کو مروا رہے ہیں۔ جو کہ مغربی جمہوری تہذیب کا اکیسویں صدی میں بھی منصوبہ ہے۔ امریکہ جمہوریت ہے، تو جن کروڑوں لوگوں کو امریکہ نے قتل کیا ہے، گویا انکو جمہوریت نے ہی قتل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت سے انہیں پوری دنیا میں قتل و غارتگری کرنے کا اجازت نامہ مل جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سفید چادر اوڑھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو دودھ کے دھلے ہوئے ہیں مگر حقیقتاً انہوں نے دنیا میں جمہوریت کے نام پر قتل و غارت و فساد مچایا ہوا ہے۔

ایک اور بات پر غور کیجیئے گا کہ جمہوریت اور آمریت جو کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں، بنیادی طور پر دونوں معاشی نظام ہیں اور دونوں کے پیچھے وہی صیہونی بینکار ہیں۔ دونوں کا منبع ایک ہے۔ دونوں ہی بینکوں کے ادارے اور کاغذ کے نوٹ استعمال کرتے ہیں۔

روس کے اسٹالن اور دیگر آمروں نے دنیا میں جتنا ظلم و ستم مچایا، تباہی و بربادی پھیلائی، چاہے وہ مشرقی یورپ میں ہو، وسط ایشیاء میں ہو یا افغانستان میں، اتنا ہی ظلم سرمایہ دارانہ جمہوریت نے بھی دنیا میں برپا کیا۔ عراق اور افغانستان کے خلاف مغربی جارحیت اسکی تازہ ترین مثالیں ہیں۔ پورا افریقہ ایڈز کی بیماری سے تباہ ہو رہا ہے۔ ان مغربی سرمایہ داروں نے یہ ایڈز وائرس تجربہ گاہوں میں پیدا کر باہر پھیلائے کیونکہ انہوں نے افریقہ کی آبادی کو کم کرنا تھا اور کروڑوں، اربوں روپوں کی ادویات بھی بیچنی تھیں۔ چونکہ

یہ دوائیاں صرف یورپ تیار کرتا ہے اور ان کے ادویاء ساز اداروں کو بڑے بڑے سرمایہ دار مافیا کنٹرول کرتے ہیں، لہذا اب یہ لوگ افریقہ میں اپنی دوائیں مہنگے داموں فروخت کررہے ہیں کہ جہاں لوگ کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں کی طرح ایڈز سے مر رہے ہیں۔ اور یہ سارا ظلم یعنی خوراک اور دوائیوں کی رسد قابو کرنا، دنیا میں جنگیں برپا کرنا، یہ سب کچھ آجکل کی جدید جمہوریتیں ہی کررہی ہیں۔

اب آپ کو اقبالؒ کے وہ الفاظ سمجھ آئیں گے کہ جس میں اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ جس کو تم آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہو، وہ اصل میں ظلم واستبداد کا دیو ہے جو پاؤں مارتا چلا آرہا ہے۔ عام لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ جمہوریت کے نام پر ان کے ساتھ کیا دھوکا کیا جارہا ہے۔ اسکے علاوہ پاکستان کو توڑنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ یہاں مادر پدر آزاد جمہوریت لائی جائے، جیسی کہ آج ہے۔ ایسی جمہوریت کہ جس میں کوئی احتساب نہ ہو۔

اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ہمارے سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام کی سب سے بڑی منافقت کیا ہے۔ سب چیختے ہیں کہ ملک میں آئین نافذ کرو۔ اسی آئین میں دوشقیں ہیں، 62 اور 63۔ یہ دوشقیں بیان کرتی ہیں کہ پاکستان کی پارلیمان میں کون کون سے لوگ جاسکتے ہیں۔ آپ کوئی ڈرائیور بھی رکھتے ہیں تو اس کا ایک معیار ہوتا ہے کہ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہو اور اتنا تجربہ ہو۔ آپ کسی کمپنی کا ڈائریکٹر بھی لگاتے ہیں تو پچاس، ساٹھ لوگوں کا انٹرویو کر کے لگاتے ہیں۔ ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ تو ملک چلانے کا معاملہ ہے جو کہ بہت سنجیدہ ہے۔ ممبران اسمبلی وزراء بنیں گے، کابینہ تشکیل پائے گی، وزیراعظم اور صدر بنے گا۔ ہمارے بڑے جنہوں نے آئین بنایا، انہوں نے اس میں ایک حکمت رکھی۔ آرٹیکل 62 اور 63 جو اسلام کے نظریات پر مبنی ہیں، اس کے مطابق پاکستان کی جمہوریت میں پارلیمنٹ میں وہی شخص جاسکتا ہے کہ جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو۔ وہ شرائط یہ ہیں کہ وہ شخص پانچ وقت کا نمازی ہو، کلمہ طیبہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پورے کرتا ہو، حرام نہ کھاتا ہو، بینکوں سے قرضے لے کر معاف نہ کرواتا ہو، پاکستان اور اسلام کے نظریے پر یقین رکھتا ہو، وہ زندگی میں ناپاک، پلید اور حرام کاموں میں ملوث نہ رہا ہو، صاف ستھرا مسلمان اور متقی ہو۔ آرٹیکل 62 اور 63 میں ملک کے حکمرانوں کیلئے یہ معیار دیا ہوا ہے۔ مگر ملک کی

عدلیہ، الیکشن کمیشن اور تمام سیاسی جماعتیں آرٹیکل 62 اور 63 کو ایسے نظرانداز کر دیتی ہیں کہ جیسے وہ وجود ہی نہ رکھتے ہوں۔

99 فیصد ایم این اے اور ایم پی اے ہماری اسمبلیوں میں ایسے بیٹھے ہیں کہ جن پر اگر آپ ان شقوں کا اطلاق کر دیں تو وہ سارے پارلیمنٹ سے باہر ہو جائیں گے۔ ان کی سرکاری محفلوں کے علاوہ ذاتی گھروں کی تقریبات میں بھی شراب چل رہی ہوتی ہے۔ زنا، برائی، بدکاری عام ہے۔ سب حرام کھاتے ہیں۔ چند ایک ہی ہونگے جو بچے ہوئے ہوں۔ بینکوں سے قرضے بھی تقریباً سبھی نے معاف کروائے ہوتے ہیں۔ زندگیاں ان کی ناپاک ہوتی ہیں۔ حلال حرام کی کوئی تمیز نہیں انہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ اکثر قومیت پرست بھی ہوتے ہیں۔ کوئی بلوچستان الگ کر رہا ہے اور کوئی سندھو دیش بنا رہا ہے۔ پاکستان کے نظریہ پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ حال یہ ہے کہ چند سال پہلے بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نے 15 اگست کو، جو کہ بھارت کا یوم آزادی ہے، اس موقع پر بلوچستان میں چھٹی کا اعلان کر دیا۔ اگلے سال جب 14 اگست کے دن جھنڈا چڑھانے کی باری آئی تو انہوں نے اپنے اوپر دل کا دورہ طاری کر لیا اور جھنڈا چڑھانے کے بجائے محفل سے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ جب محفل ختم ہو گئی تو دوبارہ واپس آ گئے۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ ہوا کیا ہے؟ انہوں نے یہ ڈرامہ اس لیے کیا کہ انکو 14 اگست کے دن پاکستان کا جھنڈا نہ چڑھانا پڑے۔

ایسے لوگ اسمبلیوں میں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ اس لیے کہ آرٹیکل 62 اور 63 کو نافذ ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ آئین کی ان شقوں کا اطلاق نہیں کرتے تو پاکستان کی ساری جمہوریت ہی فراڈ ہے۔ اس وقت سب سیاسی و مذہبی جماعتیں اور ذرائع ابلاغ اس موضوع پر چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ اسکے بعد ملک میں اس قدر خیانت پھیلتی ہے کہ الامان الحفیظ! ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ خیانت اور اقربا پروری کی کوئی حد ہی نہیں۔ اندھیر نگری ہے۔ کمپیوٹر کا ایک سادہ سا اصول ہے۔ (Garbage In ,Garbage Out)۔ یعنی اگر کچرا اندر بھیجیں گے تو غلاظت ہی باہر آئے گی۔ اسی طرح جب آپ نیک لوگ پارلیمنٹ میں بھیجیں گے تو تب ہی خیر کی کوئی امید کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نظام تو انسانوں نے ہی چلانا ہے۔ آپ انسان ہی چور بھیج رہے ہیں کہ جو اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں
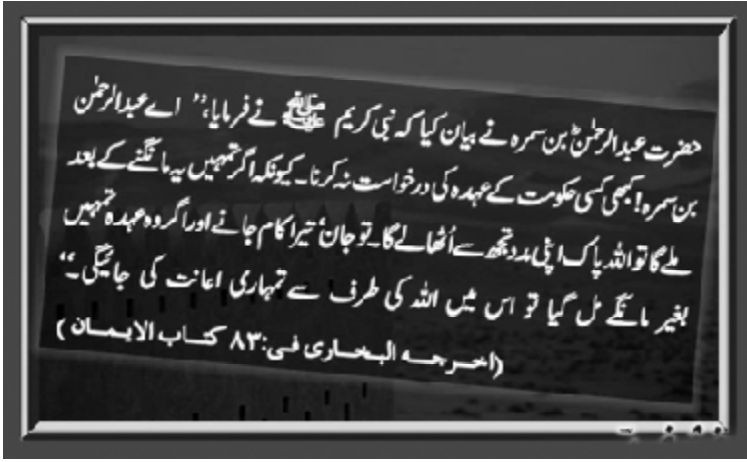
تو نتیجہ وہی نکلے گا جو آج ہم پاکستان کی جمہوریت میں دیکھ رہے ہیں یعنی مکمل طور پر دین، ایمان، ملک، ملت اور نظریہء پاکستان کی تباہی۔

پھر جمہوریت کی ایک اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے آپ کو حکمرانی کیلئے پیش کرتا ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی قسم! ہم کسی ایسے شخص کو مسلمانوں کا عہدہ نہیں دیں گے جو خود اس عہدے کی طلب کرے گا۔ لہذا یہ سارا نظام ہی قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ یہاں لوگ ٹکٹ کے لیے لڑتے ہیں، انتخابات پر پیسہ لگاتے ہیں یعنی وزیر بننے کیلئے سرمایہ کاری کی جاتی ہے کہ ایم این اے اور وزیر بن کر اس سے کئی گنا زیادہ پیسہ کمالیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں سب کچھ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ حالانکہ پاکستان کے آئین میں لکھا ہے کہ یہاں کوئی بھی کام قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ فقط کاغذی قانون ہی ہے اور اس پہ کوئی عمل نہیں کرتا۔ اگر آپ اپنے آئین کے الفاظ کو نافذ کردیں تو یہ نظام بھی اچھا خاصا بہتر ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ لوگ ایسا نہیں کریں گے۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں تمام وڈیرے، جاگیردار اور سرمایہ دار وغیرہ انتخابات کے عمل سے باہر ہوجائیں گے۔ ہمیں ایسی جمہوریت نہیں چاہیے مگر قانون نافذ کرنے کیلئے بھی ڈنڈے کی ضرورت ہے۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے ماننے

والے نہیں۔ بابا بلھے شاہؒ نے فرمایا تھا۔

چار کتاباں اتوں لتھیاں
اتوں لتھا ڈنڈا
چار کتاباں کج نہ کیتا
سب کج کیتا ڈنڈا

یعنی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اخلاقیات، قانون اور کتابیں کچھ نہیں کر پاتیں اور عدل اور انصاف نافذ کرنے کیلئے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں کہ جہاں کرپشن بہت زیادہ ہو، جہاں لوگ منافق ہوں، جان بوجھ کر اچھے قوانین کو نظر انداز کرتے ہوں اور فقط اپنی ذاتی بقاء کیلئے ملکی وقومی مفادات کو داؤ پر لگاتے ہوں، وہاں پر کوئی بھی نظام نہیں چل سکتا اور جمہوریت تو خاص طور پر ملک وقوم کو تباہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایسے ماحول میں خصوصاً ترقی پذیر اور چھوٹے ممالک میں طوائف الملوکی اور افراتفری پھیلانے کیلئے دشمن کو جمہوریت کا نظام بہت مدد دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ذرائع ابلاغ کنٹرول کرتے ہیں، پیسے وہ لگاتے ہیں، سیاسی جماعتیں وہ بناتے ہیں اور آئین کے اچھے آرٹیکلز کو نظر انداز کر کے برے اور کرپٹ لوگوں کو آگے لے کر آتے ہیں۔ ایسے نظام میں اگر آپ جمہوریت کو نافذ کریں گے تو وہ ملک کیلئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔

مثال کے طور پر اس حقیقت پر غور کیجیئے کہ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات کروائے گئے۔ مگر ان انتخابات کو بھارتیوں نے ہائی جیک کر لیا۔ مکتی باہنی کے دہشت گرد پورے مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔ بھارت نے وہاں کروڑوں روپے لگائے اور کسی کی یہ جرأت نہیں تھی کہ عوامی لیگ کے خلاف ووٹ دے سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ مکتی باہنی کی مدد سے عوامی لیگ نے وہاں سو فیصد سیٹیں جیت لیں۔ مغربی پاکستان کی حکومت اپنے آپ کو پاک صاف ثابت کرنے کے لیے یہ کہتی رہی کہ ۷۰ء کے انتخابات انتہائی صاف و شفاف تھے۔ حالانکہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے کرپٹ انتخابات ۷۰ء والے ہی تھے۔ بھارت نے

بڑے پیمانے پر دھاندلی کرکے پورے مشرقی پاکستان سے مکتی باہنی کے ذریعے شیخ مجیب الرحمان کو جتوادیا جسکے نتیجے میں خونریز خانہ جنگی ہوئی اور بالآخر مشرقی پاکستان الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔

دوسری طرف دنیا میں آمریت پر مبنی نظام بھی بنے ہوئے ہیں۔ چین اور روس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو کہ اشتراکی معیشتیں ہیں۔ کچھ جگہ ایسی آمریتیں بھی ہیں جو سرمایہ دارانہ ہیں مثلاً سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات وغیرہ۔ یہاں اشتراکیت نہیں ہے مگر بادشاہتیں ہیں۔ اس کے حوالے سے ہم آگے بات کریں گے۔ لیکن جہاں پر اشتراکی نظریات کے ساتھ آمریتیں بنائی گئی ہیں وہاں پر بھی پورا نظام ایک سیاسی جماعت ہی چلاتی ہے، فرد واحد نہیں۔ وہاں اشتراکی جماعتیں اس نظام کو چلاتی ہیں لیکن ان کے پیچھے بھی وہی صیہونی بینکاری نظام ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے پیچھے ہے کیونکہ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ تو اشتراکی بھی منسلک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں نجی جائیداد کی اجازت ہے اور اشتراکی نظام کے تحت سب کچھ ریاست کنٹرول کرتی ہے۔ مگر بنیادی طور پر دونوں کی اصلیت ایک ہی ہے۔ اشتراکیت کے ظلم وستم بھی چنگیز خان اور ہلاکو خان سے کم نہیں ہیں۔ افغانستان میں روس نے پندرہ لاکھ افغانوں کو شہید کیا۔ وسطی ایشیاء میں بھی گزشتہ دوسو سال سے تباہی مچاتے چلے آرہے ہیں۔ روسی شہنشاہوں کے زمانے سے لیکر، اسٹالن اور لینن اور ان کے بعد کے روسی حکمرانوں نے بھی دنیا میں کروڑوں افراد کو ہلاک کیا۔ چین میں بھی بہت ظلم وستم ہوا۔ مگر یہ لوگ جو بھی ظلم کرتے ہیں، ذرائع ابلاغ کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ وہاں ایک مضبوط ریاستی گرفت ہوتی ہے۔ ایک مرکزی کنٹرول، گو کہ افراد کی انفرادی آزادی کا بیڑہ غرق ہوجاتا ہے۔

جوزف سٹالن --- ولادی میر لینن

چین میں تو اتنا ظلم ہے کہ اگر کسی گھر میں دوسرا بچہ بھی پیدا ہو جائے تو اس بچے کو مار دیا جاتا ہے۔ استغفراللہ العظیم۔ درحقیقت یہ لوگ انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ ان اشتراکی معاشروں میں عملی طور پر کوئی اخلاقیات ہی نہیں ہے۔ سب کچھ ریاست کا ہوتا ہے۔ اب وہ لوگ آہستہ آہستہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرف تو جا رہے ہیں مگر ان میں روحانیت کی اساس نہ ہونے کی وجہ سے ان کی درندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، چاہے وہ روس کا معاشرہ ہو یا چین کا۔

یہ دونوں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام دنیا نے بہت اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ باقی دنیا کے ساتھ کیا، ہم نے وہ بھی دیکھ لیا ہے۔ اسکے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ اس دنیا کے لیے جمہوریت بہت اچھا نظام ہے تو اس سے بڑا جاہل اور کوئی نہیں ہوگا۔ اشتراکیت تو پہلے ہی تباہ ہو چکی ہے اور اب سرمایہ دارانہ نظام بھی تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی نظام کی دو شکلیں اور ایک ہی نظام کے دو نام ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی کے بارے میں اقبالؒ یہ فرما گئے ہیں کہ:

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

دنیا کے کچھ حصوں مثلاً سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں جو بادشاہتیں قائم ہیں، ان میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ جو بادشاہ کہہ دیتا ہے وہی قانون بن جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہی رکھا ہوا ہے، اشتراکیت نہیں ہے۔ لیکن اگر بادشاہ ظالم ہے تو پھر پورا نظام ظالم ہو جاتا ہے۔ اگر بادشاہ اچھا ہے تو پھر نظام میں کچھ بہتری آ جاتی ہے۔ اس میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کسی قانون کے ماتحت نہیں ہوتا۔ جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہ کرتا ہے۔ یہ نظام ہوتا بھی موروثی ہے۔ جیسے سعودی عرب میں دیکھیے کہ شاہ عبدالعزیز کے بعد ان کے بیٹے حکمران بنتے رہے ہیں۔ ابھی تک بادشاہت پہلی نسل میں ہی چل رہی ہے۔ دوسری نسل کی بھی باری نہیں آسکی۔ اب تک ایک بھائی سے دوسرے بھائی تک بادشاہت منتقل ہوتی رہی ہے۔ لیکن اگر آپ دس ہزار سال کی انسانی تاریخ دیکھیں تو جو نظام سب سے زیادہ چلا ہے وہ بادشاہتوں کا ہی ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو قرآن وسنت میں حضرت

سلیمانؑ کا ذکر ہے جو کم از کم سات آٹھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔اس وقت سے لیکر اب تک پوری دنیا میں بادشاہتیں ہی چلتی رہی ہیں۔مسلمانوں میں بھی بادشاہ اور سلطان رہے ہیں۔لیکن خلافت کا تصور ان سب سے زیادہ مختلف ہے۔اسکے بارے میں ہم آگے بات کریں گے مگر یہ جو تین نظام دنیا میں رائج ہیں، جمہوریت، آمریت اور بادشاہت۔فی الحال انہی کی بات کرتے ہیں۔

جمہوریت پہلے کبھی نہیں تھی۔جمہوریت تو ۱۸ صدی میں فرانسیسی انقلاب کے بعد شروع ہوئی۔اشترا کی جماعتوں والی آمریت پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی اور بادشاہتیں دس ہزار سال سے چلی آ رہی ہیں۔مگر اسلام کا تصورِ خلافت ان سب سے مختلف ہے۔یہاں پہ ہم کچھ اقوال بیان کرنا چاہیں گے۔

نپولین بونا پارٹ کو اس کے دشمن ظالم بادشاہ کہتے ہیں جو کہ اسکے ساتھ بہت زیادتی ہے۔نپولین فرانسیسی انقلاب کے بعد آیا تھا۔فرانسیسی انقلاب نے آزادی، اخوت اور مساوات یعنی جمہوریت کا نعرہ لگایا مگر وہ ناکام ہوگیا۔نپولین بونا پارٹ جیسے غیر مسلم بادشاہ کا یہ قول انسان کے چودہ طبق روشن کر دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

''میں امید کرتا ہوں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے کہ جب میں تمام ممالک سے عقلمند اور پڑھے لکھے لوگوں کو جمع کرونگا اور قرآن کے اصولوں پر مبنی ایک حکومت قائم کرونگا جو واحد سچی حکومت ہوگی جو لوگوں کو حقیقی خوشی دے سکے گی''۔

یہی اسلام کی حکمت بھی ہے۔اسلام ہجوم آبادی میں سے لوگ منتخب نہیں کرتا۔بلکہ بہترین لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ان بہترین افراد کو حکومت دی جاتی ہے۔یہ اصول نہ جمہوریت میں ہے، نہ آمریت میں اور نہ ہی بادشاہت میں۔یہ صرف خلافت میں ہے۔

نپولین بونا پارٹ اسلام سے بڑا قریب تھا بلکہ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ شاید اس نے اسلام قبول بھی کرلیا تھا۔اسی لیے یہ لوگ اسے ذلیل کرتے ہیں۔اس نے ٹیپو سلطانؒ سے بھی قریبی تعلقات قائم کیے تھے اور ان کے ساتھ مل کر عظیم عسکری اتحاد بنایا تھا۔وہ انگریزوں اور اس وقت کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مسلم فرانسیسی اتحاد قائم کرنا چاہتا تھا۔یہ الفاظ کتاب Bonaparte et Islam میں لکھے ہوئے ہیں۔

اسی طرح جارج برنارڈ شا جو کہ یورپ کے چند عظیم مفکروں میں سے ایک ہے، اپنی کتاب Genuine Islam میں کہتا ہے:

''اگر کسی مذہب کو آئندہ سو سالوں میں برطانیہ اور یورپ پر حکومت کرنے کا موقع ملا تو وہ مذہب اسلام ہوگا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر حضور ﷺ کی طرح کے کوئی انسان جدید دنیا کی آمریت اختیار کر لیتے ہیں تو وہ انتہائی امن اور خوشی کے ساتھ اس دنیا کے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں محمد ﷺ کے مذہب اسلام کے بارے میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کل کے یورپ کیلئے بھی قابل قبول ہوگا جیسا کہ یہ آج کے یورپ کیلئے قابل قبول ہونا شروع ہوگیا ہے''۔ یعنی برنارڈ شا حضور ﷺ کی طرح کی ''آمریت'' قبول کر رہا ہے کہ اگر کوئی انسان ان جیسا بادشاہ، ان جیسا حکمران ہے تو پھر دنیا میں خیر ہی خیر ہے۔
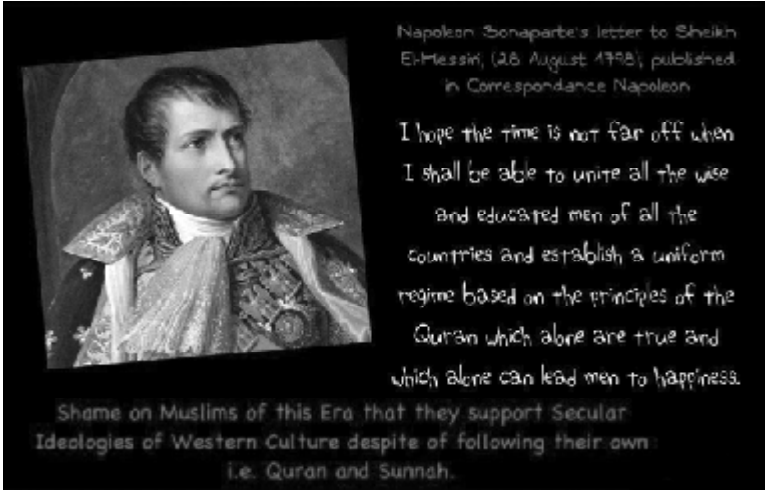
یہاں پر ہم یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ علامہ اقبالؒ نے لادین بادشاہت کو بالکل مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملوکیت اور بادشاہت اسلام کی روح کے عین خلاف ہے۔ اسکے علاوہ اقبالؒ نے جمہوریت کو بھی رد کر دیا ہے کہ یہ جمہوریت تو ظلم و استبداد کا دیو ہے جو پاؤں مارتا چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے آمریت کو بھی رد کیا کہ چنگیزی کو تو ہم کسی طور پر بھی قبول نہیں کر سکتے۔ اقبالؒ نے اسکے مقابلے میں ''روحانی جمہوریت'' یا

پھر ''رحمانی آمریت'' کا تصور دیا ہے۔ یہ دو تصورات دراصل خلافت کی روح ہیں۔ اقبالؒ نے اصطلاحیں جدید استعمال کی ہیں مگر تصور وہی خلافت کا ہے۔ روحانی جمہوریت کا مطلب ہے کہ اگر آپ انتخابات چاہتے ہیں تو ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 میں دیئے گئے معیار پر پورے اترتے ہوں اور معاشرے کے خوبصورت ترین اور متقی ترین لوگ ہوں۔ پھر جمہوریت ٹھیک کام کرے گی۔ اگر وہی کریں گے جیسے آجکل ہو رہا ہے تو پھر فقط تباہی اور بربادی ہی ملے گی۔

اگر آپ آمریت لانا چاہتے ہیں تو ایسا آمر لائیں جیسا برنارڈ شا نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کی سنت پر چلنے والا کوئی شخص ہو۔ اگر ایسا شخص دنیا کا آمر بن جائے تو دنیا میں امن آ جائیگا۔ لہذا نہ آمریت بری ہے، نہ جمہوریت بری ہے۔ جمہوریت اگر روحانی ہو اور آمریت اگر رحمانی ہو اور ان دونوں کو جوڑ دیں تو خلافت بن جاتی ہے۔ اگلے باب میں ہم اس کی خصوصیات بیان کریں گے۔

علامہ اقبالؒ نے ابلیس کے بنائے ہوئے طاغوتی نظاموں یعنی جمہوریت و آمریت اور بادشاہت کے بارے میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے نام سے ۱۹۳۶ء میں ایک شہرہ آفاق نظم لکھی۔ جس کے چند ایک منتخب شدہ اور عبرت آموز اشعار یہاں نقل کیے جا رہے ہیں کہ جو ہماری اس بحث کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ

ابلیس

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب

میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

پہلا مشیر

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام

پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج

صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

دوسرا مشیر

خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر

تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے با خبر!

پہلا مشیر

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے

جو ملوکیت کا اک پردہ ہو، کیا اس سے خطر!

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

کاروبار شہر یاری کی حقیقت اور ہے

یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو

ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

تیسرا مشیر

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب

ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد

توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

ابلیس (اپنے مشیروں سے)

ہے مرے دست تصرف میں جہان رنگ و بو

کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمان توبتو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب وشرق

میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو

کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ

سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد

یہ پریشاں روز گار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے

جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے

مزدکیت فتنہء فردا نہیں، اسلام ہے!

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف

ہو نہ جائے آشکار اشرع پیغمبر کہیں

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر

حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہے ہر نوع غلامی کے لیے

نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف

منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام

چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہاں بے ثبات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

۶

خلفائے راشدین کا اعلیٰ کردار

گزشتہ باب میں ہم نے جمہوریت، بادشاہت اور آمریت پر بحث کی تھی۔ اب ہم نظام خلافت کی بات کریں گے۔ خلافت راشدہ کا دور ہمارے لیے مثالی نمونہ ہے۔ اسکے بعد کے چودہ سو سال میں مختلف قسم کی خلافتوں میں ہمیں خلافت راشدہ کے مختلف پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے مگر ہم بحث کے لیے خلافت راشدہ کو ہی مثال بنائیں گے۔ اس خلافت کے نظام کے پہلوؤں کا موازنہ اگر موجودہ نظاموں سے کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ موجودہ نظام دراصل دور جاہلیت کی پیداوار ہیں۔ خلافت راشدہ سے زیادہ جدید، منفرد اور مفید نظام کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ یہ نظام انسانی زندگی کی تمام تر ضروریات کا بخوبی خیال رکھتا ہے۔ یہ مثالی اور رومانوی نظام ہے جو خلافت راشدہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ نے ہمیں تحفے میں دیا۔ اگر انسان فلاح چاہتے ہیں تو انہیں خلافت راشدہ کا نظام لامحالہ اپنانا پڑے گا۔ گوکہ آج خلیفہ نہیں ہے مگر کم ازکم خلافت راشدہ کا وہ نظام تو قائم کیا جاسکتا ہے کہ جس کے تحت سب کو عدل و انصاف ملے، حکمرانوں کا احتساب ہو، بددیانتی اور خیانت نہ ہو۔ یہ سب کس کو برا لگے گا؟

آج جو اس لادین جمہوری نظام نے مغربی معاشرے کا جو حشر کیا ہے، اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ وہاں کی معاشرتی زندگی اور خاندانی نظام تباہ ہوکر رہ گیا، اخلاقیات ختم ہوگئیں، بدکاری اور برائی اتنی عام

ہے کہ کسی شخص کی عزت و آبرو محفوظ نہیں اور شادی کا تصور بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب اسی مغربی جمہوریت کے پھل ہیں جو مغربی معاشرے نے پائے ہیں۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

مشرق میں بھی جہاں آمریت پائی جاتی ہے یہی حال ہے۔ حالیہ چین اور ماضی کے روس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کوئی بھی سیاسی نظام انفرادی سطح پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ ہر سیاسی نظام کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہذا ان اثرات کو نظر انداز کر کے کسی بھی سیاسی نظام کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مغربی جمہوریت مغرب کے لیے مفید ہے تو اس نے اُس معاشرے کا جو حشر کیا ہے وہ بھی ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ مغرب میں خاندان، گھر بار اور اخلاقی اقدار ختم ہو چکی ہیں اور بزرگوں کو سرکاری دارالامانوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی سیاسی یا معاشی نظام اپنی انفرادی حیثیت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اسکی اچھائی اور برائی کا اندازہ معاشرے پر اسکے اثرات سے لگایا جاتا ہے۔ ہر معاشرے کی بنیاد اسکے سربراہ سے بنتی ہے۔ لہذا اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ معاشرے کا سربراہ کن قوانین کے تحت منتخب کیا جائیگا؟ اس کی خصوصیات کیا ہونگی؟ اس کے بعد معاشرے میں جو قوانین اور نظام رائج ہونگے، ان سے معاشرے کا جو ماحول بنے گا، معاشرے میں جو اخلاقیات کا تصور فروغ پائے گا اور ذمہ داری کا جو احساس پروان چڑھے گا، وہ کیا ہوگا؟ اس حوالے سے خلافت راشدہ کا نظام یقیناً ایک مثالی نمونہ ہے۔
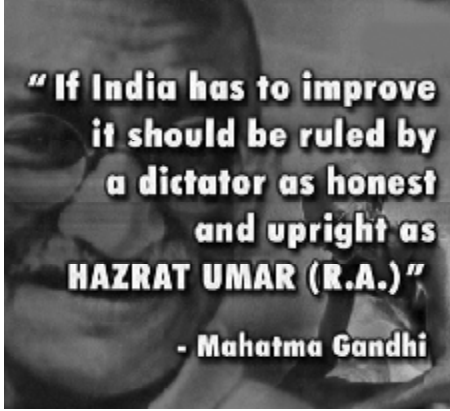
مغرب کے نظام کے برعکس مسلمانوں کا سیاسی قیادت کا نظام لادینیت پر مبنی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا مقدس

نظریہ ہے کہ جس میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نمائندے ہونے کی حیثیت سے مملکت کے سربراہ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔اسی لیے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ الرسول ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔سیاسی قیادت اسلامی نظام میں ایک روحانی اور آفاقی نظریہ ہے۔انسان اس نظام میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نمائندہ ہوتا ہے۔مغربی جمہوری نظام میں جو سربراہ ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا نمائندہ نہیں ہوتا۔کیا ایک آمر جو اقتدار پر قبضہ کر کے من مانی حکومت چلاتا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کا نمائندہ ہوتا ہے؟ نہیں! خاندانی بادشاہتیں بھی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا نمائندہ ہونے کا فریضہ ادا نہیں کرتیں۔

اگر معاشرے میں بدکردار حکمران حکومت کر رہا ہو تو اسکی نحوست پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، چاہے وہ زبان سے کچھ کہے یا نہ کہے۔ یہ ایک انتہائی منفرد پہلو ہے۔ ہمارا دین ظاہری ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی بھی ہے۔ ہمارے دین میں برکت کا بھی تصور ہے۔حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک مرتبہ ایک گڈریے کی بکری بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔گڈریے نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔اسکے بیٹے نے حیرانی سے پوچھا کہ اتنی سی بات پر آپ کیوں رو رہے ہیں۔اس گڈریے نے روتے ہوئے جواب دیا کہ میں بکری کے نقصان پر نہیں رو رہا ہوں۔آج تک اس بھیڑیئے نے بکری پر حملہ نہیں کیا تھا۔آج وہ بکری کو اٹھا کر لے گیا۔اسکا مطلب یہ ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔یعنی ایک عادل حکمران کی روحانی برکت پورے معاشرے میں پھیلتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک بادشاہ کا گزر ایک باغ سے ہوا۔اس نے اس باغ کا پھل منگوا کر کھایا تو بہت بھلا معلوم ہوا۔اسکے دل میں لالچ پیدا ہوئی کہ اس باغ پر قبضہ کر لے۔اس نے مالی سے مزید پھل لانے کو کہا۔مگر جب وہ پھل کھائے تو وہ کھٹے اور بدمزہ تھے۔وہ بہت حیران ہوا کہ کچھ دیر پہلے تو اسی درخت کے پھل میٹھے اور لذیذ تھے اور اب بدمزہ کیسے ہو گئے؟ اس نے مالی سے اسکی وجہ پوچھی۔ مالی نے جواب دیا ''لگتا ہے کہ بادشاہ وقت کی نیت خراب ہو گئی ہے''۔

اس طرح کا مقدس اور روحانی تصور صرف اسلامی نظام میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہ تصور کہ خلیفہ ایک نمائندہ ہے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا کہ جس پر امت کی انتہائی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ایک زبردست آفاقی

تصور ہے۔ حضورﷺ کی ایک حدیث شریف ہے، جس کا مفہوم ہے کہ اللہ کی قسم! ہم اس شخص کو مسلمانوں کی حکمرانی نہیں دیں گے کہ جو خود اس کی طلب کریگا۔ یہ جمہوریت، آمریت اور بادشاہت سے مکمل طور پر متصادم نظریہ ہے۔ ان نظاموں میں تو لوگ حکمرانی کی طلب میں ہی مرے جاتے ہیں۔

مسلمان حکمران کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے ہر عمل اور ہر ذمہ داری کیلئے اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے لہذا وہ اقتدار کو بھاری ذمہ داری سمجھ کر اس سے گریزاں رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ جس راستے سے آپؓ گزرتے تھے، وہاں سے شیطان گزرنا چھوڑ دیتا تھا۔ دشمن تو ایک طرف خود صحابہ کرامؓ میں بھی سیدنا عمرؓ کا جلال مشہور تھا۔ انہی حضرت عمرؓ کا حال یہ تھا کہ اس بات پر زاروقطار روتے تھے کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو اسکا میں ذمہ دار ہونگا۔ یہ دنیا کے احتساب کا خوف نہیں تھا بلکہ آخرت میں جوابدہی کی خشیت تھی۔ امیر المومنین یا خلیفہ، جسے آپ آج کے دور میں صدر یا وزیراعظم کہہ لیں، کا سب سے پہلا تصور یہ ہے کہ اس کے دل میں یہ خوف ہو کہ میں جو بھی کام کر رہا ہوں، جو فیصلہ کر رہا ہوں، اسکا جواب روز قیامت اللہ تعالیٰ کو دینا ہے۔ لہذا وہ ہمیشہ درست فیصلہ کرنے کی کوشش کریگا جو کہ عوام اور امت مسلمہ کے مفاد میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قیادت کے احساس ذمہ داری کے حوالے سے دنیا کے کسی بھی نظام میں وہ شاندار مثالیں نہیں ملتیں جو کہ خلافت راشدہ کے نظام میں ملتی ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، جنہیں پانچواں خلیفہء راشد کہا جاتا ہے، ان کے خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ رات کے وقت آپؒ کے پاس ایک غلام کسی کام سے آیا۔ آپؒ نے چراغ بجھا دیا اور دریافت فرمایا کہ ذاتی کام سے آئے ہو یا سرکاری کام سے؟ اگر ذاتی کام سے آئے ہو تو یہ چراغ مجھے صرف سرکاری کام کے لیے دیا گیا ہے۔ خلیفہ وقت کی خود احتسابی کی اب دوسری مثال ملاحظہ کیجیئے۔ گھر کا خرچ چلانے کیلئے آپؒ کا وظیفہ مقرر تھا۔ ایک بار گھر میں میٹھا بنا۔ آپؒ نے بیوی سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ آپؒ کی بیوی نے جواب دیا کہ روز کے خرچ سے کچھ نہ کچھ بچا لیا کرتی تھی تو آج یہ میٹھا بنا لیا۔ آپؒ نے فرمایا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ وظیفہ ہماری ضرورت سے زائد ہے کہ جس کی وجہ سے گھر میں میٹھا بن گیا ہے۔ اس کے بعد آپؒ نے وظیفے میں سے اتنے پیسے کم کر دیئے جو ان کی بیوی روز بچاتی تھیں۔ یہ کون پراسرار لوگ تھے جو امت اور

امانت کے معاملے میں اپنی ذات پر اتنی سختی کرتے تھے؟ کیا کوئی جمہوری نظام اس طرح کی قیادت پیدا کرسکتا ہے؟ کوئی ظالم آمر اس طرح کا کردار اپنا سکتا ہے؟ کوئی مطلق العنان بادشاہ ایسا عمل کرسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

اسلامی سیاسی نظام کی شروعات ہی اسکے سربراہ سے ہوتی ہے۔ ایسے سربراہ سے جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے سامنے جوابدہ ہو۔ عدالت بعد کا معاملہ ہے۔ پہلے انسان کے دل میں اللہ اور آخرت کا خوف ہو۔ اسلامی نظام میں سربراہی کیلئے یہ خصوصیت درکار ہے۔ یہ لوگ حکومت طلب نہیں کرتے تھے اور جب انہیں حکومت دی جاتی تھی تو خوف خدا سے انکی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اشارہ کر دیا تھا کہ اسلام میں خلافت کا عمل، طریقہء کار، مراحل وہی ہونگے جو قرآن کی ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ''حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں'' (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) ''وہ کفار پر شدید ہیں'' (یعنی سیدنا عمرؓ) ''آپس میں بہت رحیم ہیں'' (یعنی سیدنا عثمانؓ) ''آپ ان کو دیکھتے ہیں رکوع وسجود کرتے ہوئے'' (یعنی سیدنا علیؓ)۔ تو یہ ان چاروں خلفائے راشدین کا مرتبہ ہے۔

جب ہم خلافت کی خصوصیات کی بات کرتے ہیں تو اس میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ خلافت موروثی نہیں ہے۔ اگر اسلام میں موروثیت نہیں ہے تو پھر اس بات پر غور کیا جانا چاہیے کہ خلیفہ کے انتخاب کا طریقہء کار کیا ہے؟ خلافت راشدہ میں سربراہ اور خلیفہ چننے کا آفاقی معیار اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے بھی اپنی ایک حدیث کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کنوئیں سے پانی کا ایک ڈول نکال رہا ہوں۔ میرے بعد ابوبکر صدیقؓ نکالیں گے۔ اسکے بعد عمرؓ پانی نکالیں گے اور بہت طاقت اور زور سے نکالیں گے۔ یعنی حضور ﷺ نے خلافت کی ترتیب بیان فرما دی تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ بننے کے واضح اشارے دے دیئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا اور یوں حضور ﷺ نے جو عزت اور مقام آپؓ کو دیا تھا،

وہ اس بات کی دلیل تھی کہ اگر حضور ﷺ کے بعد کوئی مسلمانوں کا امیر ہوسکتا ہے تو وہ صرف سیدنا ابوبکر صدیقؓ ہی ہیں۔ جب حضور ﷺ کی طبیعت ناساز ہوئی تو آپ ﷺ کی ظاہری حیات مبارکہ میں مسجد نبوی میں اگر کسی صحابی نے جماعت کروائی ہے تو وہ بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی ہیں۔ حضور ﷺ نے انہیں باقاعدہ اس کام کیلئے اپنی جگہ متعین فرمایا بلکہ کچھ نمازیں ان کی امامت میں خود بھی پڑھیں۔ ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز کی امامت فرمارہے تھے کہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لے آئے۔ آپؓ نے پیچھے ہٹنا چاہا تو حضور ﷺ نے منع فرمادیا اور خود ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ یہ باقی صحابہؓ کے لیے بہت واضح اشارہ تھا کہ حضور ﷺ کے بعد آپؓ ہی مسلمانوں کے امیر ہوں گے۔

اسی طرح مسجد نبوی کے آس پاس بہت سے صحابہ کرامؓ کے گھر تھے اور ان گھروں کے دروازے مسجد نبوی میں کھلا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت کو ظاہر کرنے کیلئے آپ ﷺ نے تمام صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والے دروازوں کو بند کر دیا جائے اور گھروں کے دروازے دوسری طرف سے کھولے جائیں۔ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اجازت دی گئی کہ مسجد نبوی میں کھلنے والا دروازہ استعمال کریں۔ یوں آپؓ کے درجات دنیا کو دکھا دیئے گئے۔

آج بھی مسجد نبوی میں جا کر دیکھیں تو ایک طرف حضور ﷺ کا روضہء مبارک ہے اور اس سے پرے مغرب کی جانب ایک دروازہ ہے جو باب ابوبکر صدیقؓ کہلاتا ہے۔ وہاں پہ آج تک ایک کمرہ موجود ہے۔ یہ وہ کمرہ ہے جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھر ہوا کرتا تھا۔ سعودی حکومت نے چونکہ نئی تعمیر کی ہے لہذا اسکی پرانی ہیئت تبدیل ہوگئی ہے۔ لیکن وہ کمرہ بہرحال موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی مسجد نبوی کے مشرق میں حضور ﷺ کا روضہء مبارک تھا اور مغرب میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا اور یہ دونوں دروازے اندر کی جانب کھلتے تھے۔ وہ دروازہ جس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ مسجد نبوی میں تشریف لاتے تھے، آج بھی باب ابوبکر صدیقؓ کے نام سے موجود ہے۔

یوں حضور ﷺ نے اپنی ظاہری حیات مبارکہ میں ہی آپؓ کو خلیفہ کی حیثیت سے نامزد کر دیا تھا۔ یعنی آپ ﷺ نے خلافت کو موروثی نہیں بننے دیا بلکہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے عشق و ادب رسول ﷺ اور قربت

رسول ﷺ کی بنیاد پر آپؓ کو خلافت کی ذمہ داری سونپی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی خلافت اپنے بیٹے یا کسی رشتہ دار کے حوالے نہیں کی بلکہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ آپؓ کا طریقہء کار کسی قدر مختلف تھا۔ حضور ﷺ نے تو اشاروں کے ذریعے صحابہ کرامؓ کو بتا دیا تھا کہ میرے بعد ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوں گے جبکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تھا کہ میرے بعد کسے خلیفہ ہونا چاہیے۔ مشورہ کرنے کے بعد آپؓ نے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا اور دریافت فرمایا کہ اگر آپ لوگ بھی اسے بہتر سمجھیں تو میں عمرؓ کو خلیفہ متعین کر دوں؟ کچھ صحابہ کرامؓ نے اعتراض کیا کہ ان کی طبیعت میں بہت سختی ہے۔ آپؓ نے جواب دیا "عمرؓ اس لیے سخت ہیں کیونکہ میں نرم ہوں۔ جب خلافت کی بھاری ذمہ داری ان کے کندھوں پر پڑے گی تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے"۔ یوں کسی کو کوئی اعتراض نہ رہا لہذا حضرت عمرؓ اتفاق رائے سے اگلے خلیفہ منتخب ہو گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد خلافت حضرت عمرؓ کو منتقل ہو گئی۔ سیدنا عمرؓ نے خود اس کی طلب نہیں کی اور نہ ہی اس سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی طلب کی تھی۔ اسلامی نظام میں قیادت کی خواہش نہیں کی جاتی بلکہ سربراہ، امیر یا خلیفہ کو نامزد یا منتخب کیا جاتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ پر خلافت کو آگے منتقل کرنے کا وقت آیا تو آپؓ نے چھ بہترین لوگوں پر مشتمل ایک جماعت بنادی اور عوام سے کہا کہ ان چھ میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں۔ وہ لوگ عشرہ مبشرہ میں سے تھے یعنی وہ دس لوگ جنہیں حضور ﷺ نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی خوشخبری دے دی تھی۔ ان چھ لوگوں میں سے کچھ لوگ تو یہ کہہ کر اس انتخاب سے باہر ہو گئے کہ ہم خلیفہ ہی نہیں بننا چاہتے۔ اس سارے معاملے کے دوران بالآخر بات حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ پر آ گئی کہ جنہیں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ آپؓ نے عوام سے ان کی رائے پوچھی، سب سے مشورہ کیا اور بالآخر حضرت عثمانؓ کا انتخاب کر لیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کو چونکہ شہید کیا گیا تھا لہذا آپؓ کو اپنی زندگی میں اگلا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع نہیں مل پایا مگر آپؓ کی شہادت کے بعد سب صحابہ کرامؓ کو معلوم تھا کہ اب ان میں سب سے بلند مرتبہ شخص حضرت علیؓ ہی ہیں۔ لہذا ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔

اس سارے عمل میں جو حکمت ہے وہ سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی چاروں خلفائے راشدین مختلف طریقوں

سے منتخب ہوئے۔ مگر یہ بات چاروں میں مشترک تھی کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین لوگ تھے اور ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت طلب نہیں کی۔ یہ دونوں باتیں انتہائی اہم ہیں۔ انتخاب کا طریقہء کار اتنا اہم نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور ﷺ نے منتخب کیا۔ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مشورے سے خلیفہ مقرر کیا۔ سیدنا عثمانؓ چھ بہترین آدمیوں میں سے رائے شماری کے ذریعے خلیفہ بنے۔ اور پھر ان کی شہادت کے بعد جو سب سے بہترین تھے یعنی حضرت علیؓ، مسلمانوں نے انہیں خلیفہ چن لیا۔

تو اس ساری بحث کا حاصل کیا ہے؟ غور کیجیئے کہ آمریت، بادشاہت اور جمہوریت میں ایسا نہیں ہوتا کہ پورا معاشرہ اس بات کا خیال رکھے کہ ہم میں سے اعلیٰ ترین شخص کون ہے۔ روحانی طور پر کونسا شخص اللہ کے قریب ہے اور سب سے زیادہ متقی ہے۔ جمہوریت، آمریت اور بادشاہت میں ایسا تصور موجود ہی نہیں ہے۔ لہذا ایک بات تو حتمی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ جب خلافت راشدہ کی بات ہوتی ہے تو اس میں خلیفہ کے انتخاب کا طریقہء کار بہت مختلف ہے۔ وہ اتنا متقی ہوتا ہے کہ خود خلافت طلب کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ جو دنیا کی طلب کرتا ہے حدیث شریف کے الفاظ میں اس کو دنیا اور حکومت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں اس کے واضح اشارے موجود ہیں لہذا سب کی جان جاتی تھی کہ اللہ کو جواب کون دیگا؟

اس کے برعکس موجودہ دور میں لوگ اقتدار پانے کیلیئے مرے جا رہے ہوتے ہیں۔ انتخابات میں جیت کیلیئے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ وزارت اعلیٰ ملنے پر ان کی باچھیں کھلی جا رہی ہوتی ہیں۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آخرت میں ان کا کتنا سخت حساب ہوگا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ آج بڑی بڑی بلٹ پروف گاڑیوں میں گھوم کر، بڑے بڑے بنگلوں میں رہ کر، کروڑوں اربوں کی خیانت کر کے اور اس دنیا کا عیش و آرام سمیٹ کر وہ دنیا سے چلے جائیں گے۔ انہیں آخرت کا خیال اور احتساب کا خوف ہی نہیں

۔ نہ بادشاہوں کو آخرت کا خیال ہے، نہ آمروں اور جمہوری حکمرانوں کو۔ یہ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب حرام خور ہیں۔ سب عہدے کے طالب اور ناپاک لوگ ہیں۔ یہ لوگ صرف اور صرف طاقت، دولت اور اختیار کے حصول کیلئے لاکھوں انسانوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ جب کسی ملک میں اس طرح کی قیادت ہوگی تو پھر ایسے ملک کا ماحول کیا ہوگا؟

جب ہم خلافت راشدہ کی بات کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ آپ پتھر کے زمانے میں جانا چاہتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے والا نظام اب نہیں چلے گا۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج میکاولی کی سیاست چلے گی، چوری، بدکاری اور بیہودگی چلے گی، لادینیت چلے گی، فتنہ وفساد چلے گا، قتل و غارت چلے گی، بادشاہتیں چلیں گی، آمریت اور جمہوریت چلے گی لیکن خلافت کا روحانی نظام نہیں چلے گا کیونکہ وہ پاک صاف ہے اور اس کے تحت انسانیت کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جاتی ہے۔

قیادت اور اس کے انتخاب کے طریقہء کار پر بحث کے بعد اب ہم بات کرتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے نظام کے تحت قانون کونسا رائج ہوگا اور اختیار کس کے پاس ہوگا؟ جمہوری نظام میں پارلیمان کو اعلیٰ ترین مقننّہ کہا جاتا ہے یعنی اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ۔ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ عوام الناس کی مرضی چلے گی۔ آمریت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ظالم شخص یا ایک جماعت کی مرضی چلے گی اور بادشاہت کے نظام میں بادشاہ مختارکل ہوتا ہے۔ ان نظاموں میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا قانون نہیں چلتا۔ مگر خلافت راشدہ کے نظام میں خلیفہ خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، قانون اللہ تعالیٰ ہی کا چلتا ہے۔ خلفائے راشدین سے زیادہ طاقتور اور روحانی وجود پیدا ہی نہیں ہوئے۔ خطبہء حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے اس بات پر مہر لگادی کہ اب قانون اللہ تعالیٰ ہی کا چلے گا۔ اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ جس کا مفہوم ہے: ''آج کے دن تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا گیا ہے اور میری نعمتیں تم پر تمام کر دی گئی ہیں اور اسلام کو دین کی حیثیت سے تمہارے لیے پسند کر لیا گیا ہے۔''

اس کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک مسلمان ریاست میں قیامت تک قانون صرف اللہ ہی کا ہے اور فیصلے صرف اسی کے تحت ہونگے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی

تقریر میں یہ کہا تھا کہ جب تک میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم پر چلوں، تم میرا حکم ماننا۔ اگر میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے راستے سے ہٹوں تو میری رہنمائی کرنا۔ دنیا میں جو طاقتور ہے، وہ میری نظر میں کمزور ہے اور جو دنیا میں کمزور ہے، وہ میری نظر میں طاقتور ہے۔ یعنی آپؓ نے سب سے پہلے خود کو احتساب کیلئے پیش کر دیا تھا۔ تمام خلفائے راشدین نے یہی سنت اختیار کی۔

حضرت عمرؓ کے عدل اور جلال سے لوگ تھر تھر کانپتے تھے۔ انہی عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ تم میں سے سب سے زیادہ عزیز مجھے وہ ہوگا جو مجھے میرے عیب بتائے گا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے بلاوجہ ہی آپؓ پر تنقید کرنا شروع کر دی مگر آپؓ سر جھکا کر سنتے رہتے تھے۔ اس نظام میں احتساب کا عمل بہت طاقتور تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے راستے سے ہٹ جاؤں تو تم لوگ کیا کرو گے؟ ایک نوجوان کھڑا ہوا اور تلوار نکال کر بولا ''پھر ہم آپؓ کو تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔'' اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ امت میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ جو میرے بھٹکنے پر مجھے تلوار سے سیدھا کر دیں۔ ایسے اعلیٰ کردار کے حامل خلفاء نے بھی خود کو احتساب کے عمل کیلئے پیش کر رکھا تھا۔ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوریت بھی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟ کیا کوئی آمریت یا بادشاہت ایسا احتساب کر سکتی ہے؟

خلافت تو ایسا نظام ہے کہ جمعہ کے خطبے کے دوران ایک بوڑھی عورت نے بھی کھڑے ہو کر حضرت عمرؓ سے یہ سوال کر لیا تھا کہ ہمارے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے، آپؓ کے جسم پر دو چادریں کیوں ہیں؟ جب تک آپؓ سوال کا جواب نہیں دینگے تب تک آپؓ کی بات نہیں سنی جائے گی۔ اس دور میں ''نیب'' کی طرح کا ادارہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ حکمران یہ نہیں کہتا تھا کہ پہلے ثابت کرو کہ میں نے کرپشن کی ہے۔ خلافت کا نظام تو اس قدر اعلیٰ تھا کہ اس میں خود احتسابی کا عمل ہوتا تھا۔ اس نظام کے تحت یہ ضروری تھا کہ خلیفہ خود ثابت کرے کہ اس کے پاس موجود دولت کہاں سے آئی؟ یہ ثابت کرنے کیلئے کسی کو عدالت میں نہیں جانا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اس بڑھیا کے سوال کا جواب اپنے بیٹے کے ذریعے دیا۔ آپؓ کے بیٹے نے کہا کہ چونکہ ابا جان لمبے قد کے ہیں لہذا میں نے اپنی چادر بھی انہیں دے دی تھی۔ اس جواب پر مطمئن

ہونے کے بعد ہی لوگوں نے سیدنا عمرؓ کی بات سنی۔ آج اس کا تصور بھی محال ہے کہ خلیفہء وقت، اسے بادشاہ کہیں یا امیر، خود کہہ رہا ہے کہ میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کے تابع ہوں اور اگر میں اس حکم پر نہ چلوں تو مجھے تلوار سے سیدھا کر دیا جائے۔

خود احتسابی کی ایک اور مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہے کہ جو خلیفہ بننے سے پہلے تجارت کیا کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد جب آپؓ بازار جانے لگے تو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ نے روکا کہ اگر آپؓ اب بھی تجارت کریں گے تو خلافت کے معاملات کو کون دیکھے گا؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا کہ تجارت نہیں کروں گا تو بچوں کو کیسے پالوں گا؟ یعنی خلافت کو پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھنے کا تو تصور ہی موجود نہیں تھا۔ بیت المال مسلمانوں کی امانت تھا اور خلیفہء وقت خود اپنی روزی کمانا چاہتے تھے۔ مگر اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہء وقت کو گزر بسر کے لیے تین درہم وظیفہ روزانہ دیا جائیگا۔ آج کے حساب سے تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ بنتا ہے۔ یعنی تقریباً ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ۔ آج ایک مزدور بھی اس سے زیادہ کما لیتا ہے۔ اسکے باوجود جب ابوبکر صدیقؓ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپؓ سخت دکھی تھے کہ عوام کی خدمت کا کام دے کر اللہ نے مجھ پر احسان کیا تھا تو میں نے اس کام کے عوض تین درہم روزانہ کا وظیفہ کیوں قبول کیا؟ آپؓ نے اپنے بچوں کو نصیحت کی کہ یہ مجھ پر قرض ہے۔ میری موت کے بعد یہ پیسے بیت المال میں جمع کروا دینا تاکہ روز قیامت میں اس معاملے میں بھی بری الذمہ ہو جاؤں کہ میں نے امت رسول ﷺ کی خدمت کرنے کے پیسے لیے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات بعد جب ان کے بیٹے اس مقصد کیلئے حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو حضرت عمرؓ بھی رونے لگے اور فرمایا کہ میں خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ابوبکرؓ کا یہ قرض معاف کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اتنا اعلیٰ معیار چھوڑ کر گئے ہیں کہ اس پر پورا اترنا میرے لیے ایک سخت امتحان ہوگا۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ نے بھی خلیفہ کی حیثیت سے بہت کم وظیفہ لیا۔ حالت یہ تھی کہ آپؓ کے کپڑوں میں ایک مرتبہ سترہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان اس بات پر بحث ہوتی تھی کہ حضرت عمرؓ سے اپنا خیال رکھنے کی درخواست کی جائے مگر سب ان سے ڈرتے تھے۔ اس

پر صحابہ کرامؓ نے امہات المومنینؓ کے ذریعے سفارش کروائی کہ خدارا اپنا کچھ تو خیال کیا کیجیے کہ دنیا بھر سے لوگ اور سفیر آپ سے ملنے کیلئے آتے ہیں۔

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ایک مرتبہ مسجد نبوی میں لنگر جاری تھا۔ایک شخص نے دوبارہ کھانا لینے کی درخواست کی اور کہا کہ کونے میں ایک شخص بیٹھا سوکھی روٹی پانی میں ڈبو کر کھا رہا ہے، میں یہ کھانا اسے دوں گا۔لنگر تقسیم کرنے والے نے کہا کہ یہ وہی شخص ہے کہ جن کا لنگر تم کھا رہے ہو۔وہ حضرت علیؓ تھے جو خود پانی میں سوکھی روٹی ڈبو کر کھا رہے تھے۔ایسا معیار کائنات کا کوئی اور سیاسی نظام قائم نہیں کرسکتا۔یہ سب کچھ آج انسانی سوچ سے ہی باہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایسا ہی سیاسی و معاشی نظام ہونا چاہیے۔اسی طرح کا بادشاہ ہو، اسی طرح کا خلیفہ ہو، اسی طرح کا احتساب ہو، اعلیٰ ترین قانون اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا ہو اور حکمران ایک مزدور جیسی سادہ زندگی گزارتا ہو۔جس لمحے آپ ایسا نظام نافذ کردیں گے، اسی لمحے پورے معاشرے میں خلافت راشدہ کی خیر و برکت نظر آنا شروع ہوجائے گی، یہاں تک کہ اس علاقے کے درندے بھی ظلم سے باز آجائیں گے۔کیونکہ خلیفہء وقت کا عدل بھی اس طرح کا ہوتا ہے کہ دجلہ کے کنارے بھوک سے مرنے والے کتے کا بھی وہ خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے اور اسکا جلال اس طرح ہوتا ہے کہ اگر وہ دریائے نیل کو بھی خط لکھیں تو دریا بھی انکی مرضی سے بہنا شروع کردیتا ہے۔ایسے لوگوں کی حکومت عناصر فطرت پر بھی قائم ہوجاتی ہے۔

اسلامی سیاسی و معاشی نظام محض قوانین کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک بہت بڑا روحانی پہلو بھی شامل ہوتا ہے جو قیادت کے اعلیٰ معیار سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ قائد منتخب کس طریقے سے ہوتا ہے۔خلافت

راشدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ خلیفہ کو مختلف طریقوں سے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ قیادت جیسے چاہے آئے مگر اس میں خصوصیات وہی ہونی چاہیں جو کہ خلفائے راشدین میں تھیں۔ یہ بنیادی نقطہ ہے۔ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 62 اور 63 میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے اراکین کی اہلیت کی شرائط بیان کی گئی ہیں۔ انہی اراکین میں سے کوئی ایک وزیر اعظم بنتا ہے۔ وہ شرائط دین کی روحانی اساس کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہیں۔ یعنی وہ رکن متقی، نیک، پرہیزگار، اللہ سے ڈرنے والا، حرام نہ کھانے والا، حلال زندگی گزارنے والا اور پاکستان اور اسلام کے نظریئے پر یقین رکھنے والا ہونا چاہیے۔

چونکہ یہ نظام باطل اور اس نظام کو چلانے والے سب منافق لوگ ہیں اور چونکہ اسلامی نظام ان کے مفاد میں نہیں ہے لہذا وہ ان شقوں کو نافذ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ہمارے حکمران اقتدار کیلئے جدوجہد ہی اس لیے کرتے ہیں کہ سرکاری خزانے میں خیانت کر کے اپنی تجوریاں بھر سکیں۔ ان کا وجود ہی حرام سے پلا ہوا ہے۔ قوم بھی ان پر لعنت بھیجتی ہے اور انہیں بددعائیں دیتی ہے۔

اسکے مقابلے میں خلافت راشدہ کے نظام میں حکمران خود بھی عادل ہوتے ہیں اور عدل نافذ بھی کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو جاتی ہے جو کہ ایک یہودی کے پاس سے نکلتی ہے۔ جب وہ دینے سے انکار کرتا ہے تو خلیفہء وقت ہوتے ہوئے بھی حضرت علیؓ عدالت میں جاتے ہیں اور گواہ کے طور پر اپنے بیٹے اور غلام کو پیش کرتے ہیں۔ عدالت ان دونوں گواہیوں کو اس بنیاد پر رد کر دیتی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے بیٹے اور غلام ہیں۔ لہذا عدالت یہودی کے حق میں فیصلہ سنا دیتی ہے۔ اس عدل کو دیکھ کر وہ یہودی بھی اسلام قبول کر لیتا ہے۔ اگر اس طرح کے حکمران ہونگے تو وہ جج بھی ایسے ہی بٹھائیں گے کہ جو خلیفہء وقت کے خلاف بھی فیصلہ دے سکیں۔

یہ سب کچھ قیادت سے شروع ہوتا ہے کیونکہ خلیفہء وقت کو اللہ اور عوام کے سامنے احتساب کا اتنا ڈر ہوتا ہے کہ وہ کوئی خیانت نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کوئی جرم چھپانے کے لیے اپنی پسند کے جج لگانے پڑتے ہیں۔ ان کے تعینات کردہ ججوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر خلیفہء وقت بھی غلط کام کرے تو اسے بھی سزا دیں۔ اگلے ابواب میں اس بات پر مزید تفصیل سے بحث کی جائے گی۔
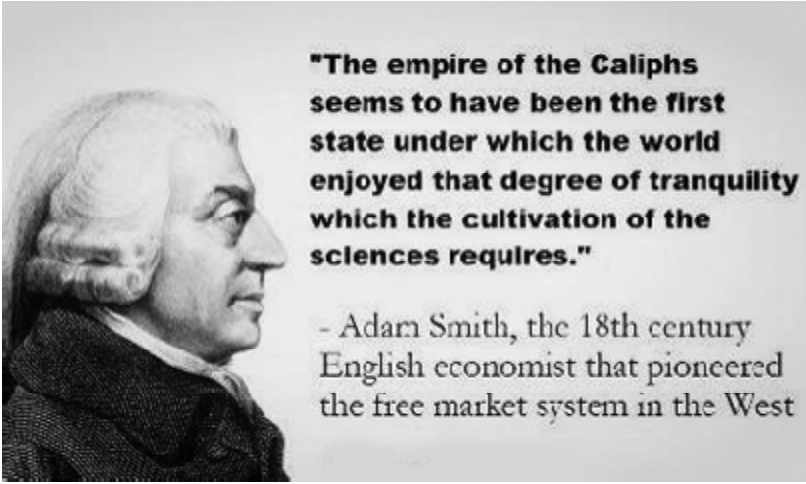
نظام خلافت قیادت سے متعلق کڑی اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ انسانیت پر ظلم ہے کہ خلافت راشدہ کے اس بابرکت نظام کو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے اور دنیا پر جمہوریت، آمریت اور بادشاہت جیسے ناپاک سیاسی نظام مسلط کر دیئے گئے ہیں کہ جن میں قطعاً انسانیت کی کوئی فلاح نہیں ہے۔ ہمیں مغربی جمہوریت اپنانے کے لیے کہا جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس جمہوریت نے مغرب کے ساتھ کیا اچھا کر دیا ہے کہ جو یہ ہمارے ساتھ کرے گی؟ یہ بے شرم اور بے غیرت لوگ ہیں کہ جن کو نہ اللہ کے سامنے جوابدہی کا خیال ہے اور نہ ہی دنیا کے سامنے۔ سوائے لوٹ مار کرنے کے اور حرام میں زندگی گزارنے کے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ کفریہ نظام انسانیت پر مسلط کرنے والوں کیلئے قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ جس کا مفہوم ہے۔ ''غفلت میں ڈال رکھا ہے انہیں کثرت کی ہوس نے۔ حتیٰ کہ یہ قبروں میں جا پہنچے''۔

اس نظام کے ذریعے حکمرانی پانے والوں کا انجام بھی قارون، ہامان اور دجال کے ساتھ ہوگا کیونکہ یہ انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور اسی میں خوش ہیں۔

۷

خلافت راشدہ میں قیادت کا معیار

ہماری اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ خلافت خصوصاً خلافت راشدہ کے نظام کا موازنہ موجودہ نظاموں مثلاً جمہوریت، آمریت اور بادشاہت وغیرہ سے کیا جائے۔ جو سیاسی اور معاشی نظام آج دنیا پر مسلط ہیں، ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نظام اپنانے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہم اس بات کو مسترد کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنا اسلامی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظام موجود ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم وہ نظام اپنانے کا حق رکھتے ہیں۔ ہم مغرب سے درآمد شدہ نظاموں کو رد کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ذرائع ابلاغ اور نظام تعلیم میں خلافت اور خصوصاً خلافت راشدہ کے نظام کے حوالے سے بات نہیں کی جاتی، لہذا ہماری نوجوان نسل اس بات سے بے خبر ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے قرون اولیٰ کے سنہری دور میں کتنا شاندار نظام قائم کیا تھا۔ بنیادی طور پر خلافت راشدہ کے نظام کا معیار اور بنیادیں اس قدر مضبوط اور پائیدار تھیں کہ چودہ سو سال بعد بھی آج اگر مسلمان معاشرہ قائم ہے تو انہی اخلاقی بنیادوں اور مثالوں پر قائم ہے کہ جو ہمارے بزرگوں نے خاص طور پر خلافت راشدہ میں قائم کیں۔

خلافت راشدہ کے دور کی بنیاد سیاسی، مذہبی اور روحانی نظاموں پر تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی توجہ

سائنس وٹیکنالوجی کی طرف نہیں تھی اور نہ ہی اس دور میں مسلمانوں نے کوئی دریافتیں کیں جیسا کہ بعد کے آنے والے دور میں اندلس، دمشق، بغداد، بخارا اور ثمرقند وغیرہ میں ہوئیں، جن میں علوم طبیعات، فلکیات، کیمیا، ریاضی، طب وغیرہ کے شعبوں میں ہونے والی ایجادات شامل ہیں۔ ان میدانوں میں ہونے والی ایجادات کی بنیاد ان اخلاقیات پر رکھی گئیں جو کہ خلافت راشدہ کے دوران مسلمان معاشرے میں قائم کی گئیں۔ لہذا خلافت راشدہ کا نظام اور اس کی اخلاقیات کا سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آج اگر مسلمان کوئی سیاسی و معاشی نظام بنانا چاہتے ہیں یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو قائم کر کے اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ جاننا پڑے گا کہ دراصل وہ عروج کیا تھا؟ ہماری عزت و آبرو کس بات سے تھی؟ ہمارے بڑوں نے کیا کر کے دکھایا تھا اور کیا مثالیں پیش کی تھیں؟ آجکل کی دنیا کا کوئی نظام اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا جو نظام ہمارے بزرگوں نے اس دور میں قائم کیا۔ لوگ اس دور کو مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں۔ ہمارے خلاف ایک عالمی مہم بھی شروع کی گئی ہے تا کہ مسلمان اس نظام سے بے خبر ہی رہیں۔ ماضی میں تو خود مسلمانوں نے خلافت کے نظام کو تباہ کیا جس پر اقبالؒ نے یہ دردناک شعر کہا:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قباء

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یعنی اس خلافت کے نظام کی تباہی میں غیروں کی عیاری تو شامل ہے ہی مگر اپنوں کی سادگی کا بھی دخل ہے۔ ناداں دوست بھی ہیں اور دانا دشمن بھی۔ ہمیں خلافت کی خصوصیات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پچھلے باب میں ہم نے اس پر بحث کی تھی کہ خلیفہ کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں اور اسے کس طرح تعینات کیا جانا چاہیے۔ حضور ﷺ کے بعد گو کہ چاروں خلفائے راشدین کا دور خلافت اور ان کی تعیناتی کا طریقہ کار مختلف تھا، مگر ان سب میں یہ بات یکساں تھی کہ وہ سب کے سب اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنے والے لوگ تھے۔ وہ خود کو اللہ اور عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ اس بات سے سب کی جان نکلتی

تھی کہ اللہ کو بھی آخرت میں جواب دینا ہے۔حکومت کوئی لوٹ مار کی چیز نہیں تھی۔سخت خود احتسابی کی جاتی تھی اور اس کے بعد یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ اللہ کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے۔

اب ہم کچھ دیگر خصوصیات بیان کرینگے اور تقابلی جائزہ لیں گے کہ خلافت راشدہ کے مقابلے میں جدید سیاسی قیادت کہاں کھڑی ہے۔ جدید سیاسی نظاموں نے خلافت راشدہ سے چند ایک جو اچھی باتیں لی ہیں، ہم ان کا بھی موازنہ کرتے جائیں گے۔ خلافت راشدہ کے نظام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ جو لوگ بھی خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کیے جاتے تھے، وہ سب کے سب ''مرد بحران'' تھے۔اپنے زمانے کی آزمائشوں، امتحانوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے کیلئے وہ موزوں ترین اشخاص تھے۔ وہ صورتحال کے مطابق ڈھل جانے والے لوگ تھے۔ یہ خلفائے راشدین کا خاص کمال اور حیرت انگیز پہلو ہے۔ہم اس کی مثالیں بیان کرتے ہیں۔آپ حیران رہ جائیں گے کہ سیدنا ابوبکرؓ کا کیا مقام ہے، حیرت انگیز! وہ تو اتنے عظیم وجود ہیں کہ انسان ان کی عظمت سے ہی کانپ کے رہ جاتا ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو اس وقت پوری مسلمان ملت میں جہاں جہاں مسلمان سرحدیں تھیں، عملی طور پر جزیرہ نما عرب میں، اتنے بڑے بڑے طوفان کھڑے ہو گئے کہ یقین کیجیئے کہ اس وقت حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے بزرگوں نے بھی محتاط رویہ اختیار کر لیا کہ فی الحال ہمیں جارحانہ حکمت عملی نہیں اختیار کرنی چاہیے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ پہاڑ خود اپنے کندھوں پر اٹھائے۔حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا کہ ''خلافت کے بعد میرے والد پر اس قدر بوجھ آ گیا کہ اگر پہاڑ پر بھی وہ بوجھ ڈالا جاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا''۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا کہ جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا یعنی منکرین زکوٰۃ۔حضرت عمرؓ نے فکرمند ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ یہ بہت نازک وقت ہے۔حضور ﷺ نے ابھی ابھی دنیا سے پردہ فرمایا ہے، امت اس وقت دکھ اور تکلیف کی کیفیت سے دوچار ہے، ایسے وقت میں آپ کیسے ان لوگوں کے خلاف تلوار نکالیں گے کہ جو کلمہ پڑھتے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اگرچہ وہ کلمہ پڑھتے ہیں لیکن جو زکوٰۃ وہ حضور ﷺ کی موجودگی میں ادا کرتے تھے، اب ان کی غیر موجودگی میں اس حق کو روکیں گے تو میں ضرور ان کے خلاف تلوار نکالوں گا۔

اس سے پہلے جب حضورﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا تو سیدنا عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی اس قدر صدمے سے دوچار ہوئے کہ تلوار نکال کر فرمایا کہ جو کوئی بھی یہ کہے گا کہ حضورﷺ نے پردہ فرمالیا ہے، میں اس کی گردن اتار دونگا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی پوری امت کو سہارا دینے کیلئے آگے بڑھے۔ اس وقت تمام بڑے بڑے صحابہؓ خاموش ہوگئے تھے یا صدمے کی حالت میں تھے۔ کوئی سوچ ہی نہیں پا رہا تھا کہ حضورﷺ اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ کے لیے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ حقیقت میں پوری امت اور انسانیت حتیٰ کہ پوری کائنات کیلئے ایک قیامت کی گھڑی تھی کہ حضورﷺ یہاں سے تشریف لے گئے ہیں اور ظاہری طور پر نظر نہیں آرہے۔ گو کہ آپﷺ کا روحانی فیض کائنات میں آج بھی جاری ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جن کی نسبت اور تعلق رسول اللہﷺ سے قائم ہے۔

ان حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک حیران کن کردار ہمیں نظر آتا ہے۔ اس وقت جو طوفان برپا تھا، وہ بہت بڑا بحران تھا۔ تاریخ کے طالبعلم کی حیثیت سے آج ہم ان حالات و واقعات کو پڑھتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ٹانگیں کانپ جاتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کس طرح اتنا دباؤ برداشت کیا؟ سیدنا ابوبکرؓ کی تربیت خود حضورﷺ نے فرمائی تھی اور انہیں اس ذمہ داری کیلئے تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ رہنما ہونے کی حیثیت سے یہ خصوصیت بھی ضروری تھی کہ فقط تقویٰ میں اعلیٰ ترین نہ ہوں بلکہ متقی ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی دباؤ، آزمائشوں اور امتحانوں کا سامنا کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہوں، یعنی تقویٰ کے ساتھ ساتھ امور سلطنت کو چلانے کی قابلیت۔

حضورﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد آپؓ نے پورے معاشرے کو سنبھالا دیا اور یہ جو فتنہ پڑنے والا تھا کہ حضورﷺ کے بعد خلیفہ کون بنے گا، اس مسئلے کو بھی سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے سب سے پہلے طے کیا۔ پھر آپؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ پھر ایک اور طوفان کھڑا ہوگیا کہ جب جھوٹے نبیوں کا معاملہ شروع ہوا۔ ایک اور آزمائش یہ بھی آگئی تھی کہ حضورﷺ نے پردہ فرمانے سے پہلے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو شام کی طرف روانہ کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ حضورﷺ نے پردہ فرمایا

تو وہ لشکر تقریباً تیار تھا بلکہ جا چکا تھا اور مدینہ سے نکل چکا تھا۔ حضور ﷺ نے پردہ فرمایا تو وہ لشکر ٹھہر گیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے بزرگوں نے بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ تھوڑی دیر لشکر کو ٹھہرا لیں۔ اس وقت اتنا بڑا بحران ہے کہ فوج کو ایک جارحانہ جنگی مہم پر بھیجنا، جو کہ دشمن کے ملک میں جا کر جنگ کریگی، مناسب نہیں۔ اس مہم کو اس وقت روانہ کیا جائے کہ جب معاملات تھوڑے بہتر ہو جائیں۔ مسلمانوں میں جنگیں شروع ہونے والی تھیں۔ مرتدین اور زکوۃ نہ دینے والوں کا مسئلہ تھا۔ ایک کے بعد ایک بحران کھڑا ہو رہا تھا۔ اس وقت معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی انتشار تھا۔ سب سے بڑھ کر جذباتی بحران تھا۔ لوگوں کے تو آنسو ہی نہیں رک رہے تھے۔ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ان بزرگوں کی گفتگو تاریخ میں اٹھا کر دیکھ لیجیئے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ جلال میں آ گئے اور فرمایا کہ جس کا مفہوم ہے کہ ''زمانہ جاہلیت میں تم لوگ سخت ہوتے تھے۔ اب حالتِ ایمان میں نرم کیوں ہو گئے ہو؟ اللہ کی قسم! اگر مدینہ کے کتے بھی مجھ پر بھونکیں اور سب لوگ چھوڑ کر چلے جائیں، میں تب بھی اس لشکر کو روانہ کرونگا کہ جسکو حضور ﷺ نے تیار کیا تھا۔'' اس کے بعد حضرت عمرؓ کے بقول انہیں تسلی ہوگئی کہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سینہ دین کیلئے کھول دیا ہے اور انہیں شرح صدر عطا کر دی ہے۔ یہ تھے مرد بحران۔ ان سے بہتر آدمی اس وقت کائنات میں وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔

قیادت کے اس معیار کا موازنہ اگر موجودہ جمہوری قیادت سے کیا جائے اور آپ پاکستان کی جمہوریت کی مثال ہی لے لیجیئے تو کیا ہمارے حکمران بحرانوں سے نمٹنے کیلئے بہترین اشخاص ہیں؟ کیا وہ اپنے وقت کے مرد بحران ہیں؟ کیا دنیا میں جمہوریت یا آمریت کے نتیجے میں جو لوگ سامنے آتے ہیں، وہ بحرانوں سے نمٹنے کے قابل ہوتے ہیں؟

جارج بش دنیا کا احمق ترین شخص مشہور ہے۔ وہ آٹھ سال امریکہ کا صدر رہا اور دنیا کا بیڑہ غرق کر کے چلا گیا۔ ان کٹھ پتلیوں کو وہ لوگ استعمال کرتے ہیں کہ جو ان کی معیشت کنٹرول کرتے ہیں۔ ان میں فری میسن، صیہونی گروہ، سرمایہ دار، بینکار اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ بااثر افراد شامل ہیں۔ جمہوریت کا مقصد
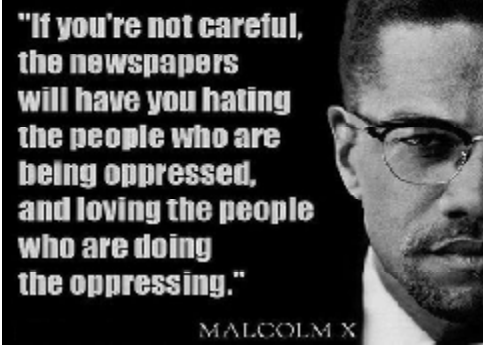
یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایسا حکمران لے کر آتے ہیں کہ جس کی ہر کمزوری کا وہ فائدہ اٹھا سکیں۔

بہت پہلے بی بی سی پر ایک پروگرام ''Yes Prime Minister'' کے نام سے نشر ہوتا تھا۔ اس میں یہ طنز دکھایا جاتا تھا کہ برطانیہ کے وزیراعظم کو اسکے وزراء کس طرح بیوقوف بناتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ بہت بااختیار ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ بیوروکریسی اور نظام کے دیگر لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتا ہے۔ وہ اسکی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم انتخابات ہار جاؤ گے، تمہارا تاثر بگڑ جائے گا، ذرائع ابلاغ نے تمہارے بارے میں یہ خبر لگادی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اوراس طرح وہ وزیراعظم اپنا تاثر قائم رکھنے کے چکر میں ان کے اشاروں پرناچتا ہے کیونکہ اس کے پاس اپنا کلی اختیار تو ہوتا نہیں اور نہ ہی عوام سے اس کا پیار ومحبت کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔ وہ ایک فراڈ انتخابات کے ذریعے سے منتخب ہو کر پہنچتا ہے اور اسکے پیروں تلے زمین ہی نہیں ہوتی اوراس کو مصنوعی طور پر بیساکھیوں کے ذریعے عوام کے سامنے کھڑا کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ حقیقی دنیا میں بھی جمہوری نظام میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت

بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ

نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

فضل الٰہی چوہدری

فضل الٰہی چوہدری پاکستان کے صدر رہ چکے ہیں۔اب انتقال فرما چکے ہیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں ملک کے صدر تھے۔ وہ اس قدر بے بس صدر تھے کہ جب وہ صدر ہاؤس راولپنڈی میں رہا کرتے تھے تو کسی نے اس دوران دیوار پر لکھ دیا کہ ''پھجے کو رہا کرو۔'' ان کو پیار سے پھجا کہتے تھے۔وہ اتنے بے بس تھے کہ ملک کا صدر ہونا بھی ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔مجبور انسان کہ جن کے پاس کوئی اختیار اور طاقت نہیں تھی۔

غلام محمد

ملک کے ایسے ایسے صدر، گورنر اور وزیر اعظم بھی گزرے ہیں کہ جو ذہنی طور پر اپاہج اور معذور تھے۔غلام محمد جس زمانے میں گورنر جنرل تھے، وہ اتنے اپاہج تھے کہ اس زمانے میں درحقیقت حکومت ان کی امریکی سیکرٹری چلا رہی تھی کیونکہ دنیا میں کسی کو سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ جناب گورنر جنرل کیا فرما رہے ہیں؟ ان کی بات صرف ان کی امریکی سیکرٹری ہی سمجھ سکتی تھی۔وہ جو حکم نامہ گورنر جنرل کے نام سے بناتی، سب کو اسی پر عمل کرنا پڑتا تھا۔درحقیقت وہ امریکی سیکرٹری سی آئی اے کی تعینات کردہ تھی۔یہ لوگ پاکستان کے ساتھ کیا کیا کر چکے ہیں، ان حالات کی تفصیل جاننا چاہیں تو قدرت اللہ شہاب کی کتاب ''شہاب نامہ'' پڑھ لیں۔اس میں انہوں نے تفصیل سے اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح ایک معذور اور اپاہج شخص کو مملکت خداداد پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا اور اس کے بعد اس کی حکومت کو سی آئی اے اس کی امریکی سیکرٹری کے ذریعے چلاتی رہی۔

بادشاہت کے نظام کو بھی دیکھ لیجیے۔بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا آجاتا ہے۔چاہے وہ قابلیت واہلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔بادشاہتی نظام میں بہت ظلم کیا جاتا ہے۔ہم نے بڑی بڑی سلطنتوں کو اس نظام کی وجہ سے تباہ ہوتے دیکھا ہے۔مغلوں کے زوال کی وجہ بھی یہی موروثی بادشاہت کا فرسودہ نظام تھا۔

جیسا کہ اقبالؒ نے فرمایا:

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

پہلے چھ مغل بادشاہوں کے زمانے میں تو استحکام رہا جنھوں نے تیس تیس، چالیس چالیس سال حکومت کی۔ وہ مضبوط اور طاقتور تھے۔ مگر ان کے بعد آنے والے حکمرانوں نے فقط دو دو، تین تین سال حکومت کی۔ انہوں نے اپنے دور حکومت کے دوران ایک مسخرہ پن اور رنگیلا پن مچایا ہوا تھا۔ سوائے ناچ گانوں کی محفلوں کے، اور کچھ ہوتا ہی نہ تھا۔ مگر چونکہ بادشاہ کے بیٹے ہوتے تھے لہذا ان کی تعیناتی ضروری تھی چاہے وہ سلطنت اور مسلمانوں کا بیڑہ غرق ہی کیوں نہ کر دیں اور آخر کار یہی ہوا۔ انگریزوں نے آ کر ان کا بیڑہ غرق کر ہی دیا۔ حکمرانی کا کوئی معیار ہی نہیں تھا کہ کون مرد بحران ہے اور کون مرد عیاش۔ آمریت اور بادشاہت کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔

ہم اسلامی تاریخ کی مثال دیتے ہیں کہ جب بھی کوئی بحران آیا، اللہ تعالیٰ نے کبھی نور الدین زنگیؒ کو بھیجا، کبھی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو، کبھی یوسف بن تاشفینؒ کو اور کبھی سلطان محمد فاتحؒ آئے۔ جب بھی بحران آتا ہے، اللہ تعالیٰ ایک مرد بحران بھیجتا ہے۔ معیار صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کس سے کام لینا چاہتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور کس خاندان سے ہے۔ معیار یہ بھی نہیں ہے کہ اس کی خاندانی حکومت چلتی ہے یا نہیں چلتی۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ وہ بادشاہ ہے یا فوجی جرنیل۔ اس زمانے میں بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ مثلاً مصر میں فاطمی بادشاہت قائم تھی کہ جس نے صلیبیوں کو دعوت دی اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی فوج سے تعاون کیا۔ بالآخر سپاہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کو اسکے خلاف فوجی مہم (Coup) کر کے اس حکومت کا تختہ الٹنا پڑا۔ آج کہتے ہیں کہ مارشل لاء لگانا بری بات ہے لیکن امت مسلمہ کو بچانے کیلئے صلاح الدین ایوبیؒ نے مصر میں مارشل لاء ہی لگایا تھا۔ اسکے بعد شام پر بھی قبضہ کیا اور یوں صلیبیوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنایا تا کہ سلطان امت مسلمہ کا دفاع کر سکیں۔

خلافت راشدہ کے نظام میں بھی ''مردِ بحران'' کو بہت مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ

ہی حضور ﷺ کے بعد مرد بحران تھے۔ انہوں نے امت مسلمہ کو بہت اچھی طرح سنبھالا۔ اسکے بعد جب انہوں نے اپنی ذمہ داریاں حضرت عمرؓ کے حوالے کیں تو لوگوں نے شکایت کی کہ عمرؓ طبیعتاً بہت سخت ہیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ "عمرؓ اسی لیے سخت ہیں کیونکہ میں نرم ہوں۔" اس نرمی کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ آہنی اعصاب کے مالک تھے۔ آج ہم مشرق و مغرب کے سبھی عظیم رہنماؤں اور ان کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ حیرت انگیز شخص نظر نہیں آتا۔ آپؓ مرد آہن تھے۔ آپؓ حضور ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔ استحکام، فہم و فراست، نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز جیسی ہر خوبی سیدنا ابوبکر صدیقؓ میں موجود تھی۔ آپؓ نے امت کو مستحکم کر کے خلافت سیدنا عمرؓ کے حوالے کی۔ یوں سیدنا عمرؓ کے لیے آسان ہو گیا کہ انتہائی سرعت سے اسلامی سلطنت کو وسعت دے سکیں۔ انہی سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اتنے طوفانوں کے باوجود ایک طرف تو سلطنت فارس کے خلاف فوجی مہم بھیجی اور دوسری جانب سلطنت روم کے خلاف۔ کیا آج آپ یہ تصور بھی کر سکتے ہیں؟

آج ہمارے حکمرانوں کی حالت دیکھیئے۔ ملک چاروں جانب سے خطرات میں گھرا ہوا ہے اور ان کا کمال یہ ہے کہ آرام سے بیٹھ کر لوٹ مار اور عیاشی میں لت پت ہیں۔ نیرو کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ روم کو آگ لگا کر وہ بانسری بجا رہا تھا۔ اس کے بعد محاورہ ہی بن گیا کہ روم جل رہا ہے اور نیرو بانسری بجا رہا ہے۔ خدا کی قسم! ہمارے حکمرانوں کا بھی وہی حال ہے۔ پورا پاکستان جل رہا ہے اور یہ بانسریاں بجا رہے ہیں۔ ان کے بیرونی دورے اور عیاشیاں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ ان کے گھروں میں فحاشی اور بدکاری پھیلی ہوئی ہے اور پورے ملک میں حالت یہ ہے کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ روٹی آٹے اور چینی کیلئے قطاروں میں دھکے کھا رہے ہیں۔ کیا یہ مرد بحران ہیں؟ کیا یہ اس قابل بھی ہیں کہ دعویٰ بھی کر سکیں کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے امتی ہیں؟ پھر انہوں نے جمہوریت کے بت کو خدا بنا رکھا ہے، نعوذ باللہ۔ آخرت میں انکا انجام بھی ان شاء اللہ انہی کے ساتھ ہوگا کہ جنکی جمہوریت یہ ملک میں مسلط کر رہے ہیں۔

آج ہمارے ملک کو جو مسائل درپیش ہیں، خلافت راشدہ کے معیار کے حامل حکمران تو ان کو چند لمحوں میں ہی حل کر دیتے۔ آئیں آپ کو مثالیں دیتے ہیں کہ خلافت راشدہ میں کس طرح مسائل کو حل کیا جاتا

تھا۔حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک بار آپؓ نے وظیفے کا نظام شروع کیا تھا کہ جس کے تحت جو بچہ اپنی ماں کا دودھ پینا بند کر دیتا، یعنی دو سال سے بڑا ہو جاتا، تو ریاست کی طرف سے اسکے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تا کہ کفالت میں مشکل نہ ہو۔آپؓ ایک بار مدینے کی گلیوں میں ٹہل رہے تھے، تا کہ رعایا کے مسائل کا اندازہ کر سکیں، تو دیکھا کہ ایک شیر خوار بچہ زاروقطار رو رہا ہے اور ماں پاس بیٹھی ہے۔جب وہ بچہ کافی دیر تک روتا رہا اور ماں نے چپ نہ کرایا تو آپؓ نے فرمایا کہ تم کیسی ماں ہو؟ بچے کو چپ کیوں نہیں کراتی؟ اسے بھوک لگ رہی ہوگی، کچھ کھانے کو دو۔ماں نے جواب دیا کہ میں اسکا دودھ چھڑوا رہی ہوں تا کہ یہ دوسری خوراک کھانا شروع کر دے۔یوں مجھے اس بچے کیلئے وہ وظیفہ ملنا شروع ہو جائیگا جو حضرت عمرؓ نے متعین کیا ہوا ہے۔حضرت عمرؓ یہ سن کر رونے لگے۔وہ یہ سوچ کر ہی کانپ گئے کہ نہ جانے کتنے بچوں کو اس وجہ سے بھوکا رہنا پڑا ہوگا کہ ان کی مائیں وظیفہ حاصل کرنے کیلئے انہیں دودھ نہیں پلا رہی ہونگی۔حضرت عمرؓ نے اپنے اوپر ذمہ داری لے لی کہ یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔آپؓ اسی وقت مسجد نبوی میں واپس آئے۔فجر کی نماز پڑھائی اور اس دوران رو رو کر آپؓ کا حشر ہو گیا۔آپؓ نے اپنے بارے میں یہ کہا کہ عمر ہلاک ہو گیا، عمر تو تباہ ہو گیا کہ کتنے بچے اس وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو گئے کہ عمرؓ نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ دودھ چھڑانے کے بعد بچے کا وظیفہ لگایا جائے گا۔یہ بات کسی کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ کوئی ماں وظیفے کیلئے بچوں کو بھوکا رکھے گی۔اس مسئلے کا آپؓ نے فوری طور پر حل نکالا۔اس کے بعد آپؓ نے یہ قانون بنا دیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اسکا وظیفہ مقرر کر دیا جائیگا۔یعنی آپؓ نے پہلے سے موجود قانون کو فوری طور پر مزید بہتر بنا دیا۔یعنی جیسے ہی دیکھا گیا کہ اگر کسی قانون میں کوئی کمی ہے تو اس کو فوری طور پر دور کر دیا گیا۔

یہی ان لوگوں کی خوبصورتی تھی کہ مسئلہ پیدا ہوتے ہی فوراً اسکا حل تلاش کر لیتے۔کبھی کسی معاملے کو لٹکایا نہیں جاتا تھا۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ خاموش بیٹھے دیکھتے رہے ہوں، تفریح کر رہے ہوں، مذاق کر رہے ہوں، معاملات کو آسان لے رہے ہوں یا انہیں اگلے ہفتے یا اگلے مہینے کیلئے لٹکا رہے ہوں۔نہیں! کبھی نہیں! مسائل کا فوری حل نکالا جاتا تھا۔اپنی جان چلی گئی لیکن امت کے مفاد میں بہترین فیصلے کیے۔اسکی مثال دیتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں مدینہ میں شورش برپا ہوگئی۔ کچھ باغی پیدا ہو گئے تھے کہ جو حضرت عثمانؓ کو شہید کرنا چاہتے تھے مگر حضرت عثمانؓ نے کبھی کسی کو اجازت نہیں دی کہ ان باغیوں کا مقابلہ کریں۔ صحابہ کرامؓ کہتے تھے کہ آپؓ حکم دیں تو ہم مقابلہ کریں ان لوگوں کا کہ جو آپؓ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں، اور جن کا منصوبہ ہے کہ آپؓ کو شہید کر دیا جائے۔ مگر آپؓ انہیں روک دیا کرتے تھے۔ اللہ نے سیدنا عثمانؓ کو اتنی بصیرت عطا کی تھی کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ اگر انہوں نے اس وقت مقابلہ کرنے کا حکم دے دیا اور مدینہ میں خونریزی کروائی تو سینکڑوں صحابہ کرامؓ آپس میں لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں گے۔ اور اس کی ایک وجہ تھی کہ آپؓ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔

حضرت عائشہؓ کے حوالے سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''میرے صحابیؓ کو بلاؤ۔'' سیدہ عائشہؓ نے پوچھا ''سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو؟'' حضور ﷺ نے فرمایا ''نہیں''۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''سیدنا عمرؓ؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں''۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''سیدنا علیؓ؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں''۔ بالآخر حضرت عائشہؓ نے پوچھا ''سیدنا عثمانؓ کو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں، ان کو بلاؤ''۔ یعنی حضور ﷺ نے خاص طور پر ان کو اپنا صحابی کہہ کر بلایا۔

سیدنا عثمانؓ تشریف لائے تو آپ ﷺ ان کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب سیدنا عثمانؓ حضور ﷺ کی بات سن رہے تھے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ غالب گمان یہی کیا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے سیدنا عثمانؓ کو بتا دیا تھا کہ آئندہ انکے ساتھ کیا واقعات ہونے والے ہیں۔

جب وہ وقت آیا کہ باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کو گھیرے میں لے لیا اور نظر آ رہا تھا کہ ان کو شہید کر دیا جائیگا تو اس وقت لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپؓ مقابلہ نہیں کریں گے، مزاحمت نہیں کرینگے؟ آپؓ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے ایک وعدہ کیا تھا اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں وہ وعدہ پورا کروں''۔ ایک اور روایت کے مطابق بھی جب آپؓ سے پوچھا گیا کہ آپؓ اس وقت مقابلہ نہیں کریں گے؟ تو آپؓ نے جواب دیا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''مجھے حضور ﷺ کی زیارت

نصیب ہوئی ہے اور انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ باغیوں نے تم پر پانی بند کر دیا ہے اور پابندیاں لگا دی ہیں۔اس کے بعد آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے پانی پلایا۔اس پانی کی ٹھنڈک میں ابھی تک اپنے سینے میں محسوس کر رہا ہوں۔حضور ﷺ نے اگلا سوال یہ کیا کہ ''عثمانؓ اگر آپ چاہیں تو آپکی حفاظت کا انتظام کر دیا جائے یا اگر آپ چاہیں تو افطار میرے پاس آ کر کریں''۔یعنی آپؓ کی شہادت ہوگی اور آپؓ میرے پاس آ کرافطار کریں گے۔

جب لوگ آپؓ کوشہید کرنے کے لیے گھر کے اندر پہنچے تو اس وقت بھی آپؓ لوگوں کو خبردار کرتے رہے کہ مجھے شہید نہ کرو ورنہ تمہاری تلواریں قیامت تک ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں گی۔حضرت عثمانؓ کو یہی خطرہ تھا کہ جس سے بچنے کیلئے آپؓ نے امت کے وسیع تر مفاد میں خود شہید ہونا قبول کرلیا مگر اپنی خاطر مسلمانوں کا خون بہانے کی اجازت نہیں دی۔یہ حضرت عثمانؓ کے ناقابل یقین حد تک بلند کردار کی ایک مثال ہے۔آجکل کے بادشاہ تو اپنی جانیں بچانے کے لیے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو قتل کرادیتے ہیں۔ دہشت گرد اور قاتل گروہ بناتے ہیں اور پوری دنیا میں قتل و غارتگری اور تباہی برپا کی جاتی ہے۔صرف شک کی بنیاد پر ہی لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

آپ نوٹ کریں گے کہ کئی سال بعد ہندوستان میں محمد بن قاسمؒ نے بھی حضرت عثمانؓ جیسا ہی کردار دکھایا۔جب آپؒ نے سندھ فتح کیا تو بعد میں آنے والے خلیفہ نے آپکو پیغام بھجوایا کہ آپ واپس آجائیں۔لوگوں نے محمد بن قاسمؒ کو خبردار کیا کہ خلیفہ آپؒ کو مروا دے گا کیونکہ خلیفہ کی آپ سے دشمنی ہے۔آپؒ نے ملتان تک کے علاقے فتح کر لیے ہیں۔لوگ آپؒ کی عزت کرتے ہیں۔آپؒ اپنی خودمختار سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔آپؒ ان مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیجیئے۔محمد بن قاسمؒ نے بھی یہی جواب دیا کہ ''میں اپنی جان بچانے

کیلئے امت کونقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں امت میں اختلاف پیدا نہیں کرونگا۔'' سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کرنے والا نوجوان جب اکیس سال کی عمر میں واپس وطن پہنچا تو اسے شہید کر دیا گیا۔ ایسا عظیم کردار کہ شہید ہونا گوارا کرلیا مگر امت میں اختلاف پیدا نہ ہونے دیا۔ یہ بھی ایک اعلیٰ اور منفرد کردار ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیاوی نکتہء نظر سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں، وہ اس مقام کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔ جیسا کہ زندگی کی حقیقت کے بارے میں اقبالؒ نے فرمایا:

برتر از اندیشہء سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یعنی زندگی کبھی زندہ رہنے اور کبھی شہید ہوجانے کا نام ہے۔ زندگی کا مقام نفع و نقصان سے بہت بڑھ کر ہے۔ یہ خصوصیت ہمیں حضرت عثمانؓ کے کردار میں دکھائی دیتی ہے کہ آپؓ نے امت کی تلواروں کو آپس میں ٹکرانے سے بچانے کیلئے خود شہید ہونا گوارا کرلیا۔

مرد بحران۔ یہ ایک خاص خصوصیت ہے۔ کیا کوئی سیاسی نظام آپ کو اس سطح کی قیادت دے سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ نا قابل تصور۔ اللہ کے بندوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ عہدوں سے انکی جان نکلتی ہے کہ روز قیامت رب کے سامنے حساب دینا پڑے گا۔ اب یہ حال ہے کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ ظلم کی انتہا مچی ہوئی ہے۔ مگر بادشاہوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ حکمران کس کام کے ہیں کہ اگر ذمہ داری نہیں لیتے؟ روز قیامت وہ اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ تب ان کے پاس یہ عہدے اور یہ اختیارات نہیں ہونگے۔ تب یہ کابینہ میں نہیں بیٹھے ہونگے، تب یہ صدر اور وزیر اعظم بھی نہیں ہونگے۔ اس وقت یہ اللہ کے حضور کھڑے ہونگے اور وہ مظلوم کہ جن کی گردنوں اور عزتوں پر انہوں نے ہاتھ ڈالے تھے اور جن کے بچے بھوک سے بلک بلک کر مر گئے تھے، ان مظلوموں کو ان سے بدلہ لینے کا اختیار دیا جائیگا۔ اس وقت یہ آج کے حکمران چیخیں گے، چلائیں گے کہ ہم نے دنیا میں کیا کیا ظلم کیے، مگر آج دنیا میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ غفلت میں رکھا ہے ان کو کثرت کی ہوس نے حتیٰ کہ یہ قبروں میں جا پہنچے۔ ان کا پیٹ صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

یہ بدنصیب حکمران ہیں۔ان کے نصیب میں وہ فیض، وہ کرم ہی نہیں ہے کہ جو مسلمان حکمران کیلئے اللہ کا انعام ہے۔ان کے سامنے تاریخ میں بہت سے لوگوں کی مثالیں ہیں کہ جن کے نقش قدم پر وہ چل سکتے ہیں۔اس کے باوجود یہ غلاظت میں رہنے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔کسی کے پاس پاکستان کی حکومت ہو اور وہ ذلیل و رسوا ہو رہا ہو، تو اس شخص سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا؟ یہاں پر بہت سے حکمران ایسے ہیں کہ جنہیں امت صرف بدعائیں دیتی ہے اور انہیں ان گالیوں سے بچنے کیلئے قوانین بنانے پڑتے ہیں۔وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کر رہا ہے یا فرشتے ان کو بدعادے رہے ہیں۔کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کا خاص دشمن ہوتا ہے، اللہ بھی اس پر لعنت بھیجتا ہے۔**آعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم**۔اللہ تعالیٰ نے شیطان کو بھی مردود کہا ہے اور بعض انسان ابولہب اور ابوجہل جیسے بھی ہوتے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مردود کہا ہے۔جو حکمران اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اس امت کے ساتھ خیانت کریں، اس کے بچوں کو قتل کرائیں، اسے تباہ و برباد کریں، اس مملکت خداداد پاکستان کے ساتھ خیانت کریں تو پھر ان کیلئے دنیا اور آخرت میں کوئی رحم نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کے دور خلافت میں مسلمان امت میں بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔شام اور عراق کی فوجیں آپس میں ٹکرا گئیں۔وہی ہوا کہ جس سے حضرت عثمانؓ بچنا چاہتے تھے۔اس کے باوجود بزرگوں نے اعلیٰ ترین کردار دکھایا۔مرد بحران۔قیادت کے اہل افراد۔خلیفۂ راشد حضرت علیؓ اور حضور ﷺ کے صحابی حضرت معاویہؓ میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے۔وہ آپس میں دوست ہیں، جو چاہیں اختلاف کریں۔ہماری جرأت نہیں کہ ہم کسی پر کوئی اعتراض کریں یا کوئی تبصرہ کریں۔اگر ہم اتنے بڑے بزرگوں پر کوئی اعتراض کریں گے تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔جو کچھ ہوا وہ اللہ کی مرضی ہے۔اللہ تعالیٰ نے تو بات ثابت کرنے کیلئے مثالیں دینی ہیں۔روم کے بادشاہ نے اس لڑائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔رومی سلطنت کی سرحدیں شام اور عراق کے ساتھ ملتی تھیں۔رومی بادشاہ نے حضرت معاویہؓ کو خفیہ طور پر پیغام بھجوایا، بلکہ ارادہ کیا کہ اس لڑائی سے فائدہ اٹھا کر حضرت علیؓ کے زیرسایہ علاقوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لے۔حضرت امیر معاویہؓ کو جب یہ پتہ چلا کہ رومی بادشاہ ان کے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر حضرت علیؓ کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تو حضرت معاویہؓ نے اسے جواب دیا کہ اگرچہ حضرت علیؓ سے میرے

اختلافات ہیں لیکن اگر تم نے امت مسلمہ اور حضرت علیؓ پر حملہ کیا تو میں بھی ایک سپاہی کی حیثیت سے انکی فوج میں شامل ہوکر تمہارے خلاف لڑوں گا۔ ہمارے اختلافات ذاتی ہیں جنہیں ہم حل کرلیں گے مگر ہم کسی کافر کو یہ اجازت نہیں دینگے کہ امت مسلمہ کو نقصان پہنچائے۔

اس قیادت کی خصوصیات دیکھیں ذرا، حیرت انگیز۔یعنی داخلی اختلافات کا فائدہ خارجی قوتوں کو اٹھانے نہیں دیا جاتا تھا۔حضرت علیؓ کا بھی یہی معاملہ تھا۔حضرت علیؓ پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ اگرچہ آپؓ ان کی فوجوں سے لڑتے ضرور ہیں مگر نہ ان کے بچوں کو اٹھا کر بیچتے ہیں، نہ ہی ان کی عورتوں کو بے عزت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے قیدیوں سے وہ سلوک کرتے ہیں کہ جو جنگی قیدیوں سے کیا جاتا ہے۔حضرت علیؓ یہ سن کر جلال میں آ گئے اور فرمایا کہ ہمارا اختلاف ذاتی اور سیاسی ہے۔ہم کافروں سے نہیں لڑ رہے۔ایک اللہ کا حکم ہے جو ہم نے نافذ کرنا ہے۔ہم ان سے وہی سلوک رکھیں گے کہ جو مسلمانوں سے رکھا جاتا ہے۔آخر کار ان دونوں کی آپس میں صلح بھی ہوگئی اور محبت اور پیار بھی ہوگیا۔اس وقت خارجیوں اور یہودیوں کی سازشوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف اور فتنہ بھی پھیلا۔بعد میں حضرت علیؓ کو شہید کرنے والے بھی وہی خارجی فتنہ گر تھے کہ جو مسلمانوں کو آپس میں لڑوا رہے تھے۔مگر یہاں قابل غور نکتہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کا وہ اعلیٰ کردار ہے کہ اپنے ظاہری اختلافات کے باوجود آپ دونوں نے دشمنوں کو موقع نہ دیا کہ وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے برعکس ہمارے آج کے حکمرانوں کو دیکھیں۔ذرا سا اندرونی اختلاف ہوتا ہے تو کوئی بھارت کی طرف بھاگتا ہے،کوئی اسرائیل سے مدد مانگتا ہے اور کوئی امریکہ کے پاس چلا جاتا ہے۔بلوچستان لبریشن آرمی جیسی علیحدگی پسند تحریک کا ہیڈکوارٹر اسرائیل میں ہے۔پاکستان میں جاری تمام علیحدگی پسند تحریکیں دہلی سے چلائی جارہی ہیں۔پاکستان میں ڈیم نہیں بننے دے رہے، پانی اور توانائی کا مسئلہ کھڑا کردیا گیا ہے،صوبے توڑے جارہے ہیں۔یہ لوگ سیاست بھی کررہے ہیں، ملک کا حصہ بھی ہیں مگر چونکہ پاکستانی ریاست سے اختلافات ہیں لہذا بھارت اور دشمنوں کے ساتھ ملکر امت سے غداری کررہے ہیں۔یہ سارا معاملہ دیکھیئے۔یہ جو سیاست ملک میں جاری ہے اس کا موازنہ خلافت راشدہ سے کرلیجیئے۔ہمارا مقصد

یہی ہے کہ آپ کو خلافت راشدہ کا معیار دکھا دیں۔ وہ لوگ اختلافات کی موجودگی میں بھی اتنے اعلیٰ کردار کے حامل تھے کہ ہمارے آج کے حکمران زمانہء امن میں بھی وہ کردار دکھانے کا نہیں سوچ سکتے جو ہمارے بزرگوں نے قرون اولیٰ میں دکھایا۔

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار وخطا بیں،وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب ِ سلیم

۸

خلافت راشدہ کا سیاسی نظام

موجودہ سیاسی فکر میں مختلف انتظامی طریقہ کار بتائے گئے ہیں۔ جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ اکثریت کی رائے سے تشکیل پانے والا نظام حکومت۔ آمریت، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، کہ ایک فرد یا ایک جماعت کے گرد گھومنے والا نظام کہ جس میں حکومت کرنے والا فرد کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنے آپ کو کسی اعلیٰ ہستی کے سامنے جوابدہ نہ سمجھتی ہو تو اس نظام کو آمریت کہا جاتا ہے۔ جس طرح آج چین کی کمیونسٹ پارٹی ہے یا اس سے پہلے سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی ہوا کرتی تھی۔ اس کے اندر ایک فرد فیصلے کرے یا ایک گروہ یا پولٹ بیورو، کمیونسٹ پارٹی کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں ہے۔ خواہ وہ ملک وقوم کو برباد کر کے رکھ دیں اور ہر قسم کی اخلاقیات کو پامال کر دیں۔ وہ قوم کے سامنے جوابدہ ہیں اور نہ ہی اللہ کے سامنے۔ آمریت کا فساد ہی یہ ہے۔ بادشاہت بھی آمریت ہی کی ایک شکل ہے۔ فرد واحد یا ایک خاندان کی موروثی حکومت۔ آمر خود کو خدا تصور کرتا ہے۔ آمریت کا تصور بھی زمانہ قدیم سے پایا جاتا ہے۔ فرعون بھی آمر تھا جو اپنے آپ کو خدا تصور کرتا تھا اور لوگوں پر ظلم ڈھاتا تھا۔ نمرود نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا۔ خدائی کا دعویٰ کرنے کی مذموم ذہنیت انسانی تاریخ میں کبھی بھی ختم نہیں ہوئی۔ ہر دور میں رنگ برنگے نام نہاد خدا آتے رہے ہیں جو کبھی خود کو جمہوریت کے نام پر خدا بناتے ہیں،

کبھی آمریت اور کبھی بادشاہت کے نام پر۔جیسا کہ اقبالؒ نے جدید دور کے خداؤں کے بارے میں فرمایا:

ان تازہ خداؤں میں سب سے بڑا وطن ہے
جو پیرہن ہے اسکا وہ مذہب کا کفن ہے

جمہوریت کا ڈرامہ اس وقت شروع ہوا تھا کہ جب آزادی، مساوات اور عوام کی حکومت کے تصورات متعارف کروائے گئے۔ایک بادشاہ کی طاقت کوتوڑ کراس کے اختیار کوئی لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا جو کہ پارلیمنٹ میں بیٹھ کراسی اختیار کواستعمال کرتے تھےاورلوگوں کو یہ تاثر دیا جا تا تھا کہ اصل میں حکومت عوام کی ہے۔اور پھر یہ بھی کہا جا تا تھا کہ پارلیمنٹ اعلیٰ ترین ادارہ ہے۔جیسا کہ اقبالؒ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اس ڈھونگ کا پردہ چاک کیا:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اگر چہ ہمارے آئین میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اقتداراعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس ہےمگر عملی طور پر پارلیمنٹ کو افضل ترین گردانا جا تا ہےاوراسی کے فیصلوں کا نفاذ ملک میں ہوتا ہے۔پارلیمنٹ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے۔علامہ اقبالؒ نے جدید جمہوریت کوآمریت ہی کی شکل قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ جسے تم آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہو، وہ ظلم واستبداد کا ایک دیو ہے جو پاؤں مارتا چلا آرہا ہے۔مزید فرمایا کہ:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یعنی اگر اکثریت گھٹیالوگوں کی ہےتو انہی کی مرضی چلے گی۔ذرائع ابلاغ کے ذریعےلوگوں کے ذہنوں اور سوچ کو کنٹرول کیا جا تا ہے۔موجودہ دور میں دھوکہ دینے کا سب سے بڑا ہتھیار ذرائع ابلاغ ہی ہیں۔یہ
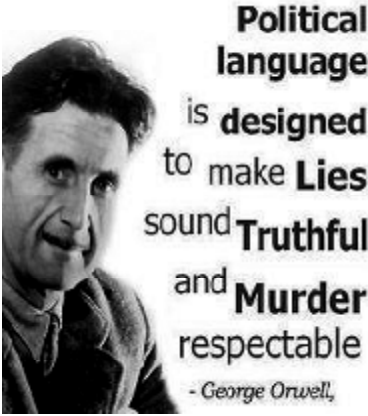
صیہونیت کے قائم کردہ دجالی نظام کا اہم ترین عنصر اور اسکی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ ایسے لوگ جن کی فکر خام ہو، جنہیں اچھے اور برے کی تمیز نہ ہو، حلال وحرام کا فرق نہ پتہ ہو، ان کو انتخاب کا مکمل اختیار دے دیا جاتا ہے کہ تم جسے چاہو حکمرانی کیلئے منتخب کرلو۔ ان کے ذہنوں پر بھی با آسانی قابو پایا جاسکتا ہے یا پیسے کے ذریعے ان کے ووٹ کو خریدا جاسکتا ہے اور جن امیدواروں کو انتخاب کیلئے پیش کیا جاتا ہے وہ خود دجالی نظام کا حصہ ہوتے ہیں یعنی ووٹ دینے والے بھی جاہل اور لینے والے بھی شیطان۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا مسند سنبھالنے کے بعد ابتدائی تقریر بہت جامع انداز میں اسلامی سیاسی نظام کی تشریح کرتی ہے۔ اسلامی سیاسی نظام جمہوریت پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ نہیں کیا جاتا بلکہ اگر خلیفہ یہ سمجھے کہ اکثریت غلط رائے دے رہی ہے تو وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس کے برعکس درست فیصلہ کرسکتا ہے۔ خلیفہ شوریٰ سے مشورہ ضرور لیا کرتا ہے مگر فیصلہ خود ہی کرتا ہے۔ خلیفہ کے پاس ویٹو پاور تھی مگر وہ ویٹو پاور قرآن وسنت کی پابند تھی۔ ایسے سیاسی نظام کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا نظام نہیں کرسکتا کہ جس میں خلیفہ کے پاس اس قدر لامحدود اختیارات ہیں کہ قوم کے برعکس اپنی مرضی کا فیصلہ تو کرسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ خود اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کے علاوہ خلیفہ اپنے عوام کے سامنے بھی خود کو احتساب کیلئے پیش کرتا ہے۔ خلفائے راشدین عوام سے کہتے تھے کہ اگر ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف چلیں تو تمہیں حق ہے کہ ہم سے سوال کرو۔ معاشرے کے بہترین لوگ خلیفہ سے اختلاف رائے تو کرسکتے ہیں لیکن اگر خلیفہ کا حکم اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف نہ ہو تو عوام پابند ہیں کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کریں۔ خلیفہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ یہ خلافت راشدہ کا ایک انتہائی حیران کن پہلو ہے۔

خلیفہ بننے کے بعد اپنی ابتدائی تقریر میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا ''اگر چہ مجھے تمہارا خلیفہ تو بے شک بنادیا گیا ہے لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں سیدھی راہ پر چلوں اور خلیفہ کی حیثیت سے نیکی کا حکم دوں تو میری بات ماننا۔ لیکن اگر میں سیدھی راہ سے ہٹ جاؤں اور غلط راہ پر چلنے لگوں تو پھر تمہاری ذمہ داری ہے کہ مجھے سیدھے راستے پر چلاؤ''۔ یہاں پر یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ میں انتہائی عاجزی ہے اور کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں اور معاشرے میں ایک مساوات ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اکثر صحابہ کرامؓ نے کہا تھا کہ شام کی طرف لشکر مت بھیجیں مگر آپؓ نے اصرار کیا کہ جس کام کو حضورﷺ نے شروع کیا تھا، میں اسے ختم نہیں کرسکتا۔ کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو خلیفہ پابند ہیں اللہ اور اسکے رسولﷺ کے حکم کے، مگر ساتھ ساتھ شوریٰ کو بھی مطمئن کرتے ہیں۔ یعنی آپ نے وہ کام کرنے کی حکمت بھی بیان کردی۔ اگر کسی کو سمجھ نہیں آیا تو بھی، جب تک وہ حکم قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہے، اس پر عمل ہوگا کیونکہ فیصلے کا آخری اختیار خلیفہ کے پاس ہے۔

خلیفہ شوریٰ کے دائرہ کار کو جہاں تک چاہے پھیلا دے۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں شوریٰ کا دائرہ کار عوام الناس تک وسیع کر دیا گیا تھا۔ آپؓ نے یہ اعلان کروا دیا تھا کہ جو کوئی بھی مجھے میری خامیاں، کمزوریاں اور کوتاہیاں بتائے گا، وہ میرے نزدیک عزیز ترین ہوگا۔ اس اعلان کے بعد ہر شخص نے ان پر اعتراضات (صحیح اور غلط) کرنے شروع کر دیئے۔ حضرت عمرؓ وہ سب اعتراضات خندہ پیشانی سے سنتے۔ اعتراضات کرنے والوں میں نو مسلم اور ایسے لوگ بھی شامل تھے کہ جنہیں دین کا کچھ علم ہی نہیں تھا۔ گو کہ مشیروں میں پرانے سمجھدار صحابہ بھی تھے، جو کہ بہت ادب کرتے تھے، مگر نو مسلم، جو کہ دین میں ادب اور احترام کے معاملات سے لاعلم تھے اکثر سختی بھی کر جاتے تھے۔

وہ اس قدر منفرد نظام تھا کہ موجودہ سیاسی اصطلاحات ان کی تشریح ہی نہیں کرسکتیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ نے کچھ علاقوں کے گورنر مقرر کرنے ہوتے تھے۔ مگر آپؓ وہ حاکم خود مقرر کرنے کے بجائے ان علاقوں کے لوگوں سے کہتے کہ اپنی مرضی کا شخص منتخب کرلو۔ میں اس کو تعیناتی کی سند دے دیتا ہوں۔ یعنی لوگوں کو شوریٰ کے ذریعے مقامی انتخاب کی اجازت دے دی جاتی تھی مگر حتمی فیصلہ خلیفہ کے پاس ہی رہتا

تھا۔اس نظام میں کس قسم کے لوگ منتخب ہوتے تھے؟اس کی مثال ایک واقعہ سے ملتی ہے۔ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک علاقے کے لوگوں سے کہا کہ اس جگہ کے غریب لوگوں کی فہرست بنا کر مجھے بھیجو تا کہ میں سرکاری بیت المال سے انکا وظیفہ مقرر کر دوں۔جب وہ فہرست بنا کر بھیجی گئی تو سرفہرست نام حضرت عامرؓ کا تھا کہ جو اس علاقے کے گورنر تھے۔وہ سارا دن اپنے صوبے کے لوگوں کی خدمت کرتے اور رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔اوران کی غربت کا یہ عالم تھا کہ خود عوام نے مساکین کی فہرست میں ان کا نام لکھ کر بھیجا۔اس نظام میں منتخب ہونے والے اور منتخب کرنے والے دونوں ہی اخلاق و کردار کے اعلیٰ ترین معیار پر تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی ایک صوبے کے گورنر تھے۔اس صوبے کے لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا اور حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ وہ عسکری قائد ہونے کی وجہ سے انتظامی معاملات میں بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر دیا۔تو یہ طے ہو گیا کہ اسلامی نظام میں حاکم اور عوام کے درمیان اگر قریبی تعلق اور پیار و محبت نہ ہو تو یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو اچھی حکمرانی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔اس صورتحال میں عوام پھر بادشاہ پر لعن طعن کرتی ہے اور بادشاہ عوام پر سختی کرتا ہے۔حکمران ایسا ہونا چاہیے کہ جو سب لوگوں سے بہتر بھی ہو اور باقی سب اسکا ادب اور احترام بھی کرتے ہوں۔ہمارے دین میں پیار و محبت کے نام پر اطاعت کروائی جاتی ہے،تلوار کے زور پر نہیں۔سیاسی قوت سے زیادہ اخلاقی قوت مضبوط ہوتی ہے۔اسی وجہ سے معاشرے کے بہترین افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

ہمارے گھروں اور علاقوں میں بھی یہ ایک قسم کا غیر دستاویزی قانون ہے کہ بہترین شخص کو ترجیح دی جاتی ہے۔جب جماعت کرانے کا موقع آئے تو سب سے بزرگ اور متقی شخص کو آگے کیا جاتا ہے۔کم عمر لوگ خود ہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔معاشرے میں یہی روایت ہوتی ہے۔سب کو دوسرے لوگوں کی عزت و تکریم اور مقام و مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے کہ کون کتنا نیک ہے،کون کتنا کرپٹ ہے،کون کتنا چور ہے،کس کو این آر او سے دھویا گیا ہے،کس نے اپنے قرضے معاف کروائے ہیں،کس نے سپریم کورٹ سے اپنی سزائیں معاف کروائی ہیں اور کون کتنا حرام کھاتا ہے۔معاشرے کے لوگوں کو سب چوروں لٹیروں کے نام

معلوم ہوتے ہیں لیکن آج کے نظام میں پھر بھی انہیں سزا نہیں دی جاتی بلکہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز کردیا جاتا ہے اور پھر عوام بھی انہیں گالیاں دیتے ہیں۔ جبکہ حضرت عمرؓ کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ عوام اپنے گورنر، سعد بن ابی وقاصؓ جیسے بزرگ صحابی، سے بھی ناخوش ہیں تو فوراً انہیں گورنر کے عہدے سے معزول کردیا اور ایسے شخص کو تعینات کردیا کہ جس سے عوام خوش تھے تاکہ ان کا آپس کا تعلق برقرار رہے۔ اگر عوام اور حکمران کے مابین اچھے تعلقات ہوں تو انتظامی امور سے متعلق کوئی مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے۔ خلافت راشدہ میں جیسے ہی یہ تعلقات بگڑتے تھے، گورنر کو ہٹا دیا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں عوام اور حکمران کے آپس کے تعلقات کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی اور حکمرانوں پر کتنی سخت نظر رکھی جاتی تھی تاکہ کسی بھی قسم کی چپقلش پیدا نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کو کئی بار شکایات آئیں کہ فلاں علاقے کے گورنر کے اخراجات ان کی آمدنی سے زیادہ ہیں۔ یعنی خورد برد ہونے کا اندیشہ ہے، مگر ثبوت نہیں مل رہا۔ چونکہ ہر فرد صحابی نہیں تھا اور مملکت بھی چین تک پھیل گئی تھی لہذا لوگوں میں اخلاقی برائیاں بھی پیدا ہوگئیں تھیں۔ حضرت عمرؓ نے فوری کارروائی کرتے ہوئے ایسے تمام گورنروں کو بلوا لیا۔ ان کی آمدنی اور خرچ کا حساب کروایا اور پھر ان کی دولت کا آدھا حصہ بیت المال میں جمع کروا دیا۔ یہ تو وہ گورنر تھے کہ جن کے خلاف ثبوت نہیں تھا۔

اسی طرح ایک قابل قدر صحابیؓ، جو کہ مصر کے گورنر تھے، کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اچھا لباس زیب تن کرنے لگے ہیں، گھر بھی اچھا ہو گیا ہے اور چوکیدار بھی رکھ لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنا سفیر بھیج کر انہیں مصر سے بلوایا اور موٹا اونی لباس پہنا کر بکریوں کا ایک ریوڑ ان کے حوالے کردیا کہ جنگل میں جا کر بکریاں چراؤ۔ وہ گورنر روتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے، مجھے وہ پسند نہیں مگر عمرؓ! میں آپکا حکم نہیں ٹال سکتا۔ حالانکہ ان گورنر نے کوئی خیانت نہیں کی تھی مگر صرف آرام طلبی کی شکایت پر ان کے خلاف اتنی سخت کارروائی کی گئی۔ یہ تھا حضرت عمرؓ کا کڑا احتساب۔

ہمارے ملک میں تو پھانسی کی سزا بھی صرف غریب، مسکین اور بے آسرا افراد کو دی جاتی ہے۔ آج تک کسی وڈیرے، نواب، ایم این اے وغیرہ کو پھانسی کی سزا نہیں دی گئی چاہے وہ قتل کریں، کرپشن کریں، ظلم کریں

یا ڈاکے ڈالیں۔ جبکہ خلافت راشدہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے عظیم سپہ سالار کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا کہ ان کے خلاف اسراف اور فضول خرچی کی شکایت آئی تھی۔ ان کو گرفتار کرنے کیلئے حضرت بلال حبشیؓ کو منتخب کیا گیا۔ حضرت بلالؓ نے مسجد کے اندر بیٹھ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کی پگڑی اتار کر اس سے ان کے ہاتھ باندھے اور گرفتار کر لیا۔ پوری امت مسلمہ کانپ کر رہ گئی مگر خلیفہ کے خلاف کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو پتہ تھا کہ خلیفہ کا یہ مرتبہ کیوں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ خلیفہ خود پھٹے پرانے کپڑتے پہنتے ہیں جن میں سترہ سترہ پیوند لگے ہوتے ہیں اور وہ ریگستان جا کر بیت المال کا اونٹ بھی خود ہی ڈھونڈتے ہیں۔ ساری ساری رات شہر میں چکر لگاتے ہیں کہ کہیں کوئی بھوکا تو نہیں سو گیا یا تکلیف میں تو نہیں ہے۔ ایسے خلیفہ کے اتنے بڑے فیصلے کے باوجود بھی کسی میں بغاوت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ خلفاء کا یہ مقام ہوتا ہے۔ خلیفہ جس کام کا حکم دوسروں کو دیتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔ لہذا کوئی بھی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ جب بیت المقدس میں داخل ہوئے تو وہ پیدل تھے اور ان کے غلام اونٹ پر سوار تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ چند مسلمان جرنیل آ رہے ہیں کہ جنھوں نے باریک اور نرم لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ضرارؓ جیسے بڑے بڑے صحابہ نے عام سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جلال میں آ کر مٹی اٹھا کر ان جرنیلوں پر پھینکی اور فرمایا کہ تم لوگ دنیا میں مشغول ہو چکے ہو۔ ان جرنیلوں نے اپنے کرتے اوپر اٹھا دیئے۔ ان کرتوں کے نیچے انہوں نے جنگی لباس پہن رکھا تھا اور اسلحے سے لیس تھے۔ تب حضرت عمرؓ کا جلال ذرا کم ہوا۔

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت انکی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت انکی

دوسری طرف ہمارے حکمرانوں کی یہ حالت ہے کہ ملک بھوک اور پیاس سے تباہ ہو رہا ہے اور انہیں معلوم ہے کہ ملک میں آبی ذخائر بنانے کی اشد ضرورت ہے مگر وہ ایک کالا باغ ڈیم تک نہیں بنا سکے کیونکہ وہ

خود بدیانت اور کرپٹ ہیں۔صوبہ سرحد میں ذرا سا ہنگامہ ہوا، بھارتی خفیہ ایجنسیوں نے سندھ میں شور شرابا کروایا اور بدنیت حکمرانوں نے اسے بنیاد بنا کر کالا باغ ڈیم کا پورا منصوبہ ہی ختم کر دیا۔ بھارت ہمارے دریاؤں پر چالیس سے زائد بند بنا چکا ہے۔اس حوالے سے کوئی بے شرم حکمران آواز ہی بلند نہیں کرتا بلکہ ملک میں جو بند تعمیر ہونے چاہیں، ان کی تعمیر کی طرف بھی مجرمانہ غفلت ہے۔آبی ذخائر اس لیے نہیں بنائے جارہے ہیں کیونکہ ہمارے حکمران ملت کے مفاد پر جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں یعنی اکثریتی رائے کو اور اکثریت کو دشمن اندرون خانہ خرید چکا ہے (عوام کی اکثریت کو نہیں بلکہ ارکان اسمبلی کی اکثریت کو)۔ہماری پوری پوری سیاسی جماعتوں کو ہی دشمن خرید لیتا ہے۔

شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط انکا جوہر ادراک!

خلافت راشدہ کا نظام حیران کر دینے والا ہے۔عوام الناس اور خلیفہ کی طاقت کے درمیان جتنا توازن اس نظام میں ہے، کسی اور نظام میں نہیں۔خلیفہ اگرچہ جو چاہے فیصلہ کرسکتا ہے لیکن اگر اسے یہ بتا دیا جائے کہ اسکا حکم قرآن وسنت سے متصادم ہے یا عوام کے مفاد میں نہیں ہے تو خلیفہ کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بحیثیت خلیفہ کچھ لوگوں کے نام زمینیں منتقل کیں اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادی کہ جب تک حضرت عمرؓ اس کی تصدیق نہ کریں یہ حکم نامہ نافذ نہیں ہوسکتا۔حضرت عمرؓ تک یہ بات پہنچی تو آپؓ نے اس حکم نامے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس تشریف لائے اور خلیفہ کو یہ احساس دلایا کہ یہ فیصلہ امت کے مفاد میں نہیں۔اسکے بعد آپؓ نے وہ حکم نامہ غیر نافذ العمل قرار دے دیا۔ایسا کام کائنات میں صرف حضرت عمرؓ ہی کر سکتے ہیں۔لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے

حضرت عمرؓ کی شکایت کی اور کہا کہ ''خلیفہ آپ ہیں یا وہ؟'' اب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ظرف دیکھیئے۔ انہوں نے جواب دیا ''ہونا تو انہی کو چاہیے تھا مگر میں بن گیا'' پھر آپؓ نے فرمایا کہ عمرؓ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہی درست ہے۔ یوں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے بعد میں دلیل سے ثابت کر دیا کہ یہ فیصلہ عوام الناس کے فائدے میں نہیں ہے۔

خلیفہ کیا ہے؟ مضبوط کردار، اعلیٰ ترین قیادت اور آفاقی طاقت۔ یہ جمہوریت، آمریت یا بادشاہت نہیں ہے۔ ہم ان سب کو رد کرتے ہیں۔

خلافت اور شورائیت، یہ وہ نظام ہیں جو ہمیں آنے والے وقت میں اپنانے ہیں۔ ہمیں موجودہ جمہوریت، بادشاہت اور آمریت کو خیر آباد کہنا ہے۔ مرضی اکثریت کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہونی چاہیے جو خلیفہ کے ذریعے نافذ کی جانی چاہیے اور اس مرضی کے نفاذ کے لیے خلیفہ شوریٰ سے مشورہ لے سکتا ہے جو کہ معاشرے کے بہترین افراد پر مشتمل ہو۔ یہ اسلام کا سیاسی نظام ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

۹

خلافت راشدہ کا سیاسی نظام (حصہ دوم)

خلافت راشدہ کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام اتنا حیرت انگیز، مقدس اور خداداد ہے کہ اسکی مثال آج بھی دنیا کا کوئی اور نظام دے ہی نہیں سکتا۔ لہذا جب انسان آج کی جمہوریت، آمریت اور بادشاہت کی عینک لگا کر خلافت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ہمیشہ پریشان ہی ہوتا ہے۔ خلافت اعلیٰ ترین معیار ہے۔ انسانیت نے اس سے بہتر کوئی نظام تخلیق ہی نہیں کیا۔ یہ نہایت مسحور کن دور تھا اور انسانیت کی معراج تھی۔ آج دنیا میں جتنی بھی خیر نظر آ رہی ہے اور اگر آج مغرب نے کہیں بھی معاشرتی فلاح اور انصاف کے نظام قائم کیے ہیں تو اس کی تمام مثالیں خلافت راشدہ میں بہت پہلے سے موجود ہیں۔ اپنے نظام حکومت کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں مغربی جمہوریت یا مشرقی آمریت یا بادشاہت کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انسانیت میں خیر تقسیم کرنے کے لیے خلافت راشدہ کا نظام ہی کافی ہے۔

پچھلے باب میں ہم نے شوریٰ اور پارلیمان کے تصور پر بحث کی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حکم اعلیٰ ترین ہے یا پارلیمان کا فیصلہ؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ تم اپنے کام مشاورت اور اتفاق رائے سے کرو۔ یعنی مسلمانوں کو ایک بات پر متفق کرنے کیلئے شوریٰ ضروری ہے۔ مسئلہ چاہے ایک بہت بڑی عسکری مہم شروع کرنے سے متعلق ہو یا ملک میں کسی آبی ذخیرے کی تعمیر سے

متعلق، تعلیمی نظام قائم کرنے سے متعلق ہو یا معاشرتی فلاح و بہبود کا نظام قائم کرنا ہو یا پھر قاضیوں کی تعیناتی سے متعلق کوئی معاملہ ہو، ایسے تمام معاملات پر فیصلے کرنے کیلئے آپس میں مشاورت کرنے کا حکم ہے۔لیکن مشاورت کے بعد آخری فیصلہ کرنے کا حق جمہوریت کی بنیاد پر یا اکثریت کی رائے کے مطابق نہیں بلکہ خلیفہ کے پاس ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔تب اس فیصلے کی اطاعت کرنا لازم ہو جاتا ہے۔اس وقت ایک خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنا اور اسکی اطاعت نہ کرنا اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے بغاوت کے مترادف ہے۔

آج کل لوگ کفر کے موجودہ نظام کو اسلام کے مطابق یا اسلامی بنانے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ شراب خانے کو مسجد بنانا چاہتے ہیں۔یہ ناممکن ہے۔کیونکہ شراب خانے کو لازمی طور پر پہلے گرانا پڑے گا اور پھر وہاں نئی مسجد تعمیر ہوگی۔یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس گندگی اور غلاظت میں چیزیں ترتیب سے رکھ کر کہیں کہ اب یہ نماز پڑھنے کی جگہ بن گئی ہے جبکہ غلاظت اپنی جگہ موجود رہے۔اسی طرح سود اور ربا کے نظام کے اندر اسلامی بینکاری کا تختہ نہیں لگایا جا سکتا۔یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ باقی سود کا نظام اپنی جگہ موجود رہے جبکہ الگ سے ایک کھڑکی کھول کر کہا جائے کہ یہ اسلامی بینکاری بن گئی ہے۔یہ دونوں نظام مل ہی نہیں سکتے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موجودہ نظام کو ختم کر کے ایک نیا نظام لایا جائے کہ جس کی بنیاد بیت المال اور اصل زر پر ہو۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟

اسی طرح جو سیاسی نظام خلافت میں نظر آتا ہے، وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔چاروں خلفائے راشدین میں ایک بات مشترک ہے، تاحیات تعیناتی۔جو بھی خلیفہ مقرر ہوا اور وہ راہ راست پر چلنے والا ہوا اور نظام حکومت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق چلائے، جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے کیا، تو اس صورت میں خلیفہ کو معزول نہیں کیا جا سکتا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انتقال فرمایا، حضرت عمرؓ شہید کیے گئے، حضرت عثمانؓ شہید کیے گئے اور حضرت علیؓ بھی شہید کیے گئے، کسی

کو بھی معزول نہیں کیا گیا۔خلافت راشدہ میں قیادت کے حوالے سے جو حکمت ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام میں استحکام ہوتا ہے۔ساتھ ساتھ یہ نظریہ بھی ہے کہ خلافت یا حکمرانی ایک ذمہ داری ہے اور اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔اسی طرح خلافت راشدہ میں معاشرے کا بہترین فرد اتفاق رائے اور اجماع سے خلیفہ مقرر ہوتا تھا۔یوں اسے ہٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔جبکہ آج کے جمہوری سیاسی نظام میں ہر چند سال بعد انتخابات کا ایک فساد برپا کیا جاتا ہے۔

ایک اور تصور خلافت راشدہ میں یہ ہے کہ یہ بات حتمی ہوتی ہے کہ پورے معاشرے کا ایک ہی مقصد حیات ہے، ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن ہے اور ان سب کا نقطہ ارتکاز ملت اسلامیہ کی بہتری اور فلاح ہوتا ہے۔کسی دوسرے غیر اسلامی نظریے کی خلافت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مسلمان معاشرے میں ایک شخص اپنا گروہ بنا کر کہے کہ میں لاطینی اور یونانی نظریہ لے کر آیا ہوں، دوسرا کہے کہ میں جمہوریت لا رہا ہوں، اسی طرح مختلف اشخاص سوشلزم، کمیونزم یا آمریت کیلئے سیاسی جماعتیں بنائیں اور ان سب کے درمیان ایک اسلامی سیاسی جماعت بھی ہو۔خلافت راشدہ میں ایک بات فیصلہ کن نظر آتی ہے کہ جب ایک بار فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ حکم صرف اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا ہے، تو پھر کسی اور کی مرضی نہیں چلے گی اور نہ ہی پھر کسی اور ازم یا کسی دوسری سیاسی اور مذہبی جماعت کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ امت مسلمہ ایک ہی جماعت ہے۔آج کی جمہوریت میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہ سیاسی اور مذہبی جماعتیں بعد میں مذہبی اور سیاسی فرقے بن جاتے ہیں کہ جنہوں نے امت کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

خلافت راشدہ کے پورے عرصہ میں کہ جب تقریباً چین سے لے کر یورپ تک خلافت اسلامیہ پھیل چکی تھی، کروڑ ہا افراد اس میں رہتے تھے، ان سب کا مقصد ایک ہی تھا۔سب ایک ہی ملت اور خلافت کے شہری تھے۔کوئی سیاسی یا مذہبی فساد نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کی سیاسی جماعتیں اور گروہ بندی تھی لیکن اگر کہیں ہوئی بھی ہے تو وہاں مسائل ہی پیدا ہوئے ہیں۔جیسا کہ حضرت علیؓ کی خلافت کو شام والوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔اس پورے عرصہ میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب بھی مسلمانوں میں سیاسی گروہ بندیاں ہوئیں

توامت تقسیم ہونا شروع ہوگئی۔لہذا کوئی بھی سیاسی نظام کہ جس میں خلافت یا مسلمانوں کی مرکزیت کو نقصان پہنچے وہ قیامت تک کیلئے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔اسلام میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا کوئی تصور نہیں ہے جیسا کہ آج کی جمہوریت میں ہم دیکھتے ہیں۔اصل میں یہ طریقہء کار کہ مختلف نظریات،عقائد،قومیت یا لسانیت کی بنیاد پر سیاسی اور مذہبی جماعتیں بنائی جائیں، یہ پورا تصور ہی دین میں حرام ہے۔پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اسی حرام سیاست کا حصہ ہیں۔

۱۹۷۰ء میں بڑی بڑی جماعتوں کا نعرہ ہی یہ تھا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔اس سے بڑا کفر اور شرک اور کیا ہوگا کہ اسلام کے بعد آپکو سیاسی اور معاشی نظام کفر سے لینے پڑیں۔تمام بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے یہی مذاق بنایا ہوا ہے۔کوئی اپنی جماعت کو سیکولر کہتے ہیں تو کوئی لبرل،کوئی سوشلسٹ اور کوئی مارکسسٹ اور کوئی سب نیشنلسٹ یعنی وہ جماعت جو قومیت یا لسانیت کی بنیاد پر قائم ہو۔

اگر خلافت راشدہ کے نظام کو مثال نہ بنائیں تو وہی ہوتا ہے جو آج ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔پاکستان سمیت پوری دنیا میں جدید جمہوریت کے نام پر ایک فساد برپا کیا ہوا ہے۔اسکے ذریعے قوموں کو توڑا جاتا ہے۔''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کا تصور قوم میں انتشار کو ہوا دیتا ہے۔ایک حکومت موجود ہوتی ہے، اسکے باوجود بلاضرورت ایک حزب اختلاف بھی بیٹھی ہوئی ہے اور دونوں کا مقصد امت اور ملت کی خیر نہیں بلکہ صرف ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا ہے۔دوسری بات یہ کہ جو لوگ اسمبلی میں پہنچتے ہیں، ان سب کے نظریے اور رازم مختلف ہوتے ہیں۔اس کے نتیجے میں ملک صوبوں،قومیت اور لسانی بنیادوں پر ٹوٹنا شروع ہوجاتے ہیں اور قوم دائیں بازو اور بائیں بازو کے نظریات میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے اختلافات کے ہوتے ہوئے کوئی معاشرہ مستحکم کیسے ہوسکتا ہے؟ خلافت راشدہ میں ان سارے قومی،لسانی اور نظریاتی تفرقات کو تلوار کی نوک پر ختم کردیا جاتا تھا۔قرآن کی حکمت بھی یہی ہے۔قرآن پاک کی آیت ہے کہ: اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اس میں صرف مذہبی تفرقہ ہی نہیں ہے کہ اپنے آپ کو دیوبندی، بریلوی اور شیعہ،سنی میں تقسیم کرلیا جائے

بلکہ سیاسی تفرقہ بھی ہے کہ جسے سیاسی طور پر دائیں بازو اور بائیں بازو کے فرقے کہا جاتا ہے۔ آج پوری امت اور دنیا اس فساد میں مبتلا ہے۔ خاص طور پر غریب ممالک جیسا کہ ہمارا ملک کہ جہاں پر بیرونی مداخلت بھی بہت زیادہ ہے۔ اس سارے فساد کی جڑ خلافت راشدہ کے نظام کو اپنا کر کاٹی جا سکتی ہے۔ یہ ہمارے آئین میں بھی لکھا ہوا ہے لیکن یہ منافق لوگ اس پر عمل درآمد نہیں کرنا چاہتے۔ آئین میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جو شخص اللہ اور اسکے رسول ﷺ، اسلام اور پاکستان کے نظریے پر یقین نہیں رکھتا، وہ قومی اسمبلی میں داخل ہی نہیں ہوسکتا۔ جبکہ آج پاکستان میں فرقہ وارانہ اور انتہا پسند فسادی جماعتیں، جو دوسرے مسالک کے ماننے والوں کو کافر کہتی ہیں، وہ نہ صرف انتخابات میں حصہ لیتی ہیں بلکہ جیت کر قومی اسمبلی میں بھی پہنچ جاتی ہیں۔

خلافت راشدہ کے نظام سے جو استحکام آتا ہے، وہ کسی اور نظام سے حاصل کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اسکا بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ اگر خلیفہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے تو اسکی پیروی کرنا فرض ہے۔ پھر اسے ہٹانے کی کیا ضرورت ہے؟

The oppressed are allowed once every few years to decided which paticular representatives of the oppressing class are to represent and repress them

Karl Marx

مگر چونکہ ساری سیاسی جماعتیں درحقیقت کٹھ پتلیاں ہیں اور انہیں باہر سے کنٹرول کیا جا رہا ہوتا ہے، لہذا یہ ڈھکوسلہ کیا جاتا ہے کہ چار پانچ سال کے بعد انتخابات ہونگے اور پھر انتخابات کے بعد جمہوریت کے نام پر ایک طوفان بدتمیزی برپا کیا جاتا ہے۔ آج پاکستان کی پارلیمان کو دیکھ لیجیے۔ اربوں روپے خرچ کر کے جو انتخابات ہوئے ہیں اور جو پارلیمان بنی ہے، وہ دہشت گردی کے خلاف ایک بھی قانون پاس نہیں کر سکی۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ڈاکوؤں کی طرح لوٹ مار میں لگے ہوئے ہیں۔ اربوں روپے کی مراعات اور فوائد حاصل کرتے ہیں اور خزانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ ملک کی کیا خدمت کر رہے

ہیں؟ تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ کفر کا نظام ہے، کفر نے اسے مسلط کیا ہے اور وہی چلا بھی رہے ہیں۔ پاکستان کا بیڑہ غرق ہو جائے گا اگر یہ نظام ایسے ہی جاری رہا۔

اب اشتراکیت کی بات کرتے ہیں۔ اشتراکیت میں ریاست نے مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور ساری اپوزیشن ختم کر دی تھی۔ آج دنیا چین کی مثال دے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا چین میں جمہوریت ہے؟ نہیں! بلکہ چین میں ایک جماعت کا کنٹرول ہے۔ انہوں نے یہ تصور عملی طور پر خلافت راشدہ سے لیا ہے کہ ایک ریاست میں ایک ہی نظریہ ہوگا کیونکہ ایک ریاست میں دس نظریات نہیں پنپ سکتے۔ چین نے اس پر سختی سے عملدرآمد کیا ہے۔ مگر روحانیت کا عنصر آج بھی غائب ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اگر دنیا میں کہیں بھی خیر موجود ہے تو وہ خلافت راشدہ سے لی گئی ہے۔ چینی اگر خلافت راشدہ کا سارا نظام اپناتے تو دنیا کی عظیم قوم بن چکے ہوتے۔ لیکن ان میں دین اور روحانیت نہ ہونے کے باعث بہت سی خرابیاں اور فساد موجود ہیں مثلاً یہ بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کے لیے بچے قتل کرتے ہیں اور ملک میں ظلم و ستم برپا کرتے ہیں۔ مگر کم از کم اپنے ملک کو انہوں نے قابو میں رکھا ہوا ہے جسکو جدید الفاظ میں آمریت کہا جاتا ہے۔ ملک کا مقصد اور نقطہ ارتکاز ایک ہے اور جو مخالفت پیدا ہوتی ہے، اسے دبا دیا جاتا ہے اور بعض اوقات تو نہایت سختی سے دبایا جاتا ہے۔

اسی طرح بھارت کی مشرقی ریاستوں میں برسوں سے اشتراکی حکومتیں قائم ہیں مگر اب وہ اسلامی معاشی

نظام کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اسلامی نظام اتنا مستحکم اور مضبوط ہے کہ اسی کی بنیاد پر ہم دولت کی تقسیم کا نظام چلائیں گے۔ لہذا اسلامی معاشی نظام کو اپنایا جائے۔ اسلامی نظام سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کے مقابلے میں ایک متوازن نظام ہے۔ ان دونوں نظاموں نے اسلامی نظام سے کچھ باتیں نکال کر اپنے اپنے نظام کھڑے تو کیے ہیں مگر اسلامی نظام مکمل خود کار ہے۔ اسلام نے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام سے کچھ نہیں لیا۔ لیکن ان دونوں نے اسلام سے ضرور سیکھا ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ جمہوریت میں بھی اسلام ہے، بالکل جہالت کی بات ہے۔ درحقیقت اسلام میں جمہوریت ہے۔ مگر اسلامی جمہوریت کا نظریہ مغربی جمہوریت کے نظریے سے، جو کہ آج مغرب نے دنیا پر مسلط کیا ہوا ہے، بالکل مختلف ہے۔ پورے پاکستان کا مقصد حیات ایک ہے۔ ایسا شخص جو پاکستان کے نظریے پر یقین ہی نہیں رکھتا اور دوسرے ازم جیسے کیپٹلزم، کمیونزم، سوشلزم اور مارکس ازم کو مانتا ہے تو اسے پاکستان میں رہنے کی تو اجازت ہے مگر حکومت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکستان اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ یہاں مختلف ازم یعنی سوشلزم، کیپٹلزم اور کمیونزم وغیرہ نافذ کیے جائیں بلکہ یہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم پر بنا تھا اور انکے نظام کو نافذ کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اسکے علاوہ کوئی اور نظام رائج کرنے کی اجازت نہ تو اللہ دیتا ہے اور نہ ہی اسکے بندے۔ خلافت راشدہ میں بھی اسکی اجازت نہیں تھی اور پاکستان کا آئین بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن حکمرانوں کے منافق ہونے کے باعث اس آئین کو نافذ نہیں کیا جاتا۔

آج کے دور کے جاہل خلافت کو آمریت کا نام دے کر گالی دیتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک مستحکم، معتبر اور بامعنی نظام ہے کیونکہ یہ نظام ظلم پر نہیں بلکہ روحانیت اور شورائیت پر مبنی ہے۔ خلیفہ آمر ہے ہی نہیں، اس لیے کہ وہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو جوابدہ ہے۔ جبکہ آمر وہ ہوتا ہے کہ جو اپنے علاوہ کسی کی نہیں سنتا اور اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ خلیفہ فرد واحد ضرور ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم کا پابند ہوتا ہے اور کھلے عام انکے حکم کو تسلیم کرتا ہے۔ سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ، سب نے یہی کیا۔ اگر ہم خلافت راشدہ کے نظام کے دس فیصد یا بیس فیصد حصے کو بھی اپنالیں تو بہت بڑی بات ہوگی۔ لیکن ان

شاءاللہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ نے قائم ہونا ہے۔ یہ جو آج کا جمہوری نظام ہے اس پر عملی طور پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ کیا ہمیں سیاسی جماعتوں کی ضرورت ہے؟ ایک اسلامی معاشرے میں یہ تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں ختم ہو جائیں گی۔ اسکے ساتھ ساتھ علاقائیت، لسانیت، قومیت اور ''ازم'' پر مبنی جماعتیں بھی ختم کر دی جائینگی۔ جو اسلام کے نظریے پر یقین نہیں رکھتے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے دین کا نفاذ ان کا مشن اور مقصد نہیں ہے، تو پھر انہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ پھر آزادیء افکار اور آزادیء اظہار کے تصورات فتنہ بن جاتے ہیں۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست اور دیں
کنیز اہرمن و دوں نہار و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

اقبالؒ کے الفاظ میں فکر اگر خام ہو تو آزادیء افکار، محض انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے۔ یہ خام فکر اور منتشر سوچ رکھنے والے لوگ مختلف قسم کے ازم اور نظام لے کر آتے ہیں اور پھر آزادیء اظہار اور آزادیء افکار کے نام پر رائے دیتے ہیں کہ ہمیں اس ملک پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کا اور پوری قوم کو گمراہ کرنے کا حق ہے۔ مگر خلافت میں کبھی بھی اسکی اجازت نہیں تھی۔ اسکے برعکس خلافت میں ایک ہی چیز ہے کہ اسلام قبول کر لو یا جزیہ دے دو۔ جزیہ دینے سے مراد یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا ہے، یعنی جو ہم کہیں گے، وہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ البتہ نجی طور پر تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ چاہے کوئی یہودی، ہندو یا عیسائی ہو، اسے پوری مذہبی آزادی حاصل ہے، مگر اسکی عزت اور جان و مال کی حفاظت کرنے کے عوض اس سے ٹیکس لیا جائے گا۔ اسلامی معاشرے میں اگر کوئی شریعت کے مقابلے پر اپنا قانون لانے کی کوشش کریگا تو پھر اس کا فیصلہ تلوار کرے گی۔

ان شاءاللہ، پاکستان میں بھی آئندہ یہی ہونا ہے کہ اگر کوئی پاکستان کے نظریے پر یقین نہیں رکھتا، اللہ اور

اسکے رسول ﷺ کے اصولوں پر عمل درآمد نہیں کرتا، اس قسم کے قوانین بنانا چاہتا ہے کہ معیشت سوشلزم یا کمیونزم پر ہو اور وہ قومیت، لسانیت اور صوبائیت کی بنیاد پر اپنی سیاست کرنا چاہتا ہے تو تلوار کی نوک پر اس سے نمٹا جائیگا۔ ہمیں اس پہ کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ ہم کھلے عام کہتے ہیں کہ ایک اسلامی معاشرے میں کہ جہاں خلافت راشدہ کا نظام قائم ہو، وہاں نہ تو کوئی سیاسی و مذہبی جماعتیں ہونگی اور نہ ہی مغربی جمہوری انتخابات ہونگے۔ وہاں انتخابات ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اگر خلیفہ عاجز یا معذور ہو جائے یا شہید کر دیا جائے یا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے راستے سے بھٹک جائے تو اسی صورت میں صاحب علم لوگوں کی شوریٰ کے ذریعے نیا خلیفہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ خلافت راشدہ میں ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جب تک خلیفہ زندہ ہیں انہیں تبدیل نہیں کیا گیا۔ جب وہ شہید ہوئے ہیں تبھی نئے خلیفہ کا انتخاب کیا گیا۔

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے، تو واضح ہونا چاہیے کہ اسلام میں مغربی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام میں اپنی جمہوریت، اپنا اجماع اور اپنی شورائیت ہے۔ اسلام میں اکثریت کی حکومت کا تصور بالکل نہیں ہے۔ Democracy (جمہوریت) کا لفظ بذات خود Demonstration (مظاہرہ کرنا) سے نکلا ہے، جس کے معنی Mob یعنی ''جلوس'' کے ہیں۔ یہ درحقیقت لاطینی زبان سے نکلا ہوا لفظ ہے۔ اسکا مطلب mob rule ہے یعنی ہجوم کی حکومت۔ mob کہتے ہیں ایسے جلوس کو کہ جو آوارہ ہو چکا ہو۔ تو اصل میں جمہوریت کا مطلب ہے mob کی حکومت یعنی ایک ایسے دیوانے جلوس کی حکومت کہ جسکے پاس عقل اور ہوش نہیں ہے اور یہی جمہوریت آج ہمیں پاکستان میں بھی نظر آتی ہے۔

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

تو جمہوریت میں اللہ کے نیک بندوں کی حکومت نہیں بلکہ دیوانے اور جنونی ہجوم کی حکومت ہوتی ہے۔اس ہجوم میں کوئی ڈاکو، منشیات فروش، ملک دشمن، صیہونی سرمایہ دار، جاگیردار، بینکار یا ملک وقوم کا باغی بھی ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر بےنظیر بھٹو کے انتقال کی خبر سن کر اسی طرح کے ہجوم نے ملک وقوم کو جلا کر رکھ دیا تھا۔جب ایسے ہجوم کو حکومت دے دی جائے تو اسے جمہوریت کہتے ہیں۔ملک کو جلانے والوں کے خلاف کوئی تفتیش نہیں گئی کہ یہ سب کچھ کیا کس نے۔یہ ہے mob۔ان کا انسانیت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔بنیادی سطح پر بھی انسانیت ایسے نظام کو مسترد کرتی ہے کہ جہاں اتنی افراتفری ہو اور تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کی ڈوریں باہر سے ہلائی جاتی ہوں۔جب سیاسی جماعتیں ہونگی ہی نہیں تو دشمن کس پر سرمایہ لگائیں گے؟اس بات پر وہ لوگ بھڑک جاتے ہیں کہ جن کے اس نظام میں ذاتی مفادات پوشیدہ ہیں۔ان لوگوں کے حلق خشک ہوگئے ہیں یہ چیختے چیختے کہ جمہوریت ہی ملک کا واحد اور آخری راستہ ہے۔وہ جمہوریت کہ جس میں مغرب، بھارت اور روس سرمایہ کاری کریں، جہاں باہر کی طاقتیں قومیت اور لسانیت کی بنیاد پر دخل دیں تو ایسی جمہوریت امت کے لیے زہر قاتل ہے۔اسی طرح اگر ہم پاکستان کو سیاسی و مذہبی جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں تو یہ پاکستان کے لیے بھی زہر قاتل ہے۔ہم ایک امت ہیں، ہمارا ایک نظریہ ہے اور وہ ہے اسلام۔ ہماری تنظیم ہے ''پاکستان''۔اسکے علاوہ اس میں کسی اور ازم، نظریے، سیاسی و مذہب جماعت اور فرقے کی گنجائش نہیں ہے۔

الجزائر میں ۱۹۹۰ء کے قریب انتخابات کروائے گئے کہ جسکے نتیجے میں وہاں کی اسلامی جماعت ۹۰ فیصد ووٹ لیکر جیت گئی۔اس اسلامی جماعت نے اعلان کر دیا کہ آئندہ سے الجزائر کا آئین قرآن وسنت پر مبنی ہوگا اور وہ خلافت راشدہ کا نظام بنے گا۔اب انتخابات اور تمام سیاسی جماعتیں ختم کردی جائیں گی۔ انہوں نے اوپر آنے کے لیے اسی نظام کو استعمال کیا اور وہ اپنے اسلامی منشور کی وجہ سے اتنے مشہور ہوئے کہ انتخابات جیت گئے۔نتیجتاً امریکہ اور سی آئی اے نے الجزائر کی فوج کی مدد سے نومنتخب اسلامی حکومت کا

تختہ الٹ دیا۔ اسلامی جماعت کو کچل کر رکھ دیا گیا اور وہاں دوبارہ ایک آمر کو لا کر بٹھا دیا گیا۔ آج بھی وہاں کوئی انتخابات نہیں ہوتے۔ تو جہاں جہاں ان عالمی طاقتوں کے مفادات کو زد پہنچتی ہے تو وہاں پر یہ جمہوریت کو بھی ترک کر دیتے ہیں اور آمریت مسلط کر دی جاتی ہے اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی آمر سخت ہونے لگا ہے، مثال کے طور پر پاکستان کا کوئی آمر پاکستان کے مفاد میں کام کرنے لگا ہے، تو پھر وہاں پر ان کو جمہوریت یاد آ جاتی ہے۔

پاکستان میں عملی طور پر دو حکمرانوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ پہلے ''جمہوری'' ذوالفقار علی بھٹو اور دوسرے ''آمر'' جنرل ضیاء الحق۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمران جمہوری ہو یا آمر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ ملک وقوم کے مفاد میں کام کرے۔

ذوالفقار علی بھٹو بھی جمہوری طور پر منتخب ہونے کے بعد ملک کے حکمران بن گئے تھے۔ وہ خارجہ حکمت عملی کے حوالے سے اچھا کام کر رہے تھے مگر وہ اپنی داخلی پالیسیوں، دین سے دوری، انتقامی سیاست اور عوام کے غصے کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا تھا۔ البتہ ان کی خارجہ پالیسی بہترین تھیں مثلاً اسلامی کانفرنس بلائی، پاکستان کا جوہری پروگرام شروع کیا، افغانستان کے مسئلے پر سخت موقف اختیار کیا، روس اور چین سے تعلقات استوار کیے اور اسلامی اتحاد کی بات بھی کی تھی، حتیٰ کہ آئین میں قادیانیوں کو کافر بھی قرار دیا تھا۔

بالکل اسی طرح کے کام جنرل ضیاء الحق نے بھی کیے۔ خارجی معاملات بہترین تھے۔ ان سے بہتر خارجہ پالیسیاں پاکستان کی تاریخ میں کبھی نہیں بنیں۔ اگر موازنہ کیا جائے تو ظاہری طور پر ایک فوجی حکمران ہے اور دوسرا جمہوری۔ ذوالفقار علی بھٹو کو نظام مصطفیٰ کی تحریک چلا کر نکالا گیا کہ جس میں دین سے متعلق عوامی جذبات کا فائدہ اٹھایا

گیا، کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دین کا بیڑا غرق کر دیا گیا تھا۔جگہ جگہ شراب خانے کھل گئے تھے اور لوگوں کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی تھی۔ان کے وزراء عزت وآبرو لوٹنے میں مشہور تھے خصوصاً پنجاب کا ایک گورنر۔انہوں نے خود بھی اپنے اردگرد اس قسم کے لوگ اکٹھے کر لیے تھے اور ایسی پالیسیاں بنائی تھیں کہ جس کے نتیجے میں انکے خلاف نظام مصطفیٰ کی تحریک چلائی گئی۔اسی طرح جنرل ضیاء الحق اندرونی اور بیرونی معاملات میں مضبوط ہو چکے تھے۔انکو کسی عوامی جلوس یا احتجاج سے نکالنا ممکن نہ تھا۔لہذا دشمنوں نے انہیں شہید کر دیا گیا۔رااور موساد کو دراندازی کر کے انکا جہاز تباہ کروانا پڑا۔ حکمران دونوں ہی بہت مضبوط تھے اور دونوں اپنی مرضی کے آگے کسی کی نہیں مانتے تھے، جو کہ بالکل ٹھیک تھا کیونکہ اسکے نتیجے میں ملک میں استحکام ہو گیا تھا۔عملی طور پر وہ کام جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں شروع ہوئے،انہیں جنرل ضیاء الحق کے دور میں مکمل کر لیا گیا تھا۔کیونکہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے دونوں حکمرانوں کی سمت بالکل ٹھیک تھی۔سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ضیاء الحق کے دور کے بعد ۱۹۸۸ء سے لیکر ۲۰۰۱ء تک بارہ پاکستانی حکومتیں تبدیل ہوئیں۔اور اس دوران پاکستان تباہ وبرباد ہو گیا اور کوئی تعمیری کام نہیں کیا گیا۔اسکے برعکس کرپشن کے الزامات کے باعث ہر دو،دو سال بعد حکومت بدلتی رہی ہے۔خائن اور منافق سیاسی جماعتوں کی وجہ سے ملک بکھر کر رہ گیا۔

پھر ۱۹۹۹ء میں جنرل مشرف کی حکومت آئی۔اسکی حکومت کا المیہ یہ تھا کہ نہ تو وہ مکمل آمر بنا اور نہ ہی جمہوریت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا۔اس نے جمہوری حکمرانوں کی طرح آزادی دے دی اور بظاہر وردی پہن کر آمر بنا رہا۔یوں نہ ہو تو آمریت سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جا سکا اور نہ ہی جمہوریت سے اور ایک بے ترتیب سیاسی نظام وجود میں آیا کہ جس نے پاکستان کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

یہ تمام باتیں اور صورتحال صرف ایک چیز کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ پاکستان کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہے،خاص طور پر اس وقت کہ جب چاروں طرف سے پاکستان کو توڑنے کیلئے نظریاتی اور

عسکری حملے کیے جارہے ہیں۔آج جبکہ پاکستان میں سرحدوں کے اندر جنگ جاری ہےتو کیا ایسی آوارہ جمہوریت پاکستان کا دفاع کرسکتی ہے؟ آج ملک میں فوجی یا سویلین تفریق سے بالاتر مضبوط کمانڈ اینڈ کنٹرول کی حامل حکومت کی ضرورت ہے کہ جو پاکستان کے نظریے پر یقین رکھتی ہو۔ذوالفقارعلی بھٹوجیسا مضبوط سویلین لیڈر ہومگر دین کوساتھ رکھے یا جنرل ضیاء الحق جیسا مجاہدفوجی۔کسی سیاسی یامذہبی جماعت کی ضرورت نہیں ہے۔صرف ایک جماعت کی ضرورت ہےاوروہ ہے''اسلام''۔قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ اللہ نے تمہارانام مسلمان رکھاہے۔اسکے بعدہمیں کسی قسم کی دوسری جماعت میں تقسیم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ہماری تنظیم کانام''پاکستان'' ہے۔اسکے بعدسندھی،مہاجر،بلوچی اور پنجابی تعصب میں تقسیم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب تعصّبات شرک اورکفر ہیں جوکہ امت وملت کوتقسیم کررہے ہیں۔جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے''قل ھواللہ احد'' کی بہت خوبصورت تعریف یہ دی تھی کہ''جواس امت،اس ملت کوکسی گروہ،جماعت یانسل میں تقسیم کرتاہے،وہ شرک کرتاہے''۔یہاں کوئی مذہبی شرک کررہاہے،کوئی سیاسی شرک کررہاہے،کوئی علاقائی اورصوبائی شرک کررہاہے۔جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم متحد ہوں۔کیونکہ ہم ایک ملت اورایک امت ہیں۔اسکی سب سے مسحورکن مثال ہمیں خلافت راشدہ میں ہی نظر آتی ہے۔سیدناابوبکرصدیقؓ،سیدناعمرؓ،سیدناعثمانؓ اورسیدناعلیؓ نے،اس بات کے باوجود کہ اُس وقت کی ملت اسلامیہ اس پاکستان سے دس گنازیادہ بڑی تھی،مسلمانوں کوایک متحد ملت بناکررکھا۔وہاں کوئی سیاسی و مذہبی جماعت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی دوسراازم موجودتھا۔اوریہی بنیادی وجہ تھی کہ وہاں کوئی انتشارو افراتفری نہ تھی۔وہاں تین چارسال بعدانتخابات کروانے کابھی کوئی تصورنہیں پایاجاتا تھا۔وہاں پرسب نظام انتہائی سادہ تھے۔آئندہ خلافت راشدہ کےعدالتی اورمعاشی نظام کا جائزہ لیاجائے گاتو آپ دیکھیں گے کہ وہ نظام کس قدرفطری تھے۔

اب امریکہ کے نظام کودیکھیے۔وہ''خلیفہ'' کی جگہ براہ راست صدرمنتخب کرتے ہیں۔انہوں نے چارسے پانچ سال تک صدرکی مدت مقررکردی ہے۔عملی طورپرامریکہ کا صدریابادشاہ آکراپنی مرضی کے چھ سات ہزارافراد،یعنی اپنی شوریٰ لیکرآتاہے۔یعنی خلافت راشدہ سے انہوں نے کچھ اصول ضروراپنائے ہیں۔اسی لیے علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ میں مغرب میں گیا تو مجھے وہاں مسلمان نظرنہیں آئے لیکن اسلامی نظام

جگہ جگہ نظر آیا اور جب میں یہاں آیا تو مجھے مسلمان بہت نظر آئے مگر اسلامی نظام نظر نہیں آیا۔

ہم نے قرون اولیٰ* کی سیریز میں یہ بات ثابت کی تھی کہ آج پوری دنیا میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی موجود ہے، وہ دراصل مسلمانوں کی تحقیق کردہ ہے اور مغربی لوگ اسے اپنے نام سے آگے چلاتے ہیں۔اسی طرح معاشی نظام اور سیاست کی صورت میں بھی اگر کوئی خیر دنیا میں موجود ہے تو وہ خلافت راشدہ سے اٹھائی گئی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کفر کا نظام اپنا لیں کہ اس میں اسلام کے کچھ عناصر موجود ہیں۔نہیں! ہمیں ''اسلامی سوشلزم'' اور ''اسلامی جمہوریت'' نہیں چاہیے بلکہ مکمل اسلام چاہیے۔خلافت راشدہ ایک مثالی نمونہ ہے۔اسکے سیاسی نظام میں حکمران براہ راست مقرر ہوتا ہے۔اس میں کوئی ناپاک اور پلید لوگوں کی پارلیمان نہیں ہوتی بلکہ اہل علم اور متقی لوگوں کی شوریٰ ہوتی ہے۔خلیفہ کا تاحیات انتخاب کیا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں اور قومیت، لسانیت اور فرقہ واریت پر مبنی انتخابات کا کوئی تصور نہیں ہے۔اس وجہ سے معاشرے میں کوئی فساد پیدا نہیں ہوتا۔اگر پاکستان میں وہ نظام قائم ہو جائے تو ملک میں سکون ہو جائیگا۔ملک جنت بن جائیگا۔

* قرون اولیٰ سیریز ٹی وی ون پر نشر ہونے والا راقم کے پروگراموں پر مشتمل ایک تاریخی سلسلہ تھا کہ جس میں مسلمانوں کی شاندار سائنسی وفنی خدمات اور مسلمانوں کے عروج اور عظمت رفتہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۱۰

خلافت راشدہ اور پاکستان کا نظام حکومت

خلافت راشدہ کے سیاسی نظام اور پاکستان کے استحکام کے حوالے سے جو سوال سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس نظام میں سول اور فوجی اداروں کا کیا کردار ہے؟ پاکستان میں ہمیشہ یہ بحث جاری رہی ہے کہ جمہوریت ہونی چاہیے یا فوجی آمریت۔ اسکے لیے بھی ہمارے پاس خلافت راشدہ کی مثال موجود ہے کہ اس دور میں خلیفہ سیاسی حکمران بھی تھے اور فوجی سپہ سالار بھی۔ اس دور میں ہر شعبہ میں انسانیت اپنے عروج پر تھی۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ تاریخ انسانیت میں اس سے بہتر کوئی اور نظام آئے۔ آج تک نہ آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔ ان کا یہ نظامِ ریاست صرف مدینہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ ریاست چین سے لیکر سپین تک پھیلی ہوئی تھی۔ بیس سے پچیس کروڑ کی آبادی تھی جو کہ اس نظام کے زیرسایہ رہا کرتی تھی۔ اس میں دنیا کے ہر مسلک اور مذہب کے لوگ تھے۔ اس وقت کی دنیا کی تمام لسانی اور نسلی قومتیں یعنی یورپی اقوام سے لیکر چینی قوم تک اس حکومت میں بسا کرتی تھی۔ یہ بات ایک غیر معمولی حقیقت ہے کہ جب انسانیت کا اتنا بڑا نظام چلایا جاسکتا ہے تو اس نظام کو آج کے علم سیاسیات سے کیوں غائب کر دیا گیا ہے؟ اس نظام پر تحقیق کیوں نہیں کی جاسکی کہ اس نظام کو کس طرح چلایا جاتا تھا؟ جیسے کہ پچھلے باب میں ہم نے بحث کی تھی کہ خلافت راشدہ کے سیاسی نظام میں کوئی سیاسی و مذہبی جماعتیں اور انتخابات نہیں ہوا کرتے تھے یعنی آج کے دور میں اگر یہ کہا

جائے کہ آج کے پاکستان کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک نیا سیاسی نظام تیار کرنے کی ضرورت ہے، جو اسکے مزاج کے مطابق ہو، تو یہ لوگ ذہنی طور پر اس موجودہ فرسودہ نظام کے اتنے غلام بن چکے ہیں کہ انہیں جمہوریت کے علاوہ کچھ سُجھائی ہی نہیں دیتا ہے۔ یہاں بحث صرف اس بات تک محدود رہتی ہے کہ سیاسی نظام جمہوریت ہو یا مارشل لاء۔ حالانکہ خلافت راشدہ نہ جمہوریت ہے اور نہ ہی مارشل لاء بلکہ وہاں سیاسی وفوجی حکومت ایک ہی مرکز پر جمع ہو جاتی ہے۔

یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مغربی جمہوریت ہو یا مارشل لاء، یہ دونوں مغرب کے مسلط کردہ نظام ہیں جو کہ انہوں نے غلام قوموں کو غلام رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ ایک طرف تو ہمیں یہ کہا جاتا کہ آپ مغرب کی جمہوریت نافذ کردیں کہ جس میں سینکڑوں سیاسی و مذہبی جماعتیں موجود ہوں کہ جو امت کو قومیت اور لسانیت کی بنیاد پر تقسیم کر کے ملک وملت میں فتنہ وفساد برپا کردیں۔ بے شمار ''ازم'' موجود ہوں جو نظریاتی اور فکری انارکی برپا کر کے قوم وملت کو مزید تقسیم کریں اور یہ تمام صورتحال پیدا کرنے کے بعد انتخابات کروائے جائیں کہ جس میں تمام دشمن طاقتیں اپنے اپنے عناصر اور وطن فروشوں پر سرمایہ کاری کر کے افراتفری اور بدنظمی پیدا کریں۔ جب بدانتظامی اور فساد حد سے بڑھ جاتا ہے تو فوج کو مجبوراً دخل دے کر مارشل لاء لگانا پڑتا ہے۔ مگر یہ مارشل لاء بھی نظام تبدیل کرنے کیلئے نہیں بلکہ نظام کو سنبھالنے کیلئے آتا ہے۔ لہٰذا نہ تو سیاسی نظام تبدیل کیا جاتا ہے، نہ ہی معاشی نظام اور نہ ہی عدالتی نظام۔ کچھ عرصہ کے بعد مارشل لاء رخصت ہو جاتا ہے اور سب کچھ دوبارہ اس جمہوری تماشے کے حوالے کردیا جاتا ہے اور یوں قوم اس دائمی چکر میں پھنسی رہتی ہے۔

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس!

ہم اس نظام کو مسترد کرتے ہیں۔ اس نظام کو خلافت راشدہ سے تبدیل کرنے کا وقت آچکا ہے۔ سب سے پہلے پاکستان کے تین بڑے بڑے نظام تبدیل ہونے والے ہیں۔ پہلا پاکستان کا سیاسی نظام ہے کہ جس کا تبدیل ہونا ضروری ہے، یعنی یہ پورا جمہوری پارلیمانی نظام بدل کر ایک ایسا سیاسی نظام لایا جائے کہ

جس کی بنیاد شورائیت اور شریعت پر ہو۔

دوسرا نظام معاشی نظام ہے جو کہ تبدیل ہونے والا ہے، کہ جس کی بنیاد سود اور ربا پر قائم ہے۔ پورا معاشی نظام ہی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے خلاف حالت جنگ میں ہے۔

تیسرا نظام عدالتی نظام ہے۔ پاکستان پر آج بھی ۱۸۶۰ء میں انگریزوں کا بنایا ہوا عدالتی نظام مسلط ہے کہ جس کی بنیاد (Anglo-saxon Law) یعنی قدیم رومی قانون پر ہے۔ پورا ملک دہشت گردی اور جنگ کی لپیٹ میں ہے مگر بارہ سال گزرنے کے باوجود ملک میں ایک بھی دہشت گرد عدالتی نظام کے تحت پھانسی پر نہیں چڑھایا جا سکا جو کہ اس ناپاک عدالتی نظام کی تباہی کی زندہ مثال ہے۔ اسکے بعد سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ساتھ ساتھ کروڑوں روپے فیس لینے والے وکیلوں، عدالتوں اور ان تمام کتب خانوں کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ جہاں ہزاروں کی تعداد میں برطانوی قانون سے متعلق کتابیں موجود ہیں کہ جن کو پڑھا کر قانون سازی کی جاتی ہے اور عدلیہ کا نظام چلایا جاتا ہے۔

> "In the absense of justice, what is sovereignty but organized robbery."
> **St. Augustine**

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں سیاست میں یہ قدیم بحث ہے کہ حکومت فوج کی ہونی چاہیے یا جمہوری اداروں کی؟ ذہنیت یہ بنا دی گئی ہے کہ اگر فوجی حکومت ہوئی تو ملک تباہ و برباد ہو جائیگا اور یہ کہ اگر فوج کے افراد حکومت کرنے لگیں تو یہ انسانیت کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہوگا۔ اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم فوجی حکومت کا دفاع کر رہے ہیں۔ ہم کسی صورت میں بھی مارشل لاء کی حمایت نہیں کرتے۔ ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ حکومت مارشل لاء ہو یا جمہوری، دونوں میں نظام وہی کافرانہ رہتا ہے۔

ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خلافت راشدہ میں کیا ہوتا تھا؟ کیا وہاں جمہوری یا فوجی حکومتیں الگ الگ دو وجود رکھتی تھیں؟ خلافت راشدہ میں سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں کوئی سیاسی یا فوجی طاقت الگ الگ نہیں تھی۔ اسلام کی پوری تاریخ میں ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین

روحانی سربراہ بھی ہیں، سیاسی سربراہ بھی ہیں اور فوج کے سپریم کمانڈر بھی۔آپ تمام غزوات اور جہاد کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، کمانڈر انچیف حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین بذات خود ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ کا یہ ایک کمال ہے۔

حضرت عیسیٰؑ صرف محبت و پیار لے کر آئے تھے اور آپؑ نے حکومت سازی نہیں کی تھی بلکہ حضرت موسیٰؑ کی لائی ہوئی شریعت کی ہی تجدید کر کے اس میں اپنی محبت و نرمی شامل کر دی تھی۔ دوسری طرف ایسے انبیاء بھی گزرے ہیں کہ جو جنگجو بادشاہ تھے، جیسے حضرت سلیمانؑ ۔ ماشاء اللہ، کائنات میں جیسی حکومت حضرت سلیمانؑ کو ملی ویسی کسی اور کو نہیں ملی۔ ہوا، چرند، پرند اور جنات پر بھی انکی حکومت تھی۔ چیونٹیوں کی زبان بھی آپؑ سمجھتے تھے۔قرآن میں ہدہد کا واقعہ موجود ہے کہ جب وہ پرندہ ملکہ سباء تک پیغام لے کر پہنچا۔لہٰذا ان کے پاس سراغ رساں جانور اور جنات تھے کہ جو ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔جیسا کہ ملکہ سباء کے تخت والا واقعہ جو کہ قرآن میں بھی بیان ہوا ہے۔تو بڑے بڑے انبیاء بھی بادشاہ گزرے ہیں کہ جن کے پاس بہت زیادہ سیاسی و روحانی طاقتیں ہوا کرتی تھیں۔حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ میں تمام انبیاء کی جامع صفات اور کمالات موجود ہیں۔ایک ایسا مبارک وجود کہ جنکی مثال کائنات نہیں دی سکتی۔آپ ﷺ وجہ تخلیق کائنات ہیں۔حضور ﷺ روحانی مرشد بھی ہیں، سیاسی حکمران بھی اور فوجی سپہ سالار بھی۔آپ ﷺ کی سنت مبارکہ میں فوجی اور سیاسی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی طرح خلافت راشدہ حضور اکرم ﷺ کی سنت کی عکاس ہے۔ جو تربیت حضور ﷺ نے خلفائے راشدین کی فرمائی، وہ ہمیں ان کے کردار میں صاف نظر آتی ہے۔خلفائے راشدین کی اطاعت اور اتباع کرنا دین میں واجب ہے۔اگر کوئی سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ کی بات ماننے سے انکاری ہو تو ایسا شخص دائرہ اطاعت سے نکل جاتا ہے۔کیونکہ انکی بات ماننا بالکل اسی طرح واجب ہے کہ جس طرح حضور اکرم ﷺ کی بات ماننا واجب ہے۔حضور اکرم ﷺ کا حکم بھی ہے کہ تم نے میری اور خلفائے راشدین کی اتباع کرنی ہے۔ اس پر مفصل احادیث مبارکہ موجود ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ

خلفائے راشدین نے اپنا سیاسی نظام کیسے چلایا تھا؟

یہاں ایک حیرت انگیز بات جاننا بہت ضروری ہے کہ قرآن پاک میں آیا ہے کہ یہودی حضور اکرم ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں کہ جیسے اپنے بچوں کو پہنچاتے ہیں مگر جان بوجھ کر مخالفت کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں اور آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں وہ سب سچا ہے۔ لہٰذا آج اگر آپ اسرائیل کی ریاست کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے کئی نظام حضور اکرم ﷺ کی سنت پر بنائے ہیں۔ ہم یہاں انکے ظلم کی بات نہیں کر رہے کہ جو وہ مسلمانوں پر ڈھاتے ہیں بلکہ ہماری مراد ان کے دفاعی نظام سے ہے۔ اسکی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ گولڈا میئر اسرائیل کی وزیراعظم گزری ہے۔ اسکے دور میں اسرائیل کے پاس پیسے نہیں تھے اور اسکی عوام بھوکی مر رہی تھی جبکہ گولڈا میئر بہت بھاری تعداد میں پوری دنیا سے اسلحہ خریدنا چاہتی تھی۔ اس وقت کے ایک صحافی نے اسکے مرنے کے بعد یہ خبر چھاپی کہ اس نے گولڈا میئر سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں اور تمہاری قوم بھوکی مر رہی ہے مگر پھر بھی تم اسلحہ کیوں خرید رہی ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر اسکا جواب دونگی کہ میری زندگی میں یہ بات کسی کو نہ پتہ چلے، میرے مرنے کے بعد اسکو شائع کرنا۔ اس صحافی نے مان لیا۔ گولڈا میئر کہتی ہے کہ جب میں نے مسلمانوں کے نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ دیکھا کہ جب حضور اکرم ﷺ نے انتقال فرمایا تو آپ ﷺ کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا مگر دیوار پر کئی طرح کی تلواریں، تیر، کمان اور نیزے لٹکے ہوئے تھے۔ اس سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ قوم بھوکی تو رہ سکتی ہے لیکن اپنے دفاع پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح یہودی بھی حضور اکرم ﷺ کی سنت سے سیکھتے ہیں۔

گولڈا میئر

خلافت راشدہ میں فوجی اور سول حکمرانوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہاں پر مسلمان فوجی بھی تھا اور سویلین بھی۔ اسی طرح اسرائیل نے بھی بالکل یہی نظام رائج کر رکھا ہے۔ اسرائیل کی کل آبادی تقریباً تیس سے

چالیس لاکھ ہے مگر انہوں نے پورے ملک کے نوجوانوں کو فوج کا اضافی دستہ بنا دیا ہے۔ باقاعدہ فوج ہونے کے باوجود، باقی پورا ملک بھی ضرورت کے وقت فوج بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یعنی چالیس لاکھ کی آبادی میں سے جنگ کی صورت میں پچیس لاکھ کی فوج کھڑی کر لیتے ہیں۔ ایک آدمی جو کہ تاجر اور دوکاندار ہے وہ ساتھ ساتھ میجر ، کرنل یا کیپٹن بھی ہے۔ وہاں پر سویلین ملٹری کا کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ایک اسرائیلی شہری مکمل فوجی تربیت لیتا ہے اور

ساتھ ساتھ ایک عام سویلین کی حیثیت سے بھی زندگی گزارتا ہے اور جب کوئی بحران کھڑا ہوتا ہے تو میجر، کرنل اور بریگیڈیئر کے رینک لگا کر وہ فائٹر پائلٹ، سپاہی اور ٹینک کمانڈر بن جاتا ہے۔ اس نظام میں سول اور ملٹری کا فرق کہاں ہے؟ اسرائیل کے تقریباً تمام حکمران سابق فوجی ہیں۔ کوئی ایئر فورس کا جنرل ہے تو کوئی آرمی کا جنرل، کوئی نیوی کا ایڈمرل ہے اور کوئی سپاہی، میجر اور کرنل ہے۔ کیونکہ ہر سویلین فوجی اور ہر فوجی سویلین کی ڈیوٹی کر سکتا ہے، انکو کوئی نہیں کہتا کہ یہ حکومت فوجی ہے یا سویلین۔

خلافت راشدہ میں بھی ہم اس بات کو غیر معمولی طور پر دیکھتے ہیں کہ ہر مسلمان ایک سویلین ہے اور وہی مسلمان ایک سپاہی بھی۔ یہ حیرت انگیز نظام ہے۔ باقاعدہ فوج کی آج بے شک ضرورت ہے کیونکہ ہتھیار جدید ہو گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ ہر مسلمان اور ہر پاکستانی ایک سپاہی بھی ہو ملک و قوم کا دفاع کرنے کے لیے، جیسا کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں ہر قبائلی اپنے قبیلے کے لیے ایک سپاہی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ کیا قبائلی علاقوں میں فوجی اور سویلین کا کوئی فرق ہے؟ اگر کوئی خطرہ درپیش ہو تو ہر مرد حتیٰ کہ عورتیں بھی ہتھیار اٹھا لیتی ہیں اور سپاہی بن جاتی ہیں۔

اسی طرح چین میں بھی یہ فرق نہیں ہے۔ چین میں ہر آدمی کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ چینی فوج میں جا کر ملک کی خدمت کرے اور اپنی ڈیوٹی قوم کی طرف ادا کرے۔ اسی طرح کئی ممالک میں لازمی فوجی تربیت ہوتی

ہے۔ترکی اور ایران ہمارے برادر اسلامی ملک ہیں کہ جہاں پر بھی پوری قوم کے نوجوانوں کیلئے فوج میں بھرتی ہو کر لازمی فوجی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

سوال یہ ہے کہ فوجی اور سویلین حکمرانی کا فرق کیوں پیدا کیا گیا ہے اور جس طرح کی جمہوریت آج پاکستان پر مسلط ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کیلئے آیئے دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا سیاسی نظام کیسا ہے؟ امریکہ میں جو امریکن صدر، کانگرس کے نمائندے اور سینیٹر ہیں اور اس کے علاوہ جو پورا صیہونی بینکاری نظام ہے کہ جس میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی اور عیسائی صیہونی موجود ہیں، جو کہ پورے نظام کو چلاتے ہیں، ان کے متعلق اعداد و شمار اور ثبوت موجود ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا بچہ بھی فوج میں نہیں ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر یہ اپنے سرمایہ دارانہ نظام کی خاطر جنگیں کرواتے ہیں اور لاکھوں امریکیوں کو جنگ میں بھیجتے اور مرواتے ہیں۔اگر ان کے اپنے بیٹے میدان جنگ میں مر رہے ہوں تو پھر یہ صیہونی کبھی بھی جنگیں نہیں کروائیں گے۔مثال کے طور پر ویت نام میں تقریباً اسی سے نوے ہزار امریکی مروا دیئے گئے۔دوسری جنگ عظیم میں پندرہ، بیس لاکھ کے قریب امریکی مروائے گئے۔جبکہ کسی صدر، وزیراعظم یا سینیٹر کا بیٹا جنگ میں نہیں مرتا، بلکہ عام لوگ مرتے ہیں۔

آج پاکستان کے سیاستدانوں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔پورے پاکستان کی جتنی بھی سیاسی جماعتیں ہیں انکے تمام سربراہان کو دیکھ لیجیے کہ ان میں سے کتنوں کے بچے فوج میں شامل ہیں؟ تقریباً کوئی بھی نہیں، شاید ہی کوئی ایک آدھ آپ کو ملے۔اس وجہ سے ان لوگوں کی بدنظمی اور کرپشن کی وجہ سے جب بھی ملک میں فتنہ اور

فساد پھیلتا ہے یا جنگیں ہوتی ہیں تو پھر قوم کے بچے اور نوجوان فوجی افسر، کیپٹن، میجر اور سپاہی وغیرہ ہی شہید ہوتے ہیں۔ آج پاکستان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ ملک حالت جنگ میں ہے مگر سویلین حکومت، عدالتی نظام اور سیاسی جماعتیں ملک کے دفاع کے بجائے انتخابات اور جمہوریت بچانے میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ سے سویلین اور فوجی اداروں میں ہمیشہ تصادم اور تناؤ کی کیفیت رہتی ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا آج کے پیشہ ور سیاستدان اور سیاست کا پیشہ خلافت راشدہ میں موجود تھا؟ نہیں!!! اُس معاشرے میں درجات تھے۔ اس زمانے میں کسی فرد کی عزت اسکے عمل اور کردار کی بنیاد پر تھی۔ جیسا کہ جنگ بدر کے صحابہ کرامؓ کو اعلیٰ ترین مقام پر رکھا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب کوفہ، بصرہ اور مصر میں باقاعدہ فوجی چھاؤنیاں بنانے کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ باقاعدہ فوج اور اضافی فوج کے علیحدہ علیحدہ رجسٹر بنائے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ معیار طے کیا کہ جو قبیلے حضور اکرم ﷺ کے قریب ترین ہیں یا جن قبیلوں کا حضور اکرم ﷺ سے تعلق ہے، انکا نام پہلے لکھا جاتا اور پھر آہستہ آہستہ دور کے قبیلوں کا نام درج کیا جاتا۔ اس طرح مردم شماری کے ذریعے پورے ملک کی آبادی کا اندراج کیا گیا کہ باقاعدہ فوج کون ہوگی اور اضافی فوجی دستے کن قبیلوں سے لیے جائینگے اور ایمرجنسی میں کن قبیلوں کو عسکری ذمہ داری کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بعدازاں ان عسکری ذمہ داری کے بعد کون سے افراد سویلین ذمہ داریاں انجام دیں گے۔ یہ پورا نظام حضرت عمرؓ نے بنا دیا تھا مگر ملٹری اور سویلین نوکرشاہی الگ الگ نہیں تھی۔ کوئی پیشہ ور سیاستدان وہاں پر نہیں تھے کہ جنکا کام صرف سیاست کرنا یا حکومت چلانا ہو۔ خلیفہ کا مقرر کردہ گورنر امام مسجد بھی تھا، قاضی بھی، سیاسی حکمران بھی اور فوجی سپہ سالار بھی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ آج پاکستان کے سیاستدانوں کو منتخب کرنے کا معیار اور طریقہء کار کیا ہے؟ کس بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کی قیادت ان کو دی جائے؟ کیا انہوں نے جانیں قربان کی ہیں؟ کیا انکے اخلاق و کردار مرد آزاد اور بندہء مومن کے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ جنگ بدر کے صحابہ کرامؓ کو عوامی ذمہ داریاں نہیں دیا کرتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اسکی وجہ کیا ہے؟ جنگ بدر کے صحابیؓ تو بڑے باعزت لوگ

ہیں۔آپؓ انہیں عوامی ذمہ داریاں کیوں نہیں سونپتے؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اس لیے نہیں دیتا کہ اصحاب بدرؓ کی مسلمانوں کے دلوں میں عزت ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ عوامی ذمہ داریوں میں پھنس جانے کی وجہ سے لوگ انکے خلاف شکایتیں کرنا شروع کردیں گے اور انکے مخالف باتیں شروع ہوجائیں گی، کیونکہ جو سیاست میں آتا ہے اس پر تنقید ضرور ہوتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں انہیں عوامی ذمہ داریوں جیسا کہ زکوٰۃ جمع کرنا، انتظامیہ اور عدلیہ میں نہیں ڈالتا ہوں تا کہ لوگ انکی ویسے ہی عزت کرتے رہیں کہ جیسے اب کرتے ہیں۔

مسلم لیگ (ن)

سیاست میں ایک ایسا ماحول ہوتا ہے کہ جس میں حکمران سے سب راضی نہیں ہوتے۔اسی لیے اُس دور میں ہر آدمی اس ذمہ داری اور حکمرانی سے بھاگا کرتا تھا۔تو آج پاکستان میں پیشہ ور سیاستدان کہاں سے آگئے ہیں ؟ایک انگوٹھا چھاپ جاہل تک سیاستدان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔گریجویشن کی بھی شرط ختم کردی گئی ہے اور جب تھی بھی تب بھی جعلی ڈگریوں والے سیاستدان ہی حکومت کرتے رہے۔انکی بدکاری کے واقعات سے سب واقف ہیں۔انکے ذرائع آمدن کا کچھ پتہ نہیں۔کسی نے بھی امت کے لیے جانیں قربان نہیں کیں۔

آج تک پاکستان کے کسی پیشہ ور سیاست باز نے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اپنا کردار تشکیل نہیں دیا۔جبکہ حکم یہ دیا جارہا ہے کہ اللہ کے نزدیک ترین وہ ہے کہ جو تقویٰ میں سب سے اعلیٰ ہے۔آج پاکستان کا پورا معاشرہ ان حکمرانوں کو گالیاں

پاکستان پیپلز پارٹی

دے رہا ہے کہ سب سے زیادہ ناپاک اور پلید لوگ حکمران بن گئے ہیں۔ جہاں تک بات ہے پیشہ ور سیاستدان کی تو سیاست کوئی شعبہ نہیں ہے کہ جس میں انسان یہ سمجھے کہ چونکہ میرا باپ سیاستدان تھا تو اب میں بھی سیاستدان بنوں گا اور یہ میری وراثت کی گدی ہے۔ اس علاقے کے ووٹ ہمارے لیے پکے ہیں اور ہم نے یہاں سے جیت کر ایم این اے یا ایم پی اے بننا ہے۔ یہ سلسلہ نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ طاقت، دولت، برادری اور پیری مریدی کی بنیاد پر میرا ہی جیتنا بنتا ہے۔ اللہ کی پناہ، کس بنیاد پر یہ سیاستدان بنتے ہیں؟

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں، رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند

اگر آپ ایک ڈرائیور کو بھی رکھتے ہیں تو پہلے ڈرائیونگ لائسنس چیک کرتے ہیں۔ جبکہ اس ملک کا وزیراعظم اور صدر بننے کیلئے کوئی طریقہ کار ہی موجود نہیں ہے۔ پچاس لاکھ شہداء کے خون پر یہ ملک بنایا گیا ہے اور بدنصیبی یہ ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کیلئے اچھے حکمرانوں کے انتخاب کا کوئی طریقہ کار موجود ہی نہیں۔ وہ ملک جسے پوری دنیا کا کفر تباہ کرنا چاہتا ہے اور جو اسلام کا آخری قلعہ ہے، وہاں کے سیاستدانوں کا حال یہ ہے کہ زانی اور بدکار شخص یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں اس ملک کی قیادت دی جائے، استغفراللہ۔ ہر شخص اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ یہ ملک میرے باپ کی موروثی جائیداد ہے۔ پھر یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہی جمہوریت ہے اور ہمیں یہی نظام چاہیے اور فوج کو سیاست سے الگ ہونا چاہیے۔

فوج کا نظام اگر دیکھا جائے تو فوج میں اس وقت تک کوئی کمانڈر انچیف نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ 30 سے 35 سال فوجی نوکری نہ کرے، اور ساتھ ساتھ اسے اپنی قابلیت کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ، لیفٹیننٹ، کیپٹن، میجر سے ہوتا ہوا پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے کور کمانڈر بنتا ہے پھر کور

کمانڈرز میں سے ایک لیفٹیننٹ جنرل کو آرمی چیف بنا دیا جاتا ہے۔ وہ 30 سے 35 سال فوج کی خدمت کر کے پھر چیف بننے کا اہل ہوتا ہے۔ فوجی نظم ونسق کا حامل اس کا ایک ماضی ہوتا ہے، یعنی فوج کا سپہ سالار بننے کیلئے ایک مضبوط نظام موجود ہے۔

اس ملک میں حکمران بننے کا کیا طریقہ کار ہے؟ اور عملی طور پر دیکھا جائے تو اس ملک پر کیسے کیسے لوگ مسلط ہو چکے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک نگران حکومت بنائی جاتی ہے۔ ملک کے باہر سے ایک گمنام شخص معین قریشی درآمد کیا جاتا ہے کہ جو اپنی پسند کے مشکوک لوگ اپنے ساتھ لیکر آتا ہے اور پھر یہ عالمی بینکاروں کی جماعت ملک پر حکومت کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس ملک میں ایسے حکمران بھی آ چکے ہیں کہ جنکا تعلق عالمی صیہونی مالیاتی اداروں سے ہوتا ہے۔ کوئی ایشین ڈویلپمنٹ بینک سے چلا آ رہا ہے اور کوئی سٹی بینک سے آتا ہے۔ شوکت عزیز کے دور میں تو عملی طور پر اس ملک کو سٹی بینک ہی چلا رہا تھا۔ یعنی کوئی طریقہ کار ہی نہیں ہے اس ملک کا حکمران بننے کا۔ آج تک کسی نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ انہوں نے ملک کی خدمت کیلئے کیا کیا ہے؟ کیا قربانی دی ہے؟ ان کی اپنی ہمدریاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں؟ ان کی اپنی دولت اور اولادیں ملک سے باہر کیا کر رہی ہیں؟

خلافت راشدہ میں اگر خلیفہ کی طرف سے کسی کو کوئی عہدہ دیا جاتا تھا تو اس سے پہلے اسکی پوری زندگی کھنگال دی جاتی تھی کہ اس شخص نے پوری زندگی میں کیا کیا ہے؟ وہاں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی نا اہل یا درآمد شدہ پیشہ ور سیاستدان کو عہدہ دے دیا جاتا۔ خلافت راشدہ میں اگر کسی پر کرپشن کا الزام لگایا جاتا تو خلیفہ کی طرف سے تحقیقات ہوتی تھی۔ اور اگر ثابت ہو جاتا کہ اس نے کرپشن کی ہے تو ساری زندگی اسے وہ عہدہ دوبارہ نہیں دیا جاتا تھا۔ لوگوں کو خود ثابت کرنا پڑتا تھا کہ انکے پاس دولت کہاں سے آئی ہے؟ حکمرانوں کے معاملے میں یہ نہیں ہوتا تھا جیسا کہ آج ہوتا ہے کہ آٹھ سے دس سال جیل میں گزارنے کے باوجود، چونکہ عدالتی نظام کی خرابی کی وجہ سے کرپشن ثابت نہیں ہوئی، لہذا مقدمات کو جھوٹا قرار دے کر خارج کر دیا جائے۔ آج ہمارے حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ممبران اسمبلی نے گوشوارے ہی نہیں جمع کروائے اور آمدنی بتانے سے گریز کر رہے ہیں کیونکہ وہ سارے چور ہیں۔ اگر ان ارب پتی

سیاستدانوں کے انکم ٹیکس گوشوارے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے مقروض، غریب، مسکین اور عاجز ہیں حتیٰ کہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ جبکہ طرز زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ملک وقوم کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں۔

اگر بادشاہتوں کا نظام دیکھیں، جیسا کہ خلیج میں بادشاہتوں کا نظام قائم ہے، تو وہ بھی دنیا کا سب سے کرپٹ ترین سیاسی نظام ہے۔ ان کے حکمرانوں کی عیاشیوں کی کہانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں کہ کس طرح یہ مسلمانوں کی دولت لٹاتے پھرتے ہیں۔ تیل کے خزانوں سے حاصل شدہ کھربوں روپے کی آمدنی سے یہودی بینکوں میں سرمایہ کاری کر کے امت مسلمہ کو انہوں نے کیا فائدہ دیا؟ کیا مسلمان دنیا نے ہوائی جہاز، بحری جنگی جہاز یا ٹینک بنانے شروع کردیئے ہیں؟ یا تعلیم کے شعبہ، صنعت اور زراعت میں آزاد اور خودمختار ہوگئے؟ یا مسلمان دنیا ایک متحد دفاعی و سیاسی نظام بنانے میں کامیاب ہوگئی ہے؟ آج تک ان میں سے ایک مفاد بھی ان تیل کے پیسوں سے حاصل نہیں کیا جاسکا ہے کہ جس کو یہ ظالم حکمران اپنی ذاتی جائیداد سمجھ کر لٹاتے پھر رہے ہیں۔ تو یہ حشر کیا ہے ان بادشاہتوں نے امت مسلمہ کا۔

سعودی شہزادے ولید بن طلال کی کار جس میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں اور اس کار کی مالیت تقریباً ۴۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے

اگر آمریت کو دیکھا جائے تو اس نظام میں چین کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں ایک کمیونسٹ پارٹی کا نظام قائم ہے۔ اس پارٹی میں بھی فوج کی طرح کا طریقہ کار رائج ہے کہ ایک شخص ابتداء سے اس پارٹی میں داخل ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے 30 سے 35 سال میں politburo یعنی مرکزی شوریٰ میں پہنچتا ہے پھر اسے چیئرمین آف دی کمیونسٹ پارٹی یا صدر بنا دیا جاتا ہے۔ چین میں بھی یہی

نظام رائج ہے کہ چین کا صدر بننے کے لیے ایک شخص کی زندگی کا پورا ماضی دیکھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس مغربی جمہوریت میں عالمی طاقتوں، یہودی بینکاروں اور اسرائیلی لابی کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کسی بھی شخص کا سیاہ سفید معاف ہوجاتا ہے۔ یہ صرف کہنے کو جمہوریت ہے۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو امریکی صدر بش سینئر، بش جونیئر اور اوباما سمیت تمام امریکی صدور اسرائیلی لابی کو خوش کرتے ہوئے اور گھٹنے ٹیکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور ایک ایسا شخص جو اسرائیل مخالف ہو، چاہے کتنا ہی ایماندار اور قابل کیوں نہ ہو، جیسا کہ امریکی صدارتی امیدوار رون پال تھے، وہ کبھی بھی امریکی جمہوریت میں اقتدار نہیں حاصل کرسکتا۔ ذرائع ابلاغ نے بھی اس کا نقطہءنظر پیش نہیں کیا جاتا۔ تو امریکہ میں کوئی جمہوریت نہیں ہے، بلکہ یہ وہی ظلم و استبداد کا دیو ہے کہ جسکو یہ آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہیں اور پھر اسی جمہوریت کو پاکستان پر بھی مسلط کیا جاتا ہے اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم اسے پٹڑی سے نہیں اترنے دینگے۔ اصل میں یہی جمہوریت ہے کہ جس نے ملک کا پورا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد

فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

ایسی جمہوریت پاکستان پر مسلط کردی گئی ہے کہ جس میں عدلیہ بھی پاکستان کو تباہ کرنے میں اپنا کردار ادا کررہی ہے۔ جیسے کہ ہم پہلے ہی بیان کرچکے ہیں عدلیہ کا یہ حال ہے کہ یہ کسی ایک دہشت گرد کو بھی سزائے موت نہیں دے سکی۔ ایک بھی کرپٹ سیاستدان اور حکمران، چاہے وہ فوجی ہو یا سویلین، کا احتساب نہیں کیا جاسکا۔ کوئی ایک حکمران تو ایسا ہوگا ناں کہ جس نے ملک کو کھا کر ختم کردیا ہے۔ کسی ایک حکمران کو تو سزا ملنی چاہیے تھی۔ یہ کیسی عدلیہ ہے؟ این آر او جو کہ سب سے بڑا ظلم ہوا ہے اس ملک وقوم کے ساتھ، اس سے دھلے ہوئے حکمران آج بھی حکومت کررہے ہیں۔ کیا یہ سب خلافت راشدہ میں ممکن تھا؟ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جبکہ آج حالات کیا ہیں؟ ان سب کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ اس نظام کو سنبھال کر رکھو کہ یہ کہیں پٹڑی سے نہ اتر جائے تو خدا کی قسم ہم زندگی خرچ کردینگے ایسے نظام کو پٹڑی سے اتارنے کے لیے اور پھر اسے آگ

بھی لگا دیں گے۔ کیونکہ ہمیں خلافت راشدہ کا نظام چاہیے۔ ہمیں یہ کرپٹ نظام نہیں چاہیے۔ یہ انگریزوں کا مسلط کردہ ناپاک اور پلید نظام ہے جسے انکے ایجنٹ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جس میں شرم و حیاء نہیں ہے۔ پیشہ ور سیاستدان۔ کیا سند ہے ان پیشہ ور سیاستدانوں کی؟ بقول اقبالؒ خود شیطان کہتا ہے کہ:

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

جبکہ خلافت راشدہ کو دیکھیے۔ اصل میں یہی وہ نظام ہے کہ جسے ہمیں اپنانا ہے۔ وہاں کوئی سول ملٹری فرق نہیں تھا۔ کیوں یہ نظام پاکستان میں نافذ نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں پر ہر سویلین پاکستانی فوجی ہو اور ہر پاکستانی فوجی ایک سویلین ؟ یہ تو ایک باکمال نظام ہے۔ یہ سویلین اور فوجی کا فرق ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ تمام سیاستدان فوجی بھی ہوں تو پھر کیا کوئی فرق رہ جائے گا؟ ملک وقوم کی خاطر جب بھی جان دینے کی باری آتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جو نامور پاکستانی

سیاست دان ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی اپنا بچہ میدان جنگ میں نہیں بھیجتا۔ کس نے میدان جنگ میں جا کر قربانیاں دی ہیں؟ فوج نے سو غلطیاں کی ہونگی مگر اپنے سینکڑوں بچے بھی شہید کروائے ہیں اس قوم کی عزت و آبرو بچانے کے لیے۔ ان سیاستدانوں نے بھی ہزار غلطیاں کی ہیں مگر آج تک کتنے مرے ہیں میدان جنگ میں؟ جو سیاست کے چکر میں مرے بھی ہیں، انہوں نے جان بوجھ کر قربانیاں نہیں دیں بلکہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔

جو بظاہر نظر آ رہا ہے، اسکے مطابق نہ تو یہ نظام چلنے والا ہے اور نہ ہی ہم اس نظام کو قبول کرنے والے ہیں۔ یہ بات بالکل طے ہے کہ ہمارے بزرگوں نے خلافت راشدہ میں جو نظام بنا کر دکھا دیا ہے آئندہ

یہی نظام نافذ کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔ اس میں کوئی پیشہ ور سیاسی جماعتیں نہیں ہونگی، کوئی پیشہ ور سیاستدان نہیں ہونگے، اس میں کوئی سول ملٹری فرق نہیں ہوگا۔ کوئی یہ سوال نہیں کر سکے گا کہ فوجی حکومت ہے یا سیاسی حکومت؟ کیونکہ جو حکومت آئندہ ہوگی وہ فوجی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جو امیر المومنین بنے گا وہی کمانڈر انچیف بھی ہوگا اور وہ امت وملت کے لیے اپنی جان سب سے پہلے قربان کریگا۔ آج کے برعکس وزیراعظم ہاؤس یا ایوان صدر میں بیٹھ کر اپنی قوم کو نہیں مروائے گا۔ اپنے غلط فیصلوں کا کفارہ خود ادا کرے گا اور ذمہ داری لے گا۔ وہاں یہ نہیں ہوگا کہ وہ کہے کہ عدالتوں میں ثابت کرو کہ میرے پاس اربوں روپے کی جائیدادیں کہاں سے آئی ہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کریگا۔ عوام الناس اس کو گالیاں اور بددعائیں نہیں دیں گے۔ جس طرح آج خانہ کعبہ کے پردوں میں اور مسجد نبوی میں، حضور اکرم ﷺ کے مصلے پر، ان موجودہ حکمرانوں کے لیے بددعائیں کی جارہی ہیں۔ اللہ کے ولی، درویش اور فقیر دعائیں مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ ہمیں اس عذاب سے نجات دے۔ ان حکمرانوں کو خوف نہیں آتا کہ کل اللہ کے سامنے جا کر یہ کیا جواب دینگے؟

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے

۱۱

خلافت راشدہ اور موجودہ نظامِ عدل

خلافت راشدہ کا نظام پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آج پوری انسانیت تکلیف میں ہے۔ اس سے پہلے انسانیت پر اتنا ظلم کبھی نہیں ہوا۔ آج دنیا میں مشرق ومغرب میں کبھی جمہوریت کے نام پر ظلم کیا جاتا ہے اور کبھی آمریت یا بادشاہتوں کے نام پر۔ تاریخ میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ دنیا کے کسی ایک خطے میں ظالموں کی حکومت آ گئی ہو مگر باقی دنیا شر سے محفوظ رہتی تھی۔ مگر اب دجال کا نظام مسلط کر کے زمین میں فساد برپا کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنے سیاسی، عدالتی اور معاشی نظام کے ذریعے کروڑوں اربوں انسانوں کو غلام بنا چکے ہیں۔ اگر اس سے نجات پانی ہے تو لوگوں کے پاس صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے بنائے ہوئے نظام کی طرف لوٹ جائیں۔ اب اگر کوئی نظام انسان کی فلاح کیلئے کام کریگا تو اس کی بنیاد خلافت راشدہ پر ہی رکھی جائے گی۔ ہم اس قدر بہترین انسان نہیں ہیں جیسا کہ خلفائے راشدین اور حضور ﷺ کے براہ راست تربیت یافتہ باقی صحابہ کرامؓ تھے۔ لیکن اگر ہم خلافت راشدہ کے نظام کا عشر عشیر بھی اپنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو دنیا میں اتنا امن وامان، خوشحالی اور ترقی آ جائے گی، لوگوں کی جان و مال اور عزت وآبرو اتنی محفوظ ہو جائے گی کہ لوگ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس تقابلی جائزے کا مقصد لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ موجودہ نظام گل سڑ چکا ہے۔ یہ اس قابل نہیں رہا کہ ہم

اسے گلے سے لگائے رکھیں ۔اس نظام کے حامیوں سے جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اس نظام سے وابستہ مسائل کا حل کیا ہے تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ جب شریعت رسول ﷺ کے نظام کی بات کی جاتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے ہم پتھر کے زمانے میں چلے جائیں گے اور شریعت کے قوانین موجودہ دور میں نافذ نہیں کیے جاسکتے کیونکہ ان کے خیال میں شریعت صرف ہاتھ کاٹنے اور کوڑے مارنے تک محدود ہے۔انسان سازی، کرداری سازی، معاشرہ سازی کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اسلامی عدالتی نظام درحقیقت کیا ہے؟ ان کی عقل یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ حکمرانوں اور سیاستدانوں کے احتساب کی کیا اہمیت ہے؟ جمہوریت اور آمریت کے مقابلے میں شورائیت کے فوائد سے بھی یہ لوگ لاعلم ہیں۔لیکن حقیقتاً ان کے ارباب اختیار اور سمجھدار لوگوں کو یہ سب معلوم ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام ہر لحاظ سے ان کے نظام سے بہتر ہے۔علامہ اقبالؒ نے بھی یہ خیال پیش کیا تھا کہ جمہوریت ہو تو روحانی ہو اور آمریت ہو تو رحمانی ہو۔مگر یہ لوگ اس خیال کے حامی نہیں ہیں اور سمجھتے ہوئے بھی خلافت راشدہ کی بات نہیں کرنا چاہتے۔

حضور ﷺ کے تربیت یافتہ خلفائے راشدین نے ایک بہترین نظام دنیا کے سامنے پیش کیا اور ایک ایسی سلطنت قائم کی جو چین سے سپین تک پھیلی ہوئی تھی لہذا کوئی یہ اعتراض بھی نہیں کرسکتا کہ چونکہ ان کی ریاست چھوٹی تھی، اس لیے وہ اسکا نظام اچھی طرح چلا رہے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں دنیا کی نصف سے تھوڑی ہی کم آبادی مسلمانوں کے زیر حکومت علاقوں میں آباد تھی۔ دنیا کے تمام آبی راستے، بیش بہا وسائل اور ہر نسل کے لوگ مسلمان علاقوں میں موجود تھے۔ یہ سب باتیں مدنظر رکھتے ہوئے کسی کے پاس یہ دلیل باقی نہیں رہ جاتی کہ چونکہ علاقہ بہت بڑا ہے، وسائل کی کمی ہے یا مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں لہذا ہم خلافت راشدہ کا نظام نافذ نہیں کرسکتے۔ان صحابہ کرامؓ نے یہ سب کچھ کر کے دکھا دیا۔خلافت راشدہ کا نفاذ ممکن ہے مگر یہ بدنیت لوگ ہیں۔ان کے نیتیں اور اعمال ناپاک اور ان کا رزق حرام ہے۔اسلامی سیاسی نظام میں سیاستدانوں، حکمرانوں اور اراکین شوریٰ کا اتنا سخت احتساب ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسکے تصور سے ہی کانپ جاتے ہیں۔ یہ انکے لیے ناقابل برداشت ہے کیونکہ ان کی کرپشن ماری جاتی ہے، ان کی حرام خوریاں ختم ہوتی ہیں اور ان کے ناپاک طرز زندگی پر زد پڑتی ہے۔لہذا یہ خلافت راشدہ کا نظام اپنانے سے

گریزاں ہیں۔ یہ نظام اپنانے سے انہیں کرپشن کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ لہٰذا انہوں نے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے قانون کو ہی رد کر دیا ہے تا کہ ان کے مفادات کو زک نہ پہنچے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا

روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

اب آتے ہیں ان کے نظام عدل کی طرف۔ یہاں ایک بات یاد رکھیے گا کہ جمہوریت اور آمریت فقط سیاسی نظریات ہی نہیں بلکہ یہ بھی پورے طرز زندگی ہیں کہ جو انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرتے ہیں بالکل اسی طرح کہ جیسے اسلام فقط مذہب نہیں بلکہ ایک دین ہے اور یہ ایک مکمل نظریہ حیات اور طرز زندگی ہے۔ اسلام ہماری زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں بیت الخلاء میں جانے کے طریقے اور اور رات کو سونے سے پہلے کی دعا بتانے کے ساتھ ساتھ عالمی معاشی نظام کے قیام کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ اس کا ہر پہلو موجودہ دنیا کے دجالی نظام سے متصادم ہے۔ اسلام اس موجودہ جمہوریت اور آمریت کے بجائے خلافت راشدہ کا متبادل نظام پیش کرتا ہے۔ اسی لیے یہ لوگ اسلام کو ہر پہلو سے خطرہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام متبادل سیاسی، معاشی، عدالتی اور معاشرتی نظام رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک منفرد روحانی نظام بھی ہے کہ جس سے یہ لوگ محروم ہیں۔

سب سے بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر آپ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کریں گے تو وہ کس فقہ کے تحت ہوگا؟ ملک کے سارے بقراط بحث کو یہیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام میں کوئی ایسا فقہ نہیں ہے کہ جو سود اور رباء کے نظام کو جائز قرار دیتا ہو، جو یہ کہتا ہو کہ ملک میں زکوٰۃ اور عُشر کا نظام نافذ نہ کیا جائے، جو مسلمان ممالک کو کمزور خارجہ پالیسی بنانے کی ترغیب دیتا ہو، جو عدل وانصاف کے خاتمے کا درس دیتا ہو، جو یہ کہے کہ شوریٰ اور عدل کے تحت نیک اور بہترین حکمران تعینات نہیں کیے جانے چاہئیں، جو انگریزوں کے رومی قوانین کو قبول کرتا ہو اور جو مغربی جمہوریت کو مسلمان ممالک میں مسلط کرنے کی حمایت کرے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے بڑے بڑے مسائل کا فقہ کے عام اختلافات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہترین اور نیک حکمران کا انتخاب، شوریٰ کے ذریعے فیصلے، عدل وانصاف کا شرعی نظام اور سود و رباء سے

پاک معیشت، یہ معاملات ایسے ہیں کہ کوئی بھی فقہ ان سے اختلاف نہیں رکھتا۔ تمام فقہاء کے اختلافات بہت معمولی مسائل کے حوالے سے ہیں کہ جن سے اسلام کا سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام متاثر نہیں ہوتا۔ طلاق اور وراثت، نماز میں ہاتھ اوپر یا نیچے باندھنا وغیرہ معمولی مسائل ہیں مگر ان کو ہوا دی جاتی ہے۔ بڑے مسائل پر کہ جن میں کوئی اختلاف نہیں، بات ہی نہیں ہوتی۔ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں شدید اختلافات ہیں لہذا اس کا نفاذ ناممکن ہے۔ ہم جو کچھ بھی تجویز کر رہے ہیں، ان پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ جب ان چھوٹے مسائل سے واسطہ پڑیگا تو ان کا حل بھی ایک نیک حکمران اور شورائیت کے ذریعے نکال لیا جائے گا۔ فی الحال تو ہمیں بڑے مسائل کی طرف توجہ دینی ہے کیونکہ کفر ہماری شناخت اور ہماری تہذیب ختم کرنے کے درپے ہے۔ اس خاتمے سے بچنے کیلئے ہم اپنی نوجوان نسل کو اس متبادل نظام کی تعلیم دے رہے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد قرون اولیٰ میں کونسا نظام اپنا کر دنیا میں سرخرو ہوئے تھے۔ یہ باتیں ہماری نصابی کتب میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ ذرائع ابلاغ میں بھی ان کا ذکر نہیں ہوتا۔

اب ہم خود پر مسلط شدہ جدید عدالتی نظام کا موازنہ خلافت راشدہ کے نظام سے کریں گے۔ ہمیں امریکہ کی مثال دی جاتی ہے۔ امریکہ ہم پر تو جمہوریت مسلط کر رہا ہے مگر آیئے دیکھتے ہیں کہ امریکہ کے اپنے حالات کیسے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

یہ تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی

شاخ نازک پہ بنے گا جو آشیانہ ناپائیدار ہوگا

یہ شعر امریکہ اور مغربی تہذیب کے حوالے سے سچ ثابت ہو چکا ہے۔ امریکہ کی اپنی بنیادیں گل سڑ چکی ہیں۔ اسی جمہوریت کی وجہ سے امریکی معاشرہ اندر سے تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ صیہونیوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہاں کا سیاسی نظام قائم رکھنا ہے مگر وہاں کے معاشرتی، عدالتی اور معاشی نظام کا جمہوریت کے باعث جو حشر ہوا ہے، اس پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ اس کے بعد ہم اس پر بحث کریں گے کہ ۱۹ ویں صدی کا انگریزوں کا بنایا ہوا نظام پاکستان میں کس طرح کام کر رہا ہے۔ پھر ہم یہ بتائیں گے کہ خلافت راشدہ کے عدالتی نظام میں کیا خصوصیات تھیں کہ وہ عدل و انصاف کا حصول یقینی بناتا تھا۔ اس پر

بھی روشنی ڈالیں گے کہ آیا موجودہ دور میں وہی نظام قابل عمل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جب نظام عدل کی بات کی جاتی ہے تو دنیا کہتی ہے کہ پاکستان میں امن وامان کے حوالے سے صورتحال انتہائی خراب ہے۔فساد فی الارض ہے، دھماکے ہیں، راہزنی ہے، عزت وآبرو محفوظ نہیں، اغواء کاری ہے، گویا عدل وانصاف موجود نہیں ہے۔ پاکستانی یہاں کی صورتحال سے گھبرا کر امریکہ جانے کی خواہش کرتے ہیں مگر درحقیقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی جمہوریت، معاشی وعدالتی نظام نے خود ان کو کیا دیا ہے؟ ہم وہ نظام عدل کیوں اپنائیں کہ جو ان کے اپنے معاشرے میں بھی ناکام ثابت ہو چکا ہے؟ اس برطانوی وامریکی نظام میں سیشن کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ ہوتی ہیں، وکیل اور کتابوں کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ جن کے اندر قانونی موہ شگافیاں درج ہوتی ہیں۔ پھر یہ بحث ہوتی ہے کہ قتل کے بعد انسان کو سزائے موت دینی چاہیے یا نہیں۔ پھر یہ بحث کی جاتی ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کیلئے دونوں طرف سے وکیل ہونے چاہئیں کہ جو بحث ومباحثہ کر کے تکنیکی بنیادوں پر فیصلہ کریں، جھوٹ بولیں اور مکاری کریں، تکنیکی وجوہات کی بناء پر مقدمے کو طویل سے طویل تر کریں اور نتیجتاً بیس سے پچیس سال تک مقدمے چلیں تا کہ وکیلوں کو تنخواہیں بھی ملیں اور نظام کا ڈھکوسلہ بھی چلتا رہے۔ ملک میں سب کچھ ہو مگر انصاف نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو اتنا مہنگا ہو کہ غریب آدمی کا سب کچھ لٹ جائے۔ ہمارا عدالتی چونکہ مغرب سے درآمد شدہ ہے لہذا ہمارے ہاں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے جس کی وجہ سے آج ہم ملک میں فتنہ وفساد دیکھ رہے ہیں۔

امریکہ نے بہت بڑا عدالتی نظام بنایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی عدالتیں اور جج بڑے اعلیٰ ہیں۔ اگر ان کا نظام واقعی کام کر رہا ہے تو پھر یہ اعداد وشمار کیا ثابت کرتے ہیں کہ جو یہاں بتائے جا رہے ہیں؟ امریکہ کی آبادی تقریباً تیس کروڑ ہے۔ ۲۰۰۸ء میں امریکہ میں تقریباً سوا کروڑ جرائم کا اندراج ہوا۔ ان میں خونریز قسم کے جرائم (قتل، ڈاکہ، عصمت دری، اغواء کاری وغیرہ) کی تعداد تقریباً تیرہ لاکھ تھی۔ ۲۰۰۸ء میں امریکہ میں تقریباً سولہ ہزار قتل ہوئے۔ عورتوں کی بے حرمتی کے تقریباً نوے ہزار واقعات پولیس کے پاس لائے گئے۔ اس معاشرے میں کسی عورت کی عزت بھی محفوظ نہیں ہے اور یہ ہمیں انسانی حقوق سکھانے آتے ہیں۔ نقب زنی کے تقریباً بائیس لاکھ واقعات ہوئے۔ ڈکیتی کے ساڑھے چار لاکھ واقعات ہوئے۔

لوگوں کو زدوکوب اور قتل کی دھمکی وغیرہ کے ساڑھے آٹھ لاکھ واقعات ہوئے۔ چوری کے ۶۵ لاکھ مقدمات درج ہوئے۔ تقریباً دس لاکھ گاڑیاں چوری ہوئیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ایک کروڑ افراد جیلوں میں قید ہیں۔ ان میں سے ایک چوتھائی تعداد یعنی تقریباً پچیس لاکھ افراد امریکی جیلوں میں ہیں۔ ایسے مقدمات کا تو شمار ہی نہیں کہ جو پولیس کے پاس نہیں لائے گئے اور جن کا اندراج نہیں ہوا۔ یہ حالت اکیسویں صدی کے سب سے زیادہ جمہوری اور ''روشن خیال'' ملک کی ہے۔ یہ ملک یہی تہذیب پوری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ ان کا سود پر مبنی معاشی نظام تو پہلے ہی یہاں کام کر رہا ہے۔

قاتل، زانی اور ڈکیت کسی بھی معاشرے کے بدترین کردار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے شریعت قصاص نافذ کرنے کا حکم دیتی ہے تاکہ ان جرائم کا خاتمہ کیا جاسکے جبکہ امریکہ میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ سزائے موت ختم کردی جائے اور صرف عمر قید رکھی جائے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، اگر تم سمجھو تو۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان۔ انسانی تاریخ میں یہی نظام رائج رہا ہے۔ قتل کے بدلے قتل کیا جاتا ہے یا دیت ادا کی جاتی ہے یا اگر ورثاء معاف کرنا چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ تینوں طریقے موجود ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی ایک اپنایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس امریکی معاشرہ جرم کی معاونت کرتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ انہوں نے بہت سی ریاستوں میں سزائے موت کو ختم ہی کر دیا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اس قدر طویل جرائم کی فہرست کے باوجود صرف ۳۷ لوگوں کو سزائے موت ہوئی۔ سزائے موت پانے والوں کی فہرست میں صرف ساڑھے تین ہزار افراد کے نام درج کیے گئے اور ان میں سے بھی سزا صرف ۳۷ لوگوں کو دی گئی، وہ بھی محض چند ریاستوں نے۔ باقی ریاستوں نے سوسو، دو دو سو سال کی قید تو سنائی مگر سزائے موت نہیں دی۔ کیونکہ امریکہ کے غیر فطری نظام عدل میں سزائے موت انسانیت پر ظلم ہے۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟

Crime Clocks

Violent Crimes

Murder
every
31 min.

Forcible rape
every
5.8 min.

Robbery
every
1.2 min.

Aggravated assault
every
36.8 sec.

Property Crimes

Burglary
every
14.5 sec.

Larceny/Theft
every
4.8 sec.

Motor Vehicle Theft
every 28.8 sec.

امریکہ میں ہونے والے جرائم کی شرح

امریکہ میں سزائے موت نہ دینے کی وجہ سے جیلوں میں قیدیوں کیلیئے جگہ کم پڑتی جارہی ہے۔ایک سال میں اگر سولہ ہزار قتل ہوتے ہیں تو دس سالوں میں ڈیڑھ لاکھ افراد کے قتل کا امکان ہے۔ایک سال میں اگر ۳۷ آدمیوں کوسزائے موت دی جائے تو اسکا مطلب ہے کہ دس سال میں ۳۷۰ قاتلوں کوسزائے موت دی جائے گی۔ باقی جیلوں میں ہی عمر قید کی سزا بھگتتے رہیں گے۔یہی وجہ ہے کہ اب امریکیوں کو بڑی بڑی جیلیں بنانی پڑ رہی ہیں کہ جہاں پر تمام جرائم پیشہ افراد پر ٹیکس ادا کرنے والے امریکی شہریوں کا پیسہ خرچ ہورہا ہے۔کیری لوگر بل کے ذریعے امریکیوں نے ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ میں پاکستان کی عزت وآبرو خریدنے کی کوشش کی۔ ہمارے حکمرانوں کی بھی رال ٹپک رہی تھی کیونکہ یہ پیسہ ان کی اوقات سے بھی زیادہ

تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں امریکی حکومت اپنے قاتلوں، ڈاکوؤں اور مجرموں کی دیکھ بھال پر سالانہ تقریباً ساٹھ ارب ڈالر خرچ کر رہی ہے۔ یہ ہے امریکہ کا عدالتی نظام کہ جس میں محنت کش شہریوں کا پیسہ چوروں، ڈاکوؤں اور ڈکیتوں پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے کیا ہمیں انکا عدالتی نظام اپنانا چاہیے؟ بالکل نہیں!

امریکی معاشرے میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ وہاں لوگوں کے دلوں میں نہ قانون کا خوف ہے نہ خدا کا۔ انکا پورا اخلاقی اور معاشرتی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ صرف دکھاوے کیلئے چند لوگوں کو سزائیں دی جاتی ہیں تا کہ دنیا کو یہ باور کرا سکیں کہ ان کا نظام بہت اعلیٰ ہے۔ برطانیہ کا بھی یہی حال ہے۔ گو کہ وہاں بھی جرائم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے پھر بھی قاتلوں، چوروں، ڈاکوؤں، اغواء کاروں اور راہزنوں کو زندہ رکھنے کے لیے اربوں پاؤنڈ خرچ کیے جا رہے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے ان کے جرائم کے اعداد و شمار بھی امریکہ جیسے ہی ہیں۔

امریکہ میں درجنوں شہر ایسے ہیں کہ جہاں آپ رات کو نو بجے کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتے کیونکہ لٹنے یا قتل ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ پاکستان میں جو دہشت گردی آج ہم دیکھتے ہیں وہ پچھلے چند سالوں کے پیدا کردہ سیاسی مسائل ہیں اور ان میں ہمارے دشمنوں کا بہت بڑا ہاتھ شامل ہے۔ اگر صرف معاشرتی جرائم کی بات کی جائے تو پاکستان، امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں جنت ہے۔ یہ دہشت گردی کے واقعات انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اس حالیہ دہشت گردی سے پہلے دن رات کے کسی بھی حصے میں گلگت بلتستان سے لیکر کراچی کے کسی بھی حصے تک بغیر کسی خطرے کے سفر کیا جا سکتا تھا۔

اب وہ لوگ کہ جن کی نگاہیں امریکہ کی چکا چوند دیکھ کر چندھیا جاتی ہیں، وہ ایک سال میں وہاں ہونے والے جرائم کی فہرست دیکھ لیں اور پھر فیصلہ کریں کہ انہیں امریکہ کا ویزہ لگوانا ہے یا نہیں؟ یہ اعداد و شمار ہمارے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے اپنے ہیں۔ ان کی اپنی قوم یہ سب کچھ بھگت رہی ہے۔ پچیس لاکھ جرائم پیشہ افراد انہوں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں، اور انہیں سزا کے بعد چھوڑ بھی دیتے ہیں تا کہ وہ پھر سے جرم کریں۔ یہ اتنا بڑا ظلم ان لوگوں نے اپنی ہی قوم کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے۔ اگر امریکہ وہ ساٹھ

ارب ڈالر جو وہ ہر سال اپنے قاتلوں اور ڈاکوؤں پر خرچ کرتا ہے، بیواؤں، یتیموں اور غریبوں پر خرچ کرتا یا فلاح و بہبود کے کاموں پر لگاتا تو بڑی قابل تعریف بات ہوتی۔

چین کا عدالتی نظام قدرے سخت اصول وقواعد پر مشتمل ہے۔ چین میں چونکہ ایک جماعت کی حکومت ہے اور وہاں بہت سختی ہے لہذا ان کے تمام جرائم کے مکمل اعداوشمار میسر نہیں ہیں مگر یہ جرائم امریکہ کے مقابلے میں خاصے کم ہیں۔ چین کے عدالتی نظام کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے تو وہ سزا دینے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس امریکہ میں جب کوئی قاتل یا چور ڈاکو پکڑا جاتا ہے تو مقدمات میں ہی پندرہ پندرہ برس بیت جاتے ہیں۔ جبکہ چینی عجلت میں مقدمے کا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ قاتل اگر پکڑا جاتا ہے تو صبح اس کا مقدمہ چلتا ہے، شام تک سزا ہو جاتی ہے اور اگلے دن کھلے میدان میں لے جا کر اس کو گولی مار دی جاتی ہے۔ مجرم کو جو گولی ماری جاتی ہے، اسکے پیسے بھی اسکے خاندان سے ہی وصول کیے جاتے ہیں یعنی مجرموں پر ریاست کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ یہ سزا دینے کے معاملے میں امریکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن چین کے عدالتی نظام کی برائی یہ ہے کہ انہوں نے کچھ ایسے ظالمانہ قوانین بھی بنا دیئے ہیں کہ جو انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں۔ انہوں نے اپنی آبادی پر قابو پانے کیلئے یہ قانون بنا دیا ہے کہ سب کا ایک ہی بچہ ہوگا۔ جس کا دوسرا بچہ ہوگا، اس بچے کو مار دیا جائے گا۔ بچے مارنے والا سلسلہ تاریخ میں صرف فرعون سے منسوب ہے۔ ماؤں کی گودوں سے بچے چھین کر انہیں ذبح کرنا، یہ کام فرعون کا ہے انسانوں کا نہیں مگر چین میں یہ شیطانی سلسلہ آج بھی عملی طور پر چل رہا ہے۔ پھر بھی گھناؤنے جرائم کی شرح چین میں بھی بہت زیادہ ہے۔ معاشرہ لادین ہے اور آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اس لیے سخت قوانین بھی انسانوں کو جرائم سے نہیں روک سکتے۔

یہ ان کے عدالتی نظام کا حال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔ نہیں! قانون کبھی اندھا نہیں ہوتا۔

اخلاقیات اور روحانیت سب سے زیادہ قانون کے پاس ہونی چاہئیں۔انہوں نے قانون کے نام کا جو بت بنایا ہوا ہے، جس نے ہاتھ میں ترازو تھاما ہوتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ چونکہ وہ خود اندھے ہیں لہذا انکا قانون بھی اندھا ہے۔ اللہ اور اسکے رسولﷺ کا قانون نعوذ باللہ اندھا نہیں ہے۔ یہ قانون سب سے زیادہ دیکھنے والا اور غور وفکر کرنے والا ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ چوری کا مقدمہ آیا۔آپؓ نے چور سے پوچھا کہ کیوں چوری کی؟ اس نے جواب دیا کہ میں بھوکا تھا۔ وہ قحط کا دور تھا اور لوگوں کو کھانے کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا ''وہ حکومت جو اپنے عوام کا پیٹ نہیں بھر سکتی، وہ چوری کرنے پر بھوکے آدمی کا ہاتھ کاٹنے کا حق بھی نہیں رکھتی''۔یعنی قانون نے اندھے پن کا نہیں بلکہ سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔خلافت راشدہ میں ہمیں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں اسلامی شریعت کو اتنی سمجھداری سے استعمال کیا گیا کہ عقل دنگ رہ گئی۔اس باب میں ہم نے امریکی اور چینی عدالتی نظام کا بنیادی موازنہ کیا۔آئندہ کے ابواب میں ہم سعودی عرب اور دیگر ممالک کے عدالتی نظام کا موازنہ پاکستان کے نظام سے کرینگے اور پھر خلافت راشدہ کے عدالتی نظام کی نمایاں خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

۱۲

سعودی عرب کا عدالتی نظام

امریکہ کے عدالتی نظام کے بارے میں اور وہاں ایک سال میں ہونے والے جرائم کی تعداد بتانے کا مقصد یہ تھا کہ اس معاشرے کا انتشار دکھایا جاسکے۔ امریکہ میں ہونے والے جرائم کی فہرست میں اکثر وہی جرائم درج ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ قرآن میں فساد فی الارض کہتا ہے، یعنی ان جرائم سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کا عدالتی نظام اور عدل وانصاف کا معیار کتنا کامیاب ہے، اسکا اندازہ وہاں ہونے والے جرائم کی شرح سے لگایا جاتا ہے کہ زمین میں امن ہے یا فساد؟ معاشرے میں ہونے والے جرائم سے اس معاشرے کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی فرق پڑتا ہے کہ آیا کوئی معاشرہ لادینی بنیادوں، دہریت پر قائم ہے یا مذہب اور روحانیت کی بنیادوں پر۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے یہ رائج شدہ نظام ہی سب سے اعلیٰ ہیں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں لاشرقیہ، لاغربیہ کا پیغام ہے۔ جو اسلامی نظام (اسلامیہ) ہے اس کی جہتیں کیا ہیں؟ اس باب کا مقصد اسی کی ایک جھلک دکھانا ہے۔

امریکہ میں ۲۰۰۸ء میں سولہ ہزار سے زائد قتل ہوئے جبکہ چین میں گزشتہ چند سالوں میں قتل کی شرح اوسطاً بائیس ہزار سالانہ رہی۔ اگرچہ چین کی آبادی امریکہ سے چار گنا زیادہ ہے مگر قتل کی سالانہ شرح امریکہ سے

تھوڑی ہی زیادہ ہے۔امریکہ میں چین کی نسبت تقریباً چار گنا زیادہ قتل ہوتے ہیں۔چین میں ایک سال میں تقریباً تیس ہزار عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ایک ارب تیس کروڑ آبادی والے ملک یعنی چین میں تیس ہزار عورتوں کی بے حرمتی ہوئی اور تیس کروڑ آبادی والے ملک یعنی امریکہ میں نوے ہزار عورتوں کی۔

عدالتی نظام کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں ایک سال میں تقریباً سولہ ہزار قتل ہوئے مگر سزائے موت صرف ۳۷ قاتلوں کو دی گئی۔باقیوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔چین میں ایک سال میں تقریباً ساڑھے تین ہزار لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔اگر چہ یہ بھی انتہائی ناکافی ہے۔بائیس ہزار قاتلوں میں سے فقط ساڑھے تین ہزار لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔قرآن میں اس حوالے سے کہہ دیا گیا ہے کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ جہاں قصاص کا قانون رائج نہیں ہوگا،یعنی جان کا بدلہ جان نہیں ہوگی، وہاں ظلم وفساد ضرور پھیلے گا۔چینی لوگ دہریئے ہیں۔وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ قیامت نے بھی آنا ہے۔لہذا ان کے خیال میں دنیا ہی سب کچھ ہے۔پورا معاشرہ لادینیت اور مادیت کی بنیاد پر قائم ہے۔لہذا سخت قوانین کے باوجود چین اپنے عوام کو پوری طرح عدل وانصاف مہیا نہیں کر پا رہا بلکہ جرائم کی شرح بڑھتی جارہی ہے۔ جو اگر چہ امریکہ کے مقابلے میں تو نسبتاً کم ہے مگر درحقیقت یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ جہاں اس قدر قتل ہوتے ہوں، عصمت دری کی ہزاروں وارداتیں ہوتی ہوں اور ان کے جرائم کی تعداد کروڑوں میں ہو، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث لوگوں میں عدم مساوات اور بے چینی پھیل رہی ہو اور عدالتی نظام اپنا کام نہ کر رہا ہو تو وہ معاشرہ انتشار ہی کا شکار ہو جاتا ہے۔لہذا یہ بھی ثابت ہوگیا کہ تمام تر سختی کے باوجود اشتراکیت کا نظام عدل بھی ناکام ہو چکا ہے۔

اب روس کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔روس کی آبادی تقریباً چودہ کروڑ ہے۔روس میں ۲۰۰۶ء میں تیس ہزار قتل ہوئے ہیں۔امریکہ کی آبادی تیس کروڑ اور قتل سولہ ہزار اور یہاں آبادی چودہ کروڑ اور قتل تیس ہزار۔یعنی امریکہ کی نسبت دو گنا زیادہ قتل۔عورتوں کی بے حرمتی کے سات ہزار واقعات ہوئے۔اگر روس کی آبادی کو دوگنا کریں تو یہ تقریباً امریکہ کی آبادی کے قریب ہے جبکہ عصمت دری کی وارداتوں کو دوگنا

کرنے پر بھی امریکہ میں ہونے والے ایسے واقعات روس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہونگے۔ ہمیں حقوق نسواں اور آزادیء نسواں کا درس دینے والا امریکہ عورتوں کو ذلیل کرنے میں سرفہرست ہے جہاں ایک سال میں نوے ہزار عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔اور جن واقعات کا اندراج نہیں ہوتا وہ ان کے علاوہ ہیں۔یعنی روس چودہ کروڑ کا معاشرہ جہاں تیس ہزار سالانہ قتل ہوتے ہیں۔امریکہ تیس کروڑ کا معاشرہ ہے جہاں سولہ ہزار قتل سالانہ ہوتے ہیں۔ جبکہ چین میں ایک ارب تیس کروڑ کی آبادی میں بائیس ہزار سالانہ قتل ہورہے ہیں۔

دنیا کی تینوں بڑی طاقتوں کے عدالتی نظاموں کے حالات ہم نے آپ کو بتادیئے۔روس اشتراکیت سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف چل رہا ہے جو کہ ایک ملی جلی معیشت ہے۔ جہاں دونوں نظاموں کو ملا کر معیشت اور سیاست کو چلایا جارہا ہے۔امریکہ اور چین کا نظام بھی ہم نے دیکھ لیا۔اب ہم چوتھے نظام کا جائزہ لیں گے۔ پاکستان کی طرف ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے سعودی عرب کی مثال لیں۔

سعودی عرب کی مثال بہت دلچسپ ہے۔سعودی عرب کا معاشی نظام بھی سود اور ربا پر مشتمل ہے۔اگرچہ وہ خود کو بہت اسلام پسند ظاہر کرتے ہیں مگر وہاں کا معاشی نظام بھی کاغذی کرنسی اور بینکاری نظام پر مشتمل ہے۔ یہودی بینکاروں نے وہاں بھی اسلامی بینکاری کے نام پر علیحدہ علیحدہ کھڑکیاں کھول دی ہیں اور فتوے لیکر انہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔کھربوں کے حساب سے مسلمانوں کی دولت امریکہ، یورپ اور دیگر مغربی یہودی بینکوں میں جمع ہے۔یہودیوں کا معاشی نظام اسی پیسے کی وجہ سے پھل پھول رہا ہے لہذا یہ کام اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔مشرق وسطیٰ کی تیل پیدا کرنے والی ریاستوں میں بھی اسلامی معاشی نظام رائج نہیں ہے۔

سیاسی طور پر سعودی عرب میں بادشاہت کا نظام رائج ہے۔ یہ بادشاہت خلافت کو تباہ کر کے حاصل کی گئی تھی۔ لارنس آف عریبیہ کے دور میں حجاز میں ہی خلافت عثمانیہ کے خلاف سب سے زبردست بغاوت برپا ہوئی تھی۔ لارنس آف عریبیہ اور برطانوی حکومت نے مل کر سعودی عرب میں بادشاہت کا نظام رائج کیا تھا۔ اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ یہ بادشاہت خلافت عثمانیہ کو توڑ کر قائم کی گئی۔ اس بادشاہت کا خلافت سے کوئی تعلق نہیں۔ سعودی عرب میں تقریباً پندرہ ہزار شہزادے ہیں اور ان سے وابستہ امراء و شرفاء کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بنتی ہے۔ سعودی عرب کی آبادی تقریباً تین کروڑ ہے۔ اس میں ایک کروڑ افراد وہ ہیں جو باہر سے آ کر وہاں آباد ہوئے ہیں۔ مقامی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے۔ بااختیار طبقے میں تقریباً ایک لاکھ افراد شامل ہیں جو پورے معاشرے کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یوں حکمرانی ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود رہتی ہے اور معاشی نظام سود اور ربا پر مبنی ہے۔

جہاں تک فساد فی الارض کا تعلق ہے، سعودی حکومت نے جرائم کے سدباب کے لیے کافی حد تک شریعت کے قوانین نافذ کر رکھے ہیں۔ اگرچہ تمام عدالتی نظام شریعت کے مطابق نہیں ہے مگر پرتشدد جرائم کے حوالے سے شریعت کے قوانین کا نفاذ کیا گیا ہے۔ یوں لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور بن گیا ہے کہ شاید شریعت صرف ہاتھ اور سر کاٹنے ہی کا نام ہے۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر ہم اسلامی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عدالتی نظام کا عشر عشیر بھی اپنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کے مثبت اثرات اور برکت سے عقل دنگ رہ جائے گی۔ سعودی عرب نے قتل کے بدلے قتل کا قانون رکھا ہوا ہے یا اگر مقتول کے ورثاء دیت لینے پر راضی ہو جائیں یا مقتول کے ورثاء معاف بھی کر سکتے ہیں۔ شریعت میں یہی طریقہ درج ہے۔ یہ اسلامی نظام ہی کی خصوصیت ہے کہ بدلے کا حق دینے کے ساتھ ساتھ معافی کا پہلو بھی شامل ہے۔ دنیا کے کسی اور نظام میں یہ پہلو موجود ہی نہیں ہے۔

سعودی عرب کی آبادی تین کروڑ جبکہ امریکہ کی آبادی تیس کروڑ ہے۔ یعنی آبادی کے لحاظ سے امریکہ سعودی عرب کے مقابلے میں دس گنا بڑا ملک ہے۔ اگر سعودی عرب میں ہونے والے جرائم کا امریکہ کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان کو بھی دس گنا بڑھانا پڑے گا۔ تو پھر معلوم ہو جائے گا کہ اگر سعودی عرب کی

آبادی تیس کروڑ ہوتی تو وہاں کتنے جرائم ہوتے۔ یہاں ہم صرف دو جرائم یعنی قتل اور عصمت دری کی مثال لے لیتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار آپ کو حیران کر دینگے۔ کیونکہ اس میں شریعت کی وہ برکات نظر آتی ہیں کہ اگر شریعت کا عشر عشیر بھی کسی معاشرے میں نافذ کر دیا جائے تو معاشرہ برکات سے بھر جاتا ہے۔ سعودی عرب کی آبادی تقریباً تین کروڑ ہے اور ایک سال میں وہاں فقط ۳۳ قتل ہوئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد دس گنا بڑھا بھی دی جائے تو پورے سال میں ۳۳۰ قتل ہونگے۔ امریکہ کے سولہ ہزار قتل کے مقابلے میں ۳۳۰ قتل بہت معمولی ہیں۔ سعودی عرب میں پورے سال میں عورتوں کی بے حرمتی کے صرف دس مقدمات درج کروائے گئے۔ اگر اس تعداد کو دس گنا بڑھا بھی دیا جائے تو ایک سال میں عورتوں کی بے حرمتی کے ۱۰۰ واقعات درج ہو جائیں گے۔ جبکہ امریکہ میں ایسے نوے ہزار واقعات ہر سال ہوتے ہیں۔

سعودی عرب، جہاں ایک سال میں ۳۳ قتل ہوئے، وہاں ۲۴ افراد کے سر قلم کر دیئے گئے یعنی ۳۳ میں سے ۲۴ قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا گیا۔ جو بچ گئے، وہ صرف اس وجہ سے بچے کیونکہ مقتولین کے ورثاء نے شریعت کے مطابق ان سے دیت قبول کر لی یا معاف کر دیا۔ ان کے علاوہ تمام قاتل اپنے انجام کو پہنچے۔ چونکہ وہاں لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر وہ قتل کریں گے تو ان کو سزا ملے گی لہذا وہاں سالانہ جرائم کی شرح بہت کم ہے۔ وہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ جاتے ہیں اور حج و عمرے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

اس کے باوجود وہاں جرائم کا تناسب انتہائی کم ہے۔ یہ شریعت کا نظام نافذ کرنے کی برکت ہے۔ حج کے موقع پر حرم مکہ اور مسجد نبوی میں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے مگر جب اذان ہوتی ہے تو ارد گرد کے دکاندار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر یا فقط جالی کا ہلکا سا کپڑا ڈال کر مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے سامان کے لٹ جانے کا خوف نہیں ہوتا۔ رات کو بھی آدھا سامان دکانوں سے باہر ہی پڑا رہتا ہے۔ دنیا میں کسی اور جگہ ایسا کیا جائے تو پندرہ منٹ بعد اس دکان کا صفایا ہو جائے گا۔ لوگ

لوٹ کر لے جائیں گے۔ مگر سعودی عرب میں لاکھوں لوگوں کی آمد کے باوجود ایسا نہیں ہوتا کیونکہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف ہے بلکہ وہاں شریعت کا فوجداری قانون بھی نافذ ہے۔

روحانی مسلمان معاشرہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہاں قانون کے خوف کے علاوہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا خوف بھی ہے۔ روحانی معاشرے کی یہی خصوصیت ہے کہ ایک طرف تو آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ڈالا جاتا ہے اور دوسری طرف تلوار بھی دکھائی جاتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو نظام عدل وجود میں آتا ہے، وہ فساد فی الارض ختم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

چین میں قانون کا زور ہے مگر اللہ کا خوف نہیں ہے لہذا وہاں مکمل طور پر امن و امان قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ میں عدالتیں، وکلاء اور قانونی کتابوں کی تو بھرمار ہے مگر وہاں اخلاقی اقدار اپنا وجود نہیں رکھتیں۔ نیویارک میں کچھ دہائیاں پہلے صرف ایک دن کیلئے بجلی گئی تھی اور لٹیروں نے پورا نیویارک لوٹ لیا تھا۔ یہ اس معاشرے کا اصل چہرہ ہے جس میں خوف خدا نام کو نہیں۔ جس کا جو جی چاہتا ہے، کرتا ہے۔ امریکہ میں جرائم کی شرح دنیا کے باقی تمام ممالک سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد چین کا نمبر ہے اور روس تو ویسے ہی آپے سے باہر ہے۔ وہ آوارہ اور طوائف الملو کی کا شکار معاشرہ ہے۔ جبکہ سعودی عرب کی تمام کمزوریوں کے باوجود چونکہ وہاں جرائم کے حوالے سے شریعت کے قوانین نافذ ہیں، لہذا ان کی برکات نظر آتی ہیں۔ ایک تو مسلمان وہاں جاتے ہی اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے واسطے ہیں اور دوسرا وہاں انصاف فوری مہیا کیا جاتا ہے، اگرچہ وہاں بھی کبھی کبھار شاہی خاندان کے افراد اور امراء پیسے دے کر قانون کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے باقی نظام مثلاً معاشی نظام اور کفیل کا طریقہ وغیرہ، وہ تمام بھی غیر شرعی ہیں۔ کفیل والا نظام یہ ہے کہ باہر سے سعودی عرب جانے والا ہر شخص جب تک وہاں کے کسی مقامی شخص کو کفیل نہ بنا لے، وہ وہاں کام نہیں کر سکتا۔ وہ کفیل ایسا شراکت دار ہوتا ہے کہ جو بغیر محنت کیے اس کام کرنے والے سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ یہ سارے نظام اسلام کی روح سے متصادم ہے۔ اس کے ذریعے باہر سے جانے والا شخص مقامی کفیل کے غلام کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اسی طرح سعودی عرب کا معاشی نظام بھی مکمل طور پر کفر کے نظام سے وابستہ ہے۔ اگر سعودی چاہتے

تو ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ وہ حقیقی دولت پر مبنی معاشی نظام قائم کر سکتے تھے۔ وہ ایسا اسلامی مالیاتی ادارہ بنا سکتے تھے کہ جہاں سونے چاندی میں تجارت اور لین دین ہوتا۔ یوں وہ پوری اسلامی دنیا کو معاشی طور پر مستحکم کر سکتے تھے مگر بدقسمتی سے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا جواب وہ اللہ تعالیٰ کو خود دینگے۔ ان کا اچھا قدم بس عدالتی نظام میں شریعت کے قوانین کا نفاذ تھا۔ وہ بھی انہوں نے صرف پر تشدد جرائم کے حوالے سے نافذ کیے جبکہ شریعت فقط وہیں تک محدود نہیں ہے۔ افغان طالبان کا بھی یہی مسئلہ تھا کہ انہوں نے فقط جرائم کے حوالے سے اسلام نافذ کرنا چاہا۔ ان کی سوچ اس سے آگے گئی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب یہ پراپیگنڈہ کرتا ہے کہ اسلام کا مطلب تو فقط ہاتھ کاٹنا، کوڑے لگانا اور گردنیں کاٹنا ہے۔ یہ تو فقط شرعی سزاؤں کا ایک چھوٹا سا پہلو ہے۔

شریعت کے فقط ایک پہلو پر عمل کرنے سے ہی سعودی عرب جرائم سے کافی حد تک چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دنیا میں کہیں اور ایسی صورتحال نہیں ہے کہ جیسی سعودی عرب میں ہے۔ اگر سعودی عرب میں پوری شریعت نافذ ہو جائے تو حالات ایسے ہو جائیں گے کہ وہاں لوگ زکوٰۃ لے کر گھومیں گے مگر کوئی لینے والا نہیں ملے گا۔ فی الحال سعودی عرب میں بہت غربت ہے۔ لوگوں کو یہ سن کر حیرانی ہوتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہاں دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہے۔ لہذا دنیا کے غریب ترین لوگ بھی سعودی عرب ہی میں بستے ہیں کیونکہ وہاں دولت امراء کے ہاتھوں میں ہی گردش کرتی رہتی ہے۔ تمام دولت اور وسائل پر شاہی خاندان اور کچھ دیگر امیر خاندانوں کا قبضہ ہے۔ باقی قوم انتہائی غریب ہے۔ شہروں کے گردونواح میں اب بھی کئی لوگ مٹی کے گھروں میں رہتے ہیں اور انہیں دو دو ماہ گوشت کھانے کو نہیں ملتا۔ جبکہ شاہی خاندان کا یہ حال ہے کہ غیر ملکی بینکوں میں انکی دولت کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں، بحری جہازوں اور محلات کے مالک ہیں اور اپنے اپنے ذاتی جہازوں پر دنیا کا سفر کرتے ہیں۔ ان کی عیاشیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

تھا جو ''ناخوب'' بتدریج وہی ''خوب'' ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مگر کم از کم وہاں مقدمات کے فیصلے فوری طور پر ہوتے ہیں۔قتل کا مقدمہ بھی ہفتہ، دس دن سے زیادہ نہیں چلتا۔ امریکہ میں بیس بیس سال لگ جاتے ہیں۔ چین میں بھی جلد فیصلے ہوتے ہیں مگر فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ معاشرہ دہریت کا شکار ہے۔معاشرے میں صرف سزا کا ہی خوف ہے،خوفِ خدا موجود نہیں۔اگر سزا کا خوف بھی نہ ہوتو چینی معاشرہ بھی بالکل ہی آوارہ ہوجائے۔

اب پاکستان میں جرائم کی شرح کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔حالات انتہائی تکلیف دہ ہیں۔پاکستان کی آبادی روس سے تھوڑی زیادہ ہے یعنی سترہ کروڑ۔ چودہ کروڑ کی آبادی والے ملک روس میں سالانہ تیس ہزار قتل ہورہے ہیں۔سترہ کروڑ کی آبادی والے ملک پاکستان میں تقریباً دس ہزار قتل سالانہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ روس سے بہتر صورتحال ہے مگر ایک اسلامی ملک میں اتنے قتل انتہائی شرمناک بات ہے۔ ہمارا مذہب تو ایک قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔

اگر ہم پاکستان کی آبادی دگنی کردیں تو امریکہ سے کچھ زیادہ ہوجائے گی۔اور اگر پاکستان میں ہر سال ہونے والے قتل کی تعداد بھی دگنی کردی جائے تو امریکہ سے زیادہ بری صورتحال سامنے آئے گی۔وہاں ہر سال سولہ ہزار قتل ہوتے ہیں جبکہ پاکستان میں قتل کی تعداد بیس ہزار ہوجائے گی۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان میں قتل و غارتگری بہت زیادہ ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا عدالتی نظام انتہائی ناکارہ ہے۔عورتوں کی بے حرمتی کے حوالے سے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں ان کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار سالانہ بنتی ہے۔امریکہ اور روس میں صورتحال اس سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔آبادی دگنا کرنے پر بھی پاکستان میں عصمت دری کے واقعات کی تعداد پانچ ہزار بنتی ہے۔جبکہ امریکہ میں نوے ہزار اور روس میں چھ ہزار۔پاکستان کا سعودی عرب سے تو کوئی موازنہ ہی نہیں ہے۔

پاکستان میں ۲۰۰۶ء میں دس ہزار قتل ہوئے۔صرف ۱۳۵ کو سزائے موت سنائی گئی مگر اس پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ پاکستان کی جیلوں میں تقریباً ۸۷ ہزار افراد قید ہیں۔روس کی آبادی پاکستان سے کم ہے مگر وہاں کی جیلوں میں دس لاکھ افراد بند ہیں۔امریکہ اور چین کی جیلوں میں بھی پچیس پچیس لاکھ افراد قید ہیں۔ پاکستانی جیلوں میں قید ۶۶ فیصد افراد ایسے ہیں کہ جن کے مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں اور ان کو

ابھی سزائیں نہیں ملیں۔گو کہ پاکستان میں بھی قصاص، معافی اور دیت کا قانون نافذ ہے مگر اس پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا۔

اس تمام صورتحال کو دیکھتے ہوئے کیا ہمیں امریکہ، روس اور چین کے عدالتی نظام اپنانا چاہیے؟ کیا ہمیں اپنے موجودہ عدالتی نظام سے چمٹے رہنا چاہیے؟ جبکہ اس عدالتی نظام نے اب تک ہمیں تباہی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ پورا ملک دو مسائل نے برباد کر ڈالا ہے۔ایک کرپشن اور خیانت کا اور دوسرا دہشت گردی اور قتل وغارتگری کا۔ ہمارا عدالتی نظام ان دونوں مسائل کا سدباب کرنے میں ناکام رہا ہے۔ایک بھی دہشت گرد

کو پاکستان میں گزشتہ بارہ سال سے سزائے موت نہیں ہوئی۔ سیاستدان ملک کے اربوں کھربوں کے اثاثے بیچ کر کھا گئے مگر اس عدالتی نظام کے تحت کسی کو قید و موت کی سزا نہیں ملی۔ فقط چند لوگوں کو کچھ عرصے کیلئے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ایسی جیلیں کہ جہاں ان کو ہر طرح کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ وہی لوگ پیسے دے کر جب جیل سے رہا ہوتے ہیں تو ملک کے حکمران بنا دیئے جاتے ہیں۔ این آر او جیسے قوانین بنا کر انہیں معاف کر دیا جاتا ہے۔ان کی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی پہلے سے ہی معاف کیا جا رہا ہے۔اب یہ بھی قانون بنایا جا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اسے سیاسی انتقام کے تحت کرپشن کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے تو اس کی ساری خیانت معاف کر دی جائے گی۔حرام کھانے اور سزا سے بچنے کیلئے آپ کو صرف کسی سیاسی جماعت کی رکنیت چاہیے، اور جب پکڑے جائیں تو وہ سیاسی جماعت آپ کو سزا سے تحفظ دلائے گی۔اس معاملے کو ایک سیاسی رنگ دے کر آپکو بے گناہ ثابت کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ ہے اس ملک کا عدالتی نظام۔

گو کہ ہمارے ہاں عورتوں کی بے حرمتی کے واقعات امریکہ، چین اور روس کے مقابلے میں نسبتاً کم ہیں

مگر ایک اسلامی ملک کے ہوتے ہوئے یہ ہمارے لیے انتہائی قابل شرم بات ہے۔قتل میں تو ہم نے امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ ہمارے ملک میں بڑھتے ہوئے فساد فی الارض کی نشانی ہے۔ یہ خطرناک رجحان دو باتیں ثابت کرتا ہے۔ایک تو یہ کہ یہاں حکومت ہے ہی نہیں اور دوسرا یہ کہ ہمارا عدالتی نظام تباہ ہو چکا ہے۔عدالتوں پر اربوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں مگر وہ شہریوں کو انصاف دینے میں ناکام ہیں۔ اگر وہ خیانت اور دہشت گردی کی سزائیں دینے سے بھی قاصر ہیں،تو پھر کس کام کے ہیں یہ ادارے؟ جو کچھ نظر آتا ہے،عدالتیں، وکلاء اور قانون،سب ڈرامہ ہے۔

گو کہ سعودی عرب کا سیاسی نظام جابرانہ ہے مگر جو سزاؤں کے معاملے پر انہوں نے شریعت نافذ کی ہے، اس کی برکات اس معاشرے میں دیکھیں کیا ہیں؟ انہوں نے محض ایک یا دو فیصد شریعت نافذ کی ہے۔ سوچیں اگر کسی جگہ ۱۰۰ فیصد شریعت نافذ ہو جائے تو کیا عالم ہو جائے گا۔اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ اُس سلطنت میں کہ جو خلافت راشدہ کے دوران چین سے لیکر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ہر زبان اور رنگ و نسل کے لوگ بستے تھے،اس کا عدالتی نظام کیا تھا؟ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے پاس ایک ایک مہینہ مقدمات نہیں آتے تھے کہ میں ان کا فیصلہ کروں۔ کیا آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ معاشرہ کن اخلاقی بنیادوں پر قائم تھا؟ ہم موجودہ کفر کے نظام کا تجزیہ کر چکے ہیں اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں موجودہ عدالتی نظام نہیں چاہیے۔ہمیں اس میں اصلاح نہیں کرنی بلکہ اسے مکمل طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک

عدل اس کا تھا قوی،لوثِ مراعات سے پاک

شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نم ناک

تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک

۱۳

پاکستان کا عدالتی نظام

دنیا کے موجودہ نظاموں سے مشرق اور مغرب میں جنم لینے والی تہذیبوں میں انسانیت، شرافت، غیرت، حیاء اور عدل وانصاف نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ معاشرہ کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتا ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔ امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ جہاں جرائم کی شرح انتہائی خطرناک سطح پر ہے۔ وہاں سود اور رباء کے نظام میں دولت کی تقسیم انتہائی ظالمانہ ہے۔ جب پوری دنیا میں ظلم کا معاشی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ جس معاشرے کو جنم دیتا ہے، اس کی بنیاد بھی مادیت پر ہوتی ہے، تو پھر لازمی بات ہے کہ وہاں ظلم بھی ہوگا، اس معاشرے میں جرائم بھی بڑھیں گے اور اخلاقی برائیاں بھی پیدا ہونگی کیونکہ وہاں آخرت اور اللہ رسول ﷺ کا کوئی خوف نہیں ہوتا، حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی اور نہ ہی وہاں کوئی روحانی نظریہ اور اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ ایسے معاشرے کو قانون اور جیلیں بنا کر سدھارا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جرائم کی شرح دیکھ کر انسان کی روح کانپ جاتی ہے کہ اکیسویں صدی میں دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں عملاً ہر ایک منٹ میں کسی نہ کسی عورت کی آبروریزی ہوتی ہے اور منٹوں کے حساب سے قتل ہو رہے ہیں۔

اس باب میں ہم پاکستان کے عدالتی نظام کو دیکھتے ہوئے خلافت راشدہ تک جائیں گے۔ پاکستان میں

رائج شدہ عدالتی نظام انگریز کا بنایا ہوا ہے۔ یہ نظام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بنایا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل ہندوستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی چلا رہی تھی۔ اس مزاحمت کے بعد تاج برطانیہ نے براہ راست یہاں کا نظام سنبھالا اور ۱۸۶۰ء میں لاہور اور دہلی میں ہائیکورٹس قائم کی گئیں اور برطانوی قانون ہندوستان میں بھی نافذ کر دیا گیا۔ غلام قوم کو غلام بنا کر رکھنے کیلئے کچھ قوانین کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ انہوں نے سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ والا نظام دیا۔ تب سپریم کورٹ کے بعد پری وی کونسل کا درجہ تھا یعنی پھر مقدمات لندن میں تاج برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت میں لے جائے جاتے تھے۔

کسی بھی عدالتی نظام کے کامیاب، فطرت سے ہم آہنگ اور شریعت سے قریب ہونے کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کو عدل وانصاف ملے چاہے وہ امیر ہو یا غریب۔ دوسرا یہ کہ اس انصاف کی فراہمی بھی مفت ہونی چاہیے۔ کیونکہ انصاف فراہم کرنا حکومت وقت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ انصاف کے حصول کیلئے عوام کو کروڑوں روپے خرچ کر کے خوار نہ ہونا پڑے۔ یہ ایک شہری کا بنیادی حق ہے جو اگر حکومت وقت نہ دے سکے تو اسے اقتدار چھوڑ دینا چاہیے۔ تیسرا یہ کہ انصاف گھر کے قریب ملے۔ جہاں حکومت کے ذمے شہریوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت ہے، وہیں اس کا فرض یہ بھی ہے کہ انصاف گھر کی دہلیز پر مہیا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک چھوٹے سے مقدمے کیلئے کسی شہری کو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑ جائے۔ اور اسکی پوری زندگی انصاف کے حصول کیلئے سفر میں ہی خرچ نہ ہو جائے۔ اگر اس طرح کا انصاف مل بھی جائے تو بے فائدہ ہے۔ سپریم کورٹ اسلام آباد میں ہے۔ اگر کسی غریب شخص کا مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے کہ جو اندرون سندھ میں رہتا ہو تو وہ شخص اسلام آباد کے چکر لگا لگا کر ہی خوار جائیگا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ انصاف کی فوری فراہمی بھی ضروری ہے۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ Justice delayed is juctice denied ''انصاف میں تاخیر ناانصافی ہے''۔ یعنی اگر آپ یہ کہیں کہ انصاف مل رہا ہے، گھر کے قریب مل رہا ہے مگر مقدمے تیس تیس سال چل رہے ہیں تو پھر عام آدمی ایسے انصاف کا کیا کرے گا؟ اگر ان میں سے ایک بھی نشانی کسی عدالتی نظام میں نہ پائی جاتی ہو تو وہ عملی طور پر کفر کا عدالتی

نظام کہلاتا ہے۔خلافت راشدہ کے عدالتی نظام میں مندرجہ بالا تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اس میں ہر شخص کو ایک ہی پیمانے پر انصاف ملتا ہے۔یہ وہ نظام ہے کہ جہاں خلیفہ کو بھی عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے اور قاضی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خلیفہ کو اسکے عہدے کی وجہ سے ترجیح نہ دے۔اگر وہ ایسا کرے تو خلیفہ اسے قاضی کے منصب سے ہٹا دینے کا مجاز ہوگا اور ایسا کرنا خلیفہ کے لیے واجب ہے۔

خلافت راشدہ میں اسی طرح کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔حضور ﷺ کی ایک مشہور حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ تم سے پہلی قومیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب ان کے طاقتور لوگ جرم کرتے تھے تو انہیں معاف کر دیا جاتا تھا اور جب کمزور، غریب، مسکین اور عاجز لوگ جرم کرتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔آج پاکستان میں بھی یہی ہورہا ہے۔جیسے پہلے بھی کہا گیا کہ پاکستان میں بدترین اور ظالم ترین دہشت گرد ہیں مگر ججوں پر ان کی ایسی دہشت اور خوف طاری ہے کہ جج ان کے خلاف فیصلہ نہیں دیتے۔اور گزشتہ بارہ سالوں میں کوئی ایک دہشت گرد بھی کیفر کردار کو نہیں پہنچا۔کسی بھی جاگیردار، دہشت گرد اور سیاستدان کو سزا نہیں دی جاتی کیونکہ وہ اتنے بااختیار ہوتے ہیں۔حکمرانوں کو قتل، کرپشن غرض کسی بھی جرم کی سزا نہیں دی جاتی کیونکہ ان کے پاس طاقت و دولت ہوتی ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ خواہ جمہوریت ہو یا آمریت، پاکستان میں دونوں نظاموں میں عدالتی نظام ایک ہی رہتا ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ فیصلہ ہوجاتا ہے کہ مارشل لاء کے احکامات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ہر قانون اور پورا عدالتی ڈھانچہ جوں کا توں رہتا ہے۔وہی جج، وہی وکیل ، وہی قانون ، وہی انصاف میں تاخیر یعنی عملاً ایک ہی جیسا ظلم۔حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ جمہوریت آمریت سے بہت اچھی ہے۔اگر کوئی کسی کی زمین پر قبضہ کرلے تو اس کو واگزار کروانے میں نسلیں تباہ ہوجاتیں ہیں۔جج فیصلہ نہیں کرتے۔یہ صرف عام شہری مقدمات کا حال ہے۔

جہاں تک جرائم کے مقدمات کا تعلق ہے تو اس کیلئے ایک مثال ہی کافی ہے۔ہم نے ایک دفعہ سپریم کورٹ کے ایک جج سے بات کی۔اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے زندگی میں اتنے مقدمات کا فیصلہ سنایا ہے،کبھی کسی غلط فیصلے کے حوالے سے

احساس جرم لاحق ہوا کہ یہ فیصلہ میں نے غلط کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! ایسے کچھ فیصلے ہیں کہ جن میں سے ایک فیصلہ مجھے نہیں بھولتا۔ میں نے ایک شخص کو سزائے موت سنائی تھی اگرچہ اس کی سزائے موت بنتی نہیں تھی۔ مگر چونکہ اس وقت کے وزیر اعظم نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے سزائے موت دینی ہے لہذا میں نے اس کی سزائے موت پر دستخط کر دیئے۔ یعنی سپریم کورٹ کا وہ جج وزیر اعظم کے کہنے پر ایک شخص کے قتل کا مرتکب ہوا۔

جیلوں میں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ لوگ پندرہ پندرہ سال سے جیلوں میں بند ہیں۔ ان کے مقدمے برسوں سے زیر سماعت ہیں اور انہیں ابھی سزا بھی نہیں سنائی گئی۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کا پورا خاندان بھی سزا بھگت رہا ہوتا ہے۔ ہفتے یا پندرہ دن بعد ایک ملاقات کی اجازت دی جاتی ہے تو اس ملاقات کیلئے بھی انہیں پولیس کو رشوت دینی پڑتی ہے۔ اگر قیدی سندھ کا ہے اور اسے ہری پور یا میانوالی جیل بھیج دیا گیا ہے اور اس کے رشتہ دار کراچی میں رہتے ہیں تو وہ چھ چھ ماہ بعد ایک پندرہ منٹ کی ملاقات کیلئے کراچی سے آتے ہیں۔ انسان ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہماری جیلوں میں جو ظلم و ستم ہو رہا ہے، وہ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ ان کے مقدمات عدالتوں میں پیش ہی نہیں ہوتے۔ اور اگر پیش ہوں تو طاقتور فریق ہمیشہ تاریخ سماعت آگے بڑھوا دیتا ہے، اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ برسوں تک تاریخ پر تاریخ پڑتی رہتی ہے اور فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ اس مقصد کیلئے وکیلوں اور ججوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ظلم کو دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جو ہماری عدالتوں میں ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ ہمیں لاہور ہائیکورٹ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں عدالت کے ایک کونے میں ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی تھی۔ ہم نے ایک آدمی سے اسکے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یہ بڑھیا دس سال سے روز یہاں آ رہی ہے۔ اسکا کوئی وکیل نہیں ہے اور نہ ہی اسے

پاکستان کے ایک اخبار میں چھپنے والا اشتہار جو ملک کے نظام عدل اور سیاست کی عبرتناک تصویر پیش کر رہا ہے۔

معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے۔ اسکا بیٹا قتل ہو گیا تھا اور کسی نے اسے یہ کہہ دیا تھا کہ تمہیں عدالت سے انصاف ملے گا۔ یہ دس سال سے ہر روز اسی امید پر آتی ہے کہ شاید کسی دن کوئی جج اس سے آ کے پوچھ لے کہ اماں! تمہارے ساتھ کیا ہوا اور پھر اسے انصاف مہیا کر دے۔ ایسے واقعات کو دیکھ کر انسان کو رونا آتا ہے۔ مگر وکلا نہ جانے کیسے پتھر دل ہیں کہ کسی نے بغیر معاوضے کے اسکا مقدمہ دائر کر کے آگے نہیں پہنچایا۔ سب کو پتہ ہے کہ دس سال سے بڑھیا آ رہی ہے اور وکیل کا معاوضہ نہیں ادا کر سکتی۔ یہ ہمارے ظالمانہ عدالتی نظام کی صرف ایک بھیانک مثال ہے۔ سوائے ظلم کے اس نظام میں کچھ بھی نہیں ہے۔

پاکستان میں بہت سے لوگ صرف اس وجہ سے پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اچھا وکیل کر کے اپنا دفاع ممکن بنا سکیں۔ جبکہ وڈیرے، بڑے بڑے قاتل اور جرائم پیشہ افراد بیسیوں قتل کر کے صرف اس لیے قانون کے شکنجے سے بچ جاتے ہیں کیونکہ انکا وکیل تگڑا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عام ہو چکی ہے کہ دس لاکھ کا وکیل کرنے کے بجائے پانچ لاکھ کا جج کر لو۔ یہ کس قسم کا شیطانی نظام ہے؟

انگریز اپنا گلا سڑا نظام چھوڑ گیا ہے جسے ہم آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انگریز خود موجود تھا تو یہ نظام کسی حد تک کام کر رہا تھا۔ کیونکہ اسکی اپنی حکومت تھی مگر وہ جاتے ہوئے یہ نظام اپنے غلاموں کے حوالے کر گیا۔ کسی بھی کچہری میں چلے جائیں، آپ بغیر رشوت دیئے ایک فائل بھی نہیں نکلوا سکتے۔ ریڈر، قاصد و نائب قاصد کو پیسے دیئے بغیر آپ مقدمے کی تاریخ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔ اور ججوں کے تو کیا ہی کہنے۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی شان میں نعوذ باللہ گستاخی ہو سکتی ہے مگر ان ججوں کے خلاف آپ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ جو کفر کے ظالمانہ نظام کو نافذ کرنے کیلئے یہاں بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھار تو سچ مچ حیرت ہوتی ہے کہ ان ججوں کو نیند کیسے آتی ہے؟ یہ جانتے ہوئے کہ ہزاروں لوگ مقدمات کے فیصلوں کے منتظر ہیں، سڑ رہے ہیں اور ان کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں، یہ جج تین تین مہینے کی چھٹیوں پر چلے جاتے ہیں۔ ججوں کیلئے تعطیلات کا نظریہ ہی ناقابل فہم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جج کو پتہ ہو کہ اس کے ایک دستخط سے ایک شخص بری ہو سکتا ہے کہ جس کا پورا خاندان انصاف کے حصول کیلئے تباہ و برباد ہو چکا ہے

اور پھر وہ جج یہ کہے کہ وہ تین ماہ کی تفریحی چھٹی پر جا رہا ہے؟ یہ تصور ہی محال ہے۔ مگر یہ ہمارے ہاں عام سی بات ہے۔ یہ ظلم کا نظام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ یہ پاکستان کے مسائل کا بوجھ اٹھانے اور انہیں حل کرنے سے قاصر ہے۔ آپ اس نظام میں جتنا چاہیں ایماندار اور محنتی چیف جسٹس لگا دیں مگر چونکہ اوپر سے لیکر نیچے تک یہ پورا نظام ہی شیطانی ہے، لہذا اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ایک بے گناہ آدمی کو پکڑا جاتا ہے۔ پولیس جعلی ایف آئی آر کاٹتی ہے۔ پھر اسے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اسے مجسٹریٹ یا سیشن کورٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جھوٹی گواہیاں پیش کی جاتی ہیں۔ رشوت کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ صرف سیاسی یا ذاتی دشمنی کی بنیاد پر سالوں اسے جیل میں رگڑا دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ملزم بے گناہ بھی ہو تو اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے برسوں جیل میں گزارنا پڑتے ہیں۔ اسکے علاوہ لاکھوں روپے بھی خرچ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے یعنی قاتل کو قتل نہیں کرو گے یا دیت وصول نہیں کرو گے تو معاشرے میں فساد پھیل جائیگا۔ طاقتور کو معاف کر دینے اور کمزور کو سزا دینے والا معاشرہ کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ بہت سے لوگ اس بات پر ناراض بھی ہونگے مگر جس قدر ظلم اور کفر ہمارے عدالتی نظام میں ہے، یہ امت مسلمہ اور پاکستانی قوم پر احسان ہوگا کہ اگر اس نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

ہمارے ملک میں بہت سے وکیل محض اس لیے کروڑ پتی ہیں کیونکہ وہ ڈاکوؤں، قاتلوں، زانیوں اور حرام خوروں کو جانتے بوجھتے ہوئے عدالتوں سے بری کروا دیتے ہیں۔ ہم نے کئی وکلاء سے یہ سوال بھی کیا کہ آپکو شرم نہیں آتی کہ آپکو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس آدمی نے بیس قتل کیے ہیں یا اس نے کروڑوں کی خیانت کی ہے، آپ پھر بھی اس کے وکیل بنے ہوئے ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنے پیشے میں اخلاقیات کو نہیں آنے دیتے۔ ہم معاوضہ لیتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ بات ایک شریف انسان

کے تصور سے بھی باہر ہے کہ انسان کو پتہ ہو کہ ایک شخص عورتوں، بچوں اور بے گناہوں کا قاتل ہے اور اس نے ان کو ذبح کیا ہے اور پھر وہ اس مجرم کا وکیل بن کر اسے بری کروا دے محض تکنیکی بنیادوں پر، جھوٹ بول کر یا رشوت دے کر۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ شریعت تو دور کی بات، کیا یہ نظام انسانیت کے قریب بھی ہوسکتا ہے؟ اور یہ وہ نظام ہے کہ جو آج پاکستان میں رائج ہے۔

اگر چہ کچھ وکلاء اچھے اور ایماندار بھی ہوتے ہیں۔ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ بھی وکیل تھے۔ آج بھی ہم ایسے وکلاء کو جانتے ہیں کہ جو صرف ان بے گناہ لوگوں کے مقدمات لیتے ہیں کہ جن کے مقدمات لینے والا اور کوئی نہیں ہوتا اور وہ یہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ظلم کے اس معاشرے میں کسی طرح ان لوگوں کو انصاف دلوا سکیں۔ علامہ اقبالؒ بھی ایسے ہی وکیل تھے۔ صرف بے گناہوں کے مقدمے لیتے تھے اور مہینے میں صرف چند مقدمات، کیونکہ ان کے خیال میں اتنے مقدمات سے ملنے والی آمدنی سے ان کا گزارہ ممکن تھا۔ ایسے درویش وکیل آج بھی اس دنیا میں بستے ہیں۔ مگر اکثریت ان وکلا کی ہے کہ جو مقدمہ لیتے وقت حرام حلال کی تمیز نہیں کرتے۔ ججوں کا پروٹوکول دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے نعوذ باللہ خدا بن کر چل رہے ہوں۔ پھر فیصلے کس پر کر رہے ہیں؟ کفر پر؟ بری کس کو کر رہے ہیں؟ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو؟ صرف اس لیے کہ ان کا وکیل تگڑا ہے جو کوئی نہ کوئی تکنیکی موہ شگافی نکال لیتا ہے۔ ہم نے صرف ایک جج کا قصہ بیان کیا ہے۔ ایسے اور بھی کئی جج ہیں۔ اس نظام میں ان سب کو احساس جرم تنگ کرتا ہے کہ جن کے دل میں ذرا سا بھی خوف خدا باقی ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں قاضی کے معیار کے متعلق حضور پاک ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جج تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو علم رکھتے ہیں اور انصاف کے مطابق صحیح فیصلے کرتے ہیں۔ وہ جنتی ہونگے۔ دوسرے وہ جو علم رکھتے ہیں مگر پھر بھی غلط فیصلے سناتے ہیں۔ وہ جہنمی ہیں۔ تیسرے وہ ہیں کہ جو علم بھی نہیں رکھتے اور پھر غلط فیصلے کرتے ہیں، وہ بھی جہنمی ہیں۔ اس معیار پر اگر دیکھا جائے تو آج کے اکثر جج جہنمی ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا کہ آپ قاضی بن جائیں۔ ابن عمرؓ کانپ کر رہ گئے اور کہا کہ میں

آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ مجھے قاضی نہ بنایا جائے۔حضرت عثمانؓ نے وجہ دریافت کی تو آپؓ نے فرمایا کہ کیا آپؓ نے حضورﷺ کی وہ حدیث مبارکہ نہیں سنی کہ جس کا مفہوم ہے کہ روز قیامت عادل جج بھی صرف یہ امید رکھ سکے گا کہ اس کی بچت ہو جائے۔لیکن جس نے غلط فیصلے کیے، اسکا ٹھکانہ جہنم ہے۔تمام صحابہ کرامؓ قاضی بننے سے خوف کھاتے تھے۔

قاضی بننا بہت بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ لوگوں کی زندگیوں کا فیصلہ قاضی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔آج لوگ جج بننے کیلئے بے تاب ہوئے جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس عہدے سے وابستہ مراعات عزیز ہوتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کل جب تم سے اللہ کی عدالت میں حساب لیا جائیگا تو کیا کرو گے؟ اس نظام میں جتنا ظلم ہو رہا ہے، ان ججوں کو اگر اسکا احساس بھی ہو جائے تو انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے کیونکہ روز محشر یہ اللہ کے سامنے جواب نہیں دے پائیں گے۔ یہ پورا نظام ہی جھوٹ، فراڈ اور مکر وفریب پر کھڑا ہے۔ جائز ترین مقدمے کے لیے بھی ہر مرحلے پر رشوت درکار ہوتی ہے۔ عالمی جائزہ کاروں کے مطابق پاکستان کی عدالتوں کا دفتری نظام دنیا کا کرپٹ ترین نظام ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ایسا نظام چلایا جائے یا اسے مکمل طور پر تبدیل کیا جائے؟ اصلاحات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب آپ کو بتاتے ہیں کہ خلافت راشدہ میں کیا ہوتا تھا۔اگر ہم اس کی تھوڑی سی تصویر ہی آپ کو دکھا دیں تو معلوم ہو جائیگا کہ پوری دنیا میں آج تک اس سے اسے بہتر عدالتی نظام نہیں بن پایا۔حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں سیدنا ابوبکرؓ کے زمانے میں قاضی تھا۔ایک ایک مہینہ گزر جاتا تھا مگر میرے پاس مقدمہ نہیں آتا تھا۔ایسا اس لیے تھا کیونکہ اس معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔مقدمات اس وقت آتے ہیں کہ جب لوگوں میں جھگڑے ہوں، اور جھگڑے تبھی ہوتے ہیں کہ جب معاشرے میں انصاف نہ ہو۔

صوبہ سرحد کے سابق گورنر اویس غنی نے کچھ سال پہلے ایک تجربہ کیا کہ جس کیلئے ہم انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔انہوں نے آئی جی سے بات کر کے ہری پور کے چند تھانوں کے باہر پنچائتیں بنا دیں کہ جو علاقے کے معزز ترین افراد پر مشتمل تھیں تا کہ مقدمہ تھانے میں جانے سے پہلے ہی ان پنچائیتوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے معاشرے میں نوے فیصد مقدمات انتہائی معمولی نوعیت

کے جھگڑوں سے شروع ہوتے ہیں اور پھر سالہا سال عدالتوں میں چلتے ہیں۔آپ کوسن کر حیرت ہوگی کہ ان تھانوں میں ۹۰ فیصد مقدمات درج ہونا بند ہوگئے کیونکہ وہ مقدمات پنچائیتوں میں حکومت کی نگرانی میں فوری طور پر حل ہونا شروع ہوگئے۔صرف قتل اور ڈکیتی جیسے سنگین مقدمات ہی تھانوں تک پہنچے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشرے کے اہم اور قابل عزت افراد کی ثالثی کے ذریعے بیشتر مقدمات کا فیصلہ گھنٹوں میں کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی کسی جج،وکیل،قانون اور تھانے کے بغیر۔عدل وانصاف کی فراہمی کے حوالے سے ہم نے جو چار شرائط ابتدا میں بتائی تھیں،اس طریقے کے ذریعے وہ چاروں شرائط پوری ہوسکتی ہیں۔سب کو انصاف ملے،فوری ملے،گھر کی دہلیز پر ملے اور مفت ملے۔سادہ سا اصول یہ بنتا ہے کہ اگر کوئی نظام یہ چاروں شرائط پوری کرتا ہے اسے اپنالیں اور جو نہیں کرتا اسے رد کردیں۔اعلیٰ عدلیہ،جج،وکلاء،عدالتیں،قوانین سب بے معنی ہیں اگر انصاف نہیں ہورہا۔اور یہ بات حقیقت ہے کہ اس ملک میں اس وقت انصاف نہیں ہے۔

آج دنیا کے جدید ترین عدالتی نظام بھی اس نظام کے قریب بھی نہیں پہنچتے کہ جو چاروں خلفائے راشدین سیدنا ابوبکرؓ،سیدنا عمرؓ،سیدنا عثمان،سیدنا علیؓ اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کہ جنہیں پانچواں خلیفہء راشد کہا جاتا ہے،نے بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔اس نظام میں تو قیدیوں کو بھی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا یعنی (Jail Manual) بھی بنادیا گیا تھا۔یہ نظام کئی سو سال تک اسلامی دنیا میں رائج رہا۔خلافت راشدہ کا نظام آج کے دور میں ایک رومانوی خواب دکھائی دیتا ہے اور اس کی مزید تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

۱۴

خلافت راشدہ میں اقلیتوں کے حقوق

پاکستان کے لیے جب ''قرارداد مقاصد'' پاس کی گئی تو اس میں فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ ہم نے پاکستان کو کس قسم کی فلاحی ریاست بنانا ہے۔اس میں صاف صاف لکھا تھا کہ بالا دستی قرآن وسنت کی ہوگی اور یہاں پر وہ نظام قائم کیا جائے گا کہ جو قرآن وسنت کا نظام ہوتا ہے۔قرارداد مقاصد ہمارے آئین میں شامل ہے۔ آج کے سیاست دان باقی آئین کی بات تو کرتے ہیں مگر قرداد مقاصد کو بیچ میں سے نکال دیتے ہیں۔وہ قرآن وسنت کی بالا دستی کی بات نہیں کرتے۔اگر آپ قرارداد مقاصد اور قرآن وسنت کی بالا دستی والے نکات کو نکال دیں تو پھر اس آئین کی حیثیت لاش کی سی رہ جاتی ہے اور آئین کوئی معنی نہیں رکھتا۔قرارداد مقاصد میں بھی یہ واضح لکھا ہے کہ پاکستان میں موجود غیر مسلم اقلیتوں کے تمام حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ جب ہم خلافت راشدہ کی بات کرتے ہیں تو ہم یہ خواب دیکھتے ہیں کہ پاکستان کو بھی ایسا ہی بنانا ہے۔ہم یہ کیوں نہیں کر سکتے؟ پاکستان تو سیدنا عمر فاروقؓ کی ریاست کے مقابلے میں انتہائی چھوٹی ریاست ہے۔قرآن وسنت کے نظام سے ہماری کیا مراد ہے؟اور اس نظام میں اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ آیئے اس کی مثالیں دیکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاصؓ جو کہ مصر کے گورنر تھے، ان کے بیٹے نے ایک عیسائی ذمّی کو کوڑے مار دیئے۔ وہ غریب عیسائی ذمّی گورنر کے خلاف شکایت لیکر حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ پہنچ گیا۔ حضرت عمرؓ نے دونوں باپ بیٹے کو مصر سے مدینہ بلایا اور عیسائی کو بھی بلوالیا۔ آپؓ نے عیسائی سے کہا کہ حضرت عمروؓ کے بیٹے کو کوڑے مار کے بدلہ لو۔ اور ساتھ ہی حضرت عمرو بن العاصؓ کو بھی ڈانٹا کہ اگر تم اپنے بیٹے کو سنبھالتے تو وہ یہ ظلم نہ کرتا۔ اقلیتوں کے حقوق کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ جہاں ایک غیر مسلم کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ مصر کے گورنر کی شکایت خلیفہء وقت سے کرے۔ اور خلیفہء وقت گورنر کو بلا کر سزا دے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوریت، آمریت یا بادشاہت بھی ایسے عدل اور احتساب کی مثال نہیں دے سکتی۔

حضرت عمرؓ کے دور ہی میں ایک بوڑھا یہودی بھیک مانگ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس علاقے کے گورنر کو خط لکھا کہ جب یہ جوان تھا تو آپ اس سے جزیہ لیا کرتے تھے۔ اب یہ بوڑھا ہوگیا ہے تو آپ اس سے بھیک منگوا رہے ہیں۔ لہذا اس کیلئے وظیفہ مقرر کریں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے غریب اور بوڑھے لوگوں کو، چاہے وہ یہودی اور عیسائی ہی کیوں نہ ہو، وظیفہ دینے کا سلسلہ بھی شروع کروادیا۔ معاشرتی فلاح و بہبود کا اتنا بڑا انظام، جو آج بھی دنیا قائم نہیں کرسکتی، حضرت عمرؓ قائم کر چکے تھے۔

اقلیتوں کے حقوق کی ایک اور مثال دیتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں شام کے ایک شہر پر مسلمانوں نے قبضہ کیا اور وہاں کے مقامی عیسائی لوگوں پر ٹیکس لگا دیا جو کہ غیر مسلموں پر ہوتا ہے۔ وہ ٹیکس ''جزیہ'' کہلاتا ہے۔ پھر مسلمانوں کی فوج کو کسی اور میدان جنگ میں جانے کی ضرورت پڑی تو مسلمانوں نے غیر مسلموں سے جو ٹیکس لیا ہوا تھا، وہ ان لوگوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب ہم آپ کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں لہذا جو ٹیکس ہم نے آپ سے لیا تھا ہم آپ کو واپس لوٹا رہے ہیں۔ انسانی تاریخ میں کبھی کسی فاتح فوج نے ایک مفتوح قوم کو ٹیکس واپس نہیں کیے، وہ بھی اس بات پر کہ جو وعدہ ہم نے آپ سے کیا تھا، وہ ہم پورا نہیں کر سکتے۔ وہ عیسائی روتے تھے کہ خدا کے واسطے آپ نہ جائیں یا جلدی واپس آجائیں۔ ہم آپ کے ماتحت اتنے امن وسکون سے رہتے ہیں۔ پہلے ہمیں ہمارے بادشاہوں نے صدیوں سے رسوا کر رکھا تھا اور ہمارے ہی عیسائی بادشاہوں نے ہم پر بہت ظلم کیے تھے۔ آپ مسلمان آئے ہیں تو ہمیں

عزت و آبرو ملی ہے، جان و مال محفوظ ہوئے ہیں اور عدل و انصاف ملا ہے۔ کائنات میں کوئی اور تہذیب اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے ایسی مثال نہیں پیش کر سکتی سوائے خلافت راشدہ کے۔

ہم اس نظام کو اپنانا چاہتے ہیں۔ جو اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ نظام کیا ہے؟ ان کو بس یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ کوڑے مارنے اور ہاتھ کاٹنے والا نظام ہے۔ ہمیں اس بحث میں پھنسا دیا جاتا ہے کہ کس فقے کو نافذ کریں گے۔ آپ خود سوچیں کہ ان باتوں سے فقہ کا کیا تعلق ہے؟ جب اعلیٰ ترین لوگوں کا ایسا احتساب ہو کہ گورنر کا بیٹا بھی ایک غلط کوڑا نہیں مار سکتا، تو پھر عام لوگوں میں کس کی جرأت ہو گی کہ وہ کوئی ظلم کرے۔

جب حجاج بن یوسف گورنر تھا تو وہ ظالم شخص کی حیثیت سے مشہور تھا گو کہ اس نے کچھ اچھے کام بھی کیے۔ اس نے محمد بن قاسمؒ کو ہندوستان پر حملے کیلئے بھیجا۔ اس کے زمانے میں لوگوں کا مزاج بن گیا تھا کہ وہ اس بات کا ذکر کیا کرتے تھے کہ آج کتنے لوگ مارے گئے اور کتنے قتل کیے گئے۔ بعد میں جو خلیفہ آئے ان کو عمارتیں بنانے کا شوق تھا تو سب اسی بات پر بحث کرتے تھے کہ کونسی عمارت زیادہ خوبصورت ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، کہ جن کو پانچواں خلیفہ راشد کہتے ہیں، ان کا زمانہ آیا تو، چونکہ وہ خود اللہ کے ولی اور درویش تھے، لہٰذا ان کے زمانے میں لوگوں کے موضوعات گفتگو بھی اسی طرح کے ہوتے تھے کہ رات نمازیں کتنی پڑھیں، تم نے روزے کتنے رکھے، عمرے کتنے کیے، روز قرآن کتنا پڑھتے ہو۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ جو خلیفہء وقت کا مزاج ہوتا ہے، وہی پوری قوم کا مزاج بن جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہی معاملہ تھا۔ آپؓ نے بڑے بڑے صحابہؓ سے پوچھا کہ کہیں میں بادشاہ تو نہیں بن گیا؟ اتنی خود احتسابی تھی۔ صحابہ کرامؓ نے ان کو یہی جواب دیا کہ اگر آپؓ نے بیت المال کا ایک درہم بھی غلط خرچ کیا ہے تو آپؓ بادشاہ ہیں۔ اگر آپؓ حلال خرچ کرتے ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو پھر آپؓ خلیفہ ہیں اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؓ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

اب یہ سوچنا ہے کہ نظام خلافت کا کون سا پہلو ایسا ہے کہ جو پاکستان پر نافذ نہیں کیا جا سکتا؟ یہ مستقبل سے اس قدر ہم آہنگ اور اتنا اعلیٰ نظام حکومت ہے کہ آج لوگ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ اُس دور میں اتنا بڑا انظام

چلتا کیسے تھا؟امن و عامہ کا حال یہ تھا کہ قافلے دمشق سے چلتے تھے اور چین تک جاتے تھے۔اشرفیاں، دولت اور تجارت کا مال سب کچھ ان کے ساتھ ہوتا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی ایک قافلہ بھی لوٹے یا لوگوں کو تکلیف دے۔اس وقت جو نظام بنائے گئے،ان کے تحت زکوٰۃ کی وصولی اور اسکی تقسیم،اور مال کی آمدن کے ایک ایک درہم کا حساب رکھا جاتا تھا۔خلیفہء وقت خود راتوں کو جاگ کر امت کی خبر گیری کرتے تھے۔

ایک بار حضرت عمرؓ گشت کر رہے ہوتے ہیں تو ایک گھر سے ماں اور بیٹی کی گفتگو کی آواز آتی ہے۔جس میں ماں بیٹی سے کہہ رہی ہوتی ہے کہ بیٹی ہم بہت غریب ہیں،تو فروخت کیلئے دودھ میں پانی ملا کر زیادہ کر لیتے ہیں۔بیٹی کہتی ہے کہ نہیں! اللہ دیکھ رہا ہے۔اگلے روز حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کا رشتہ لیکر اس گھر میں جاتے ہیں اور اس شریف بچی کا نکاح اپنے بیٹے سے کرواتے ہیں۔اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اسی نسل میں اسلام کے کس بطل جلیل نے جنم لیا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں حال یہ تھا کہ لوگ زکوٰۃ لیکر پھرتے تھے مگر کوئی لینے والا نہ تھا۔

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

اگلے باب میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جو گورنر تعینات کیے جاتے تھے ان کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔

۱۵

خلافت راشدہ میں گورنر کے فرائض وذمہ داریاں

اس باب میں ہم آپکو خلفائے راشدین کے دور میں تعینات ہونے والے حکمرانوں کے معیار، کردار اور ذمہ داریوں کے حوالے سے بتائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب گورنر تعینات کرتے تھے تو ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں؟ یہ ہم یہاں اس لیے بتانا چاہیں گے تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ وہ نظام ہوا میں نہیں چل رہا تھا بلکہ وہاں انتہائی سخت قوانین تھے۔ ان قوانین کو دیکھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج پاکستان یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اگر کوئی خیر ہے تو اس کی بنیاد خلافت راشدہ کے ان احکامات پر ہے کہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے گورنروں، قاضیوں، انتظامیہ یا عدلیہ کو دیئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں انتظامیہ اور عدلیہ ایک ہی ادارہ تھا۔ یعنی جو گورنر مقرر کیا جاتا تھا، وہ نماز بھی پڑھاتا تھا، قاضی بھی وہی تھا، سپہ سالار بھی ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ حکومتی معاملات کو بھی سنبھالتا تھا۔ اسلام میں اس پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک بندہ ہی سارے کام کر سکتا ہے مگر طریقہء کار وہی ہے کہ اسکا آئین قرآن وسنت ہوگا، مشاورتی کونسل ہوگی اور وہ سب کی رائے لیکر فیصلہ کرے گا۔ قرآن وسنت کے علاوہ آئین دستاویزی نہیں ہوگا بلکہ اجتہاد کی بنیاد پر وہ لچکدار اور متحرک ہوگا۔ شوریٰ مخصوص نہیں ہوگی، پارلیمنٹ Rotating ہوگی، یعنی جو بھی بہتر انسان ملے امت کے مفاد میں اس سے

رائے لی جاسکتی ہے۔آج انتخابات کے ذریعے، اہلیت سے قطع نظر، ایک شخص قومی اسمبلی کا پانچ سال کیلئے رکن بن جاتا ہے، جبکہ اس سے ہزار گنا بہتر لوگ پارلیمان سے باہر بیٹھے ہوتے ہیں اور قانون سازی اور شوریٰ میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا کیونکہ اس نااہل پارلیمان کو اپنی مدت پوری کرنی ہوتی ہے۔ پاکستان کی پارلیمان میں تو ویسے بھی جاہل انگوٹھا چھاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بی اے کی ڈگری کی شرط بھی ختم کردی گئی ہے تاکہ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ ہماری پارلیمان کے بدبخت اراکین فقط ملک وملت کو لوٹنا جانتے ہیں۔

اب ہم نظر ڈالتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دورحکومت میں گورنر کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا تھیں؟

۱۔وہ اس علاقے کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا، یعنی کورکمانڈر۔

۲۔صوبے کی انتظامیہ کا سربراہ بھی وہی ہوتا تھا، یعنی وزیراعلیٰ۔

۳۔نماز کی امامت اور جمعہ کا خطبہ دینے کا فریضہ بھی وہی سرانجام دیتا تھا یعنی مذہبی رہنما۔

یہی اسلامی نظام کی خوبصورتی ہے کہ ملک کا سربراہ سیاسی وعسکری فرائض کے ساتھ ساتھ دینی فرائض کی انجام دہی کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔اسلامی معاشرے میں جو شخص آپ کی نماز کی امامت نہ کرا سکے، وہ آپکا سربراہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یقین کیجیے کہ ہمیں کتنی خوشی ہوگی کہ اگر ہم اپنے ملک کے صدر یا سپہ سالار کی امامت میں نماز ادا کرسکیں۔آجکل کے حکمران تو اس قدر ناپاک ہیں کہ کوئی نیک شخص ان کے گھر کا کھانا بھی نہیں کھا سکتا کیونکہ انکا رزق ہی حرام ہوتا ہے، جمعے کی امامت تو دور کی بات ہے۔

۴۔ تمام محصولات، ٹیکسوں، جزیہ، خراج کی وصولی، زکوٰۃ لیکر تقسیم کرنا اور تمام اشیاء کی درآمدات و برآمدات اور منڈیوں اور بازاروں کی نگرانی کرنا بھی گورنر کی ذمہ داری ہوتی تھی، یعنی وزارت خزانہ کے معاملات۔

۵۔فوج کی نگرانی، اسلحہ، ان کی تنخواہ اور خوردونوش کا انتظام بھی گورنر کے سپرد تھا، یعنی وزارت دفاع کے معاملات۔

۶۔ حدود اللہ کا اجراء کرنا بھی گورنر کا کام تھا یعنی اس کی سلطنت میں کوئی غیر شرعی کام نہ ہو رہا ہو، وہاں شراب نہ پی جا رہی ہو، کوئی کسی کا حق نہ مار رہا ہو، فحاشی اور بدکاری کے اڈے قائم نہ ہوں اور وراثت کی صحیح تقسیم ہو رہی ہو۔ اسی طرح عوام کی اخلاقی اور دینی تربیت کی ذمہ داری اور ان کی جان و مال کی حفاظت بھی گورنر کے ذمے ہوتی تھی۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری۔ حضرت عمرؓ کے دور میں باقاعدہ پولیس کا محکمہ بھی قائم کر دیا گیا تھا۔

۷۔ مال غنیمت کی تقسیم،، غرباء، فقراء اور ضعیف العمر سپاہیوں اور عوام کی مالی پرورش اور ان کی پنشن جیسے کام بھی گورنر کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ یعنی بہبود آبادی اور فلاح عامہ۔

۸۔ ملک میں زراعت کی ترقی کے لیے اقدامات بھی گورنر طے کرتا تھا، یعنی وزارت زراعت کے فرائض۔

یہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دور حکومت کے دوران گورنر کی ذمہ داریاں تھیں۔ سیدنا عمرؓ نے تو ان ذمہ داریوں کو دوگنا کر دیا تھا۔ آج اس نظام کو پرانا اور فرسودہ کہا جا رہا ہے۔ مگر آج تمام ممالک مل کر بھی اس سے بہتر فلاحی ریاست نہیں بنا سکتے کہ جیسی خلفائے راشدین نے بنائی تھی۔ اس ریاست میں بچہ بھی پیدا ہوتا تھا تو اسکا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اس جدید دنیا میں آپ جس بھی وزارت کا نام لیں وہ اس وقت قائم ہو چکی تھی۔ سارے محکمے بنا کر یہ کام شروع کیے جا چکے تھے۔ اس وقت گورنر فقط سیاسی رہنما نہیں ہوتا تھا بلکہ معاشرتی، معاشی، اخلاقی، فوجی اور روحانی رہنما بھی ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے ماتحت لوگوں کے بارے میں جوابدہ تھا۔

گورنروں کا احتساب اتنا کڑا تھا کہ اس کو سوچ کر ہی آج رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس دور میں جو جتنا بڑا تھا، اس کا اتنا ہی سخت احتساب کیا جاتا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، جنہوں نے ایران فتح کیا، نے گھر بنایا تو اس میں لوگوں کیلئے ایک انتظار گاہ بنوا دی۔ اس پر لوگوں نے اس گھر کو ''قصر سعدؓ'' کا نام دے دیا۔ حضرت عمرؓ تک جب یہ شکایت پہنچی کہ آپؓ سائلوں کو انتظار کرواتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان کی طرف اپنا نمائندہ بھیجا اور پہلا حکم یہ دیا کہ سعدؓ سے بات بعد میں کرنا، پہلے اس انتظار گاہ کے دروازے کو آگ لگا دینا۔ بعد میں جب حضرت سعدؓ نے اپنی صفائی پیش کی تو مسئلہ حل ہوا، ورنہ حضرت عمرؓ نے اپنے سخت انداز

میں احتساب کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس فلاحی ریاست میں خلیفہء وقت کی تنخواہ تقریباً تین درہم روزانہ تھی یعنی موجودہ دور میں ایک مزدور کی تنخواہ سے بھی کم۔ اس پر بھی سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بچوں کو یہ وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد جائیداد بیچ کر وہ پیسہ بھی بیت المال کو لوٹا دینا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور حکومت میں لوگ زکوٰۃ لے کر پھرتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ جب اس طرح کے خلیفہ اور اس طرح کا نظام ہوگا تو پھر امت کے حالات راتوں رات بہتر ہو جائیں گے۔

اب ہم آپ کو ان احکامات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سپہ سالاروں کو جنگ پر روانہ کرتے ہوئے جاری کیے۔ حضور ﷺ سے پہلے کے دور میں، دنیا میں دوران جنگ، انسانی حقوق کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔ رومی اور فارسی سلطنتوں کی تاریخ سب کو معلوم ہے۔ لاکھوں لوگ بے دردی سے قتل کر دیئے جاتے تھے۔ جنگ کے دوران عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ شہروں کو برباد کیا جاتا، زرعی زمینیں تباہ کر دی جاتیں، مال مویشی ہلاک کر دیئے جاتے اور پانی کے کنوؤں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ کی سنت ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اس سنت کو نافذ کرنے والے خلفائے راشدین کا رومی اور فارسی سلطنتوں سے براہ راست تصادم ہوا اور تاریخ نے ان تہذیبوں کے مقابلے میں اسلام کی اعلیٰ ترین اقدار اور اخلاقیات کو پہلی دفعہ دیکھا۔ آج جنگی قوانین کے حوالے سے جنیوا کنونشن کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ جنگ کے دوران انسانی حقوق کی پامالی نہیں ہونی چاہیے مگر اس جنیوا کنونشن پر متفق ہونے والی بڑی بڑی جدید جمہوریتوں اور آمریتوں کا اصل چہرہ افغانستان، عراق، ویت نام، کشمیر، فلسطین اور دیگر جنگ زدہ علاقوں میں نظر آ جاتا ہے کہ جہاں یہ لوگوں کا بے دریغ قتل عام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی

کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

جنگی قوانین اور انسانی حقوق کے حوالے سے اگر خلافت راشدہ کے قوانین پر عمل کر لیا جائے تو خدا کی قسم! یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو جنگی مہم پر روانہ کرنے سے قبل

چند نصیحتیں کیں کہ جو آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہی احکامات آگے جا کر دورِ خلافت کے بنیادی جنگی اصول ٹھہرے۔ آپؓ نے فرمایا:

''اے مجاہدین اسلام! تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیلئے شام جیسے دور دراز علاقے میں جا رہے ہو۔ اس موقع پر میں تمہیں چند نصیحتیں کرتا ہوں۔ خیانت، بدعہدی اور چوری مت کرنا۔ جنگ میں کسی کا مُسلہ نہ کرنا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل مت کرنا۔ کھجور کے درخت اور پھلدار درخت نہ کاٹنا۔ بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ کو کھانے کے علاوہ قتل مت کرنا۔ راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس جاؤ گے کہ جو مختلف قسم کے کھانے برتنوں میں ڈال کر تمہیں پیش کرینگے، وہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا۔ تم ایسے لوگوں سے ملو گے کہ جنہوں نے سر کا درمیانی حصہ منڈوایا ہوگا مگر چاروں طرف بڑے بڑے بال ہونگے، انہیں قتل نہ کرنا۔ اپنی حفاظت اللہ کے نام سے کرنا۔ اللہ تمہیں شکست اور وباء سے محفوظ رکھے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

ان حیرت انگیز جنگی قوانین میں پہلے ایک بنیادی اصول بتا دیا گیا کہ جھوٹ، چوری اور خیانت ایک مسلمان فوج کو زیب نہیں دیتی۔ جنگ میں بھی ایک ایسا کردار اپنانے کا حکم ہوا کہ جو ایک ولی اللہ کا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ جیسا آجکل کیا جاتا ہے کہ جنگ کے دوران سب کچھ جائز ہے۔ اس بات پر سختی سے پابندی لگا دی گئی کہ فوج کسی حال میں بھی عام لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار اور قتل و غارت نہیں کر سکتی۔ مسلمان فوج کو ہر حال میں مستحکم اور باوقار رہنا ہے۔ اس زمانے میں یہ عام رواج تھا کہ فاتح فوج مفتوح قوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیا کرتی تھی۔ بعد کے آنے والے دور میں چنگیز خان بھی کھوپڑیوں کے مینار بنایا کرتا تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے سختی سے منع فرمایا کہ ایسے کسی قوم کو تباہ نہیں کرنا۔ مسلمان فوج کو یہ واضح کر دیا گیا کہ آپ زمین میں فساد پھیلانے نہیں جا رہے ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہاں کے لوگوں کو اجتماعی سزا دینے کیلئے وہاں کے مویشی اور جانور ہی مار دو۔ اگر کھانا ہو تو پھر بے شک ذبح کرنے کی اجازت ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ وہاں پہ مندر اور عبادت گاہیں وغیرہ ہونگی اور ایسے لوگ ہونگے کہ جو عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ ایسے لوگوں کو تنگ نہیں کرنا کہ جو دنیا میں مسکین اور مجذوب ہیں۔ ان

جنگی قوانین میں عورتوں، بچوں، زرعی زمینوں، عبادت گاہوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا احترام کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔آپ ان نکات کو دیکھ لیں۔جنیوا کنونشن کو سومرتبہ بھی بہتر بنانے کی کوشش کر لی جائے،تو پھر بھی وہ خلافت راشدہ کے ان نکات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

آئندہ آنے والی صدیوں میں جنگی قوانین کے حوالے سے یہ خطبہ مسلمانوں کا معیار بن گیا۔یہ مدینہ کنونشن تھا جو جنیوا کنونشن سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔یہ وہ خلافت راشدہ ہے کہ جس کی ہم بات کرتے ہیں۔

آجکل ذرائع ابلاغ میں ہم پر بہت تنقید کی جارہی ہے کہ یہ چودہ سوسال پرانا نظام پاکستان میں رائج کرنا چاہ رہے ہیں جبکہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہے۔اوپر کی بحث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ درحقیقت خلافت راشدہ کا نظام مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ، انتہائی ترقی یافتہ اور منظّم ہے۔اس سے زیادہ بہتر سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام بن ہی نہیں سکتا کہ جو چاروں خلفائے راشدین سیدنا ابوبکرصدیقؓ،سیدنا عمرؓ،سیدنا عثمانؓ اور سیدنا علیؓ اوران کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قائم کر کے دکھایا۔حضرت عمرؓ کے زیراثر تقریباً بائیس لاکھ مربع میل کا علاقہ تھا جو تقریباً چین، یورپ اور افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ علاقہ نپولین،سکندراعظم اور چنگیز خان کی سلطنتوں سے بھی زیادہ بڑا تھا۔اتنے بڑے علاقے میں انتظام وانصرام کے حوالے سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔جو مسائل پیدا بھی ہوئے وہ دنوں یا منٹوں میں حل کر لیے جاتے تھے۔وہاں کبھی خوراک کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔امن عامہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔کبھی معاشی بدحالی نہیں ہوئی،کبھی کساد بازاری نہیں ہوئی۔وہاں لوگوں کی جان و مال اورعزت و آبرو خطرے میں ڈالنے والے فسادات کبھی نہیں ہوئے تھے۔سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس سلطنت کا کوئی دستاویزی آئین نہیں تھا۔وہاں کوئی باقاعدہ پارلیمنٹ نہیں تھی۔خلافت راشدہ کا سیاسی اور انتظامی نظام قرآن وسنت،اجتہاد اور شوریٰ کی بنیاد پر بہت مختلف،متحرک اور لچکدار رہے۔

ہرزمانے کے حالات کے مطابق انسانی معاشرے کی ضروریات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔انسانی تاریخ میں کوئی آزاد قوم کبھی بھی کسی لکھے ہوئے آئین پر نہیں چلی کیونکہ وہ آئین مخصوص وقت، حالات اور ضرورت کے مطابق قوانین بنا دیتا ہے اوران سے ہٹ کر چلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔وہ آئین ایک انسان کا لکھا ہوا

ہوتا ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا لکھا نہیں ہوتا۔ جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے جاتے ہیں اور ان بدلتے حالات کے تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں جو کہ ایک انسان کے لکھے ہوئے آئین میں پورے نہیں ہوتے۔ اسی لیے آج برطانیہ میں بھی کوئی دستاویزی آئین موجود نہیں ہے بلکہ وہ تاریخ، رواج اور حالات کے مطابق اپنی قانون سازی کرتے ہیں۔ اسی لیے جب قائداعظمؒ سے بھی دریافت کیا گیا کہ پاکستان کا دستور کیسا ہوگا تو آپؒ نے فرمایا: ''میں کون ہوتا ہوں پاکستان کا دستور دینے والا۔ پاکستان کا دستور تو چودہ سو سال پہلے آ چکا ہے یعنی قرآن اور سنت''۔

یہ واقعہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی مہم پر روانہ کیا تو حضور ﷺ نے ان سے یہ پوچھا کہ تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ فرمایا یا رسول اللہ ﷺ! قرآن سے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اگر تم کو قرآن میں نہ ملے تو۔ فرمایا: یا رسول اللہ ﷺ! سنت سے۔ حضور ﷺ نے پوچھا اگر میری سنت میں بھی تمہیں نہ ملے تو۔ فرمایا تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا۔ حضور ﷺ نے اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور پھر آنے والے وقتوں کیلئے یہ قانون بن گیا۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے لیے دعا فرمائی اور پھر تمام مسلمانوں نے اس سنت کو اپنا لیا۔ مسلمانوں کا آئین قرآن، سنت اور اجتہاد ہے۔ یہ بنیادی ستون ہیں کہ جو اصل میں ایک اسلامی ریاست کا آئین ہوتے ہیں نہ کہ انسانی ہاتھ سے لکھی ہوئی کوئی دستاویز۔

اس حوالے سے جو بہترین عملی مثال ہمیں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ، بلکہ تمام خلفائے راشدین، کا یہ طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا یا کوئی بھی فیصلہ کرنا ہوتا تو بہترین صحابہؓ پر مشتمل شوریٰ بنائی جاتی تھی جو مل بیٹھ کر فیصلہ کرتی۔ کوئی بھی سیاسی بحران ہوتا، انتظامی مسئلہ درپیش ہوتا، کوئی نیا شہر آباد کرنا ہوتا، نئی نہر کھدوانی ہوتی، نئے قوانین تشکیل دینے ہوتے، مفتوحہ علاقوں سے متعلق کوئی معاملہ ہوتا، گورنر تعینات کرنا ہوتا، وظیفے لگانے ہوتے، مال غنیمت تقسیم کرنا ہوتا، مفتوحہ علاقوں کی زمین کی تقسیم کا مسئلہ ہوتا، زرعی اصلاحات کرنی ہوتیں، یعنی ریاستی فرائض سے متعلق جو بھی فیصلہ کرنا ہوتا تو سب سے پہلے چند بہترین صحابہؓ کو بلایا جاتا جنہیں قرآن وسنت کے علم کے علاوہ دنیاوی معاملات کا بھی تجربہ ہوتا۔ ان کے

سامنے مسئلہ رکھ دیا جاتا تھا اور اس پر بحث ہوتی تھی۔ وہ بحث مسجد نبوی میں ہوتی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی بھی آ کر اپنی رائے دے سکتا تھا۔ اس سے زیادہ جمہوری نظام آج تک وجود میں نہیں آیا۔ ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جب سیدنا عمرؓ نے کسی سے مشورہ کیے بغیر تنہا کوئی فیصلہ سنا دیا ہو یا قرآن و سنت سے متصادم کوئی فیصلہ کیا ہو۔ متحرک شوریٰ یعنی (Rotating Parliment) کا یہ تصور بہت حیرت انگیز تھا۔

ہمارے ہاں پانچ سال کیلئے ایک ہی پارلیمنٹ مقرر کر دی جاتی ہے کہ جس میں تمام احمق جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ کوئی جاگیردار، کوئی وڈیرا ہے، کوئی فرقہ پرست مُلا ہے، کوئی دہریہ ہے اور کوئی سیدھا گاؤں سے اٹھ کر آیا ہے۔ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے

اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ ہم ان کے شعر کو وسعت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم کیا ہے، قوموں کی امامت کیا ہے، اسے کیا جانیں یہ دو ٹکے کے سیاستدان۔ ان دو ٹکے کے سیاست بازوں نے آج تک ملک و قوم کی بہتری کیلئے کوئی ایک فیصلہ بھی نہیں کیا۔ ان میں سے کوئی بھی شخص کسی شعبے کا ماہر نہیں ہے۔ یہ سب جاہل ہیں۔ کوئی بھی قوموں کی رہنمائی کے حوالے سے فراست نہیں رکھتا۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ فلسفہ کیا ہے؟ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ قومیں ترقی کیسے کرتی ہیں؟ ان کا تزکیہ و تربیت کیسے کی جاتی ہے؟ تعلیمی نظام کیونکر درست کیا جا سکتا ہے؟ معیشت کیسے بہتر بنائی جا سکتی ہے؟ امر

قومی اسمبلی اور سینٹ کے ایک اجلاس کا خرچہ 4 کروڑ روپے

قومی اسمبلی کے مجموعی اخراجات ایک ارب 80 کروڑ 30 لاکھ روپے سے زیادہ ہیں، سینٹ کا کل بجٹ ایک ارب 4 کروڑ روپے ہے

ایک رکن پارلیمنٹ پر 71 لاکھ روپے سے زیادہ خرچ ہوتا ہے، ماہانہ تنخواہ 68 ہزار اور 75 ہزار روپے مختلف الاؤنسز کے ملتے ہیں

اپنے حلقے سے اسلام آباد تک سالانہ 20 ریٹرن فضائی ٹکٹ ملتے ہیں، اپنے یا خاندان کے استعمال کیلئے سال میں 3 لاکھ کے سفری واؤچرز اس کے علاوہ ہیں

قائمہ کمیٹی کا اجلاس 3 دن سے زائد ہونے کی صورت میں 8800 روپے یومیہ اضافی، ٹکٹ بھی ملتا ہے، اجلاس کے ہر سیشن پر یومیہ 4 ہزار الاؤنس اور ٹرانسپورٹ الاؤنس دیا جاتا ہے

ارکان پارلیمنٹ کی اکثریت میڈیکل الاؤنس کا غلط استعمال کرتی ہے، بعض کا ماہانہ میڈیکل بل 10 لاکھ سے تجاوز کر جاتا ہے، خاندان کو میڈیکل کی لامحدود سہولیات میسر ہیں

بالمعروف ونہی المنکر کوکس طرح نافذ کیا جاسکتا ہے؟ اورآج کے دورقرآن وسنت کی بنیاد پر اجتہاد کے ذریعے امت کے مسائل کس طرح حل کیے جاسکتے ہیں؟ انہیں ان تمام نازک معاملات کی الف، ب بھی نہیں معلوم ہوتی۔

پاکستان کے پارلیمانی نظام پر اربوں روپیہ خرچ ہورہا ہے مگر یہ کسی کام کا نہیں۔ اسلام ہمیں اس سے بہتر نظریہ دے چکا ہے۔ وہ نظریہ بہترین اور ماہر افراد کی تعیناتی اور شوریٰ کے ارکان کے بدلتے رہنے پر مبنی ہے۔ مثلاً اگر زراعت کے حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش ہوتو زرعی ماہرین سے مشورہ لیا جائے۔ دفاع سے متعلق معاملہ ہوتو دفاعی امور کے ماہرین سے مشورہ لیا جائے۔

خلافت راشدہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جن کا مرتبہ اتنا بلند تھا، جو اتنے عقلمند اور سوجھ بوجھ والے لوگ تھے کہ جنہیں حضرت عمر فاروقؓ ہر دفعہ بلایا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں عشرہ مبشرہ، جنگ بدر کے صحابہ، انصار اور مہاجرین اور حضور ﷺ کے مقرب صحابہ شامل تھے۔ وہاں بھی مختلف لوگوں کے مختلف درجے تھے۔ مگر وہاں بہترین ہونے کا معیار یہ تھا کہ کسی نے حضور ﷺ کی صحبت میں کتنا عرصہ گزارا اور کتنا فیض حاصل کیا۔ درجات میں بلندی کا اندازہ انسان کے تقویٰ سے لگایا جاتا تھا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ کیا وہ لوگ بدری ہیں؟ مہاجرین اور انصار میں سے ہیں؟۔ جو لوگ مرتد ہوگئے تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے انہیں ریاستی معاملات سے دور رکھا جاتا تھا۔ ان سے رائے نہیں لی جاتی تھی۔ اقبالؒ نے یہی عنصر ذہن میں رکھتے ہوئے موجودہ جمہوریت پر طنز کیا تھا کہ:

جمہوریت وہ طرز حکمرانی ہے جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

گدھا اور گھوڑا برابر نہیں ہوسکتے۔ ہزار جاہل اور ایک عالم رتبے اور عقل وفہم میں برابر نہیں ہوتے۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں ایک عالم دین اور دانشور کہ جس نے اپنی ساری زندگی حصول علم اور دین کو سمجھنے میں گزار دی اور جو تاریخ اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کو جانتا ہے اور ایک جاہل انسان کہ جسے نہ دین اور شریعت کا پتہ ہوتا ہے اور نہ ہی معاشیات کا، نہ ہی ملک وقوم کی فلاح کے بارے میں

جانتا ہے اور نہ ہی شہری اصول وقواعد کا علم رکھتا ہے، دونوں کی رائے برابر تصور کی جاتی ہے۔ دونوں کا ووٹ برابر گردانا جاتا ہے۔ چونکہ دونوں کے پاس شناختی کارڈ ہے لہذا دونوں ووٹ دے سکتے ہیں۔اس سے زیادہ جاہلانہ نظام کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ بہت بنیادی سوال ہے کہ ہم آئندہ آنے والے وقتوں میں پاکستان کو کس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں؟

ہمارے ملک کے ایک مشہور کالم نگار ہیں،عطاءالحق قاسمی۔روزن دیوار کے نام سے بڑے خوبصورت کالم لکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے ایک کالم میں لکھا کہ جب وہ سوئٹزرلینڈ گئے تو وہاں جرائم دکھائی نہیں دیئے۔ انہوں نے جب ایک پولیس والے سے پوچھا کہ یہ کیسا نظام ہے کہ جرائم نظر نہیں آتے؟ تو اس پولیس والے نے جواب دیا کہ ''کیا آپ نے حضرت عمر فاروقؓ کا نظام نہیں دیکھا؟''

ہمارے ایک دوست کا بیٹا تعلیم حاصل کرنے جرمنی گیا تو اس نے بتایا کہ وہاں کے قانون پڑھانے والے سکولوں میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے تصویری خاکے لگائے گئے ہیں کہ قانون دینے والوں میں یہ عظیم ترین لوگ ہیں۔اسی طرح قائداعظمؒ جب لنکن انز میں تعلیم حاصل کرنے گئے تو دیکھا کہ وہاں دنیا کے بڑے بڑے قانون دانوں کے ناموں کی فہرست لگائی گئی تھی جس میں حضورﷺ کا اسم مبارک سرفہرست تھا۔یہی وجہ تھی کہ قائداعظمؒ نے اسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لیا۔

اگر خلافت راشدہ والا نظام کسی کافر نے بنایا ہوتا تو یہ لوگ قیامت تک وہی نظام نافذ رکھتے لیکن چونکہ وہ مسلمانوں کا بنایا ہوا ہے لہذا وہ لوگ اس سے حسد کرتے ہیں۔دنیا کے کسی بھی سیاسی نظام میں اگر آپ کو کوئی بھی خیر نظر آتی ہے تو وہ خلافت راشدہ سے لی گئی ہے۔کئی یورپی ممالک فلاح و بہبود کے مختلف منصوبوں پر کام کررہے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا وظیفہ لگادیا جاتا ہے۔انسان بوڑھا ہوجاتا ہے تو اسے پنشن ملنا شروع ہوجاتی ہے۔فلاحی ریاست کا یہ تصور حضرت عمرؓ بہت پہلے دے چکے ہیں۔

ہمارے ملک میں صورتحال مکمل طور پر مختلف ہے۔خواہ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوجائے مگر آئین کی شقوں سے انحراف کرنا جرم سمجھا جاتا ہے اور انہی پر عمل کیا جاتا ہے کہ جیسے نعوذ باللہ وہ شقیں وحی کے ذریعے اتری ہوں۔کسی گمنام وکیل کے لکھے ہوئے کو پتھر پر لکیر سمجھ لینا اور اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ جانا،

چاہے قوم تباہ ہی کیوں نہ ہو جائے، یہ انتہائی احمقانہ اور جاہلانہ بات ہے۔ پاکستان کے موجودہ آئین میں یہ لکھا ہی نہیں ہوا کہ قوموں کی امامت کرنے کیلئے پاکستان کیا کرے۔ یہ غلام قوم کو غلام بنائے رکھنے کا ایک ہتھکنڈہ ہے۔

قائداعظمؒ کی سوچ اور فکر آزاد اور دوررس تھی لہذا آپؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کا آئین قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا۔ قائداعظمؒ نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ ہمیں قرآن وسنت اور معاشرے کے بہترین افراد سے رہنمائی لینی ہے اور پھر ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خانؒ نے قرارداد مقاصد پیش کی۔ ہم مولویوں کی بات نہیں کر رہے۔ ہم قائداعظمؒ اور لیاقت علی خانؒ کی بات کر رہے ہیں۔ لیاقت علی خانؒ نے

قرارداد مقاصد پیش کرتے وقت جو تقریر کی تھی، اس میں فرمایا تھا کہ اس قرارداد کا پیش کیا جانا پاکستان بننے کے بعد عظیم ترین موقع ہے۔ اس قرارداد کا پہلا جملہ یہ ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب مقرر کیا گیا ہے تاکہ اللہ کا حکم نافذ کرے۔ پھر وہ سیاسی عمل ہے کہ آپ حکمرانوں کا انتخاب کس طرح اور کتنے عرصے کیلئے کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں بدلتے حالات کے مطابق شوریٰ اور اجتہاد سے طے کی جاسکتی ہیں۔ اس کیلئے کوئی انسانوں کا لکھا ہوا آئین ضروری نہیں ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن ہے اے مرد مسلماں

اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

جدت کردار کے لحاظ سے خلافت راشدہ کا نظام اس قدر متحرک تھا کہ دنیا کے کسی بھی شخص کو مشیر مقرر کیا جاسکتا تھا۔ یہ عمل صرف شوریٰ تک محدود نہیں تھا۔ آپ دنیا کے بہترین افراد سے کسی بھی معاملے پر مشورہ لے سکتے تھے۔ مشورہ لینے سے پہلے اس شخص کا کردار اور قابلیت دیکھی جاتی تھی۔

اس نظام میں چونکہ خلیفہ قرآن وسنت کے دائرہ کار میں رہ کر کام کرتا تھا، لہذا اس کے خلاف بغاوت حرام تھی۔

خلیفہ کو اس کی ذمہ داریوں سے ہٹایا نہیں جاتا تھا۔ خلیفہ، خلافت کے عہدے پر تاحیات تعینات ہوتا تھا۔ شوریٰ کے اراکین کو معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا تھا، وہ فی سبیل اللہ کام کرتے تھے۔ اگر ہم بھی اسی اصول پر عمل کرنا شروع کردیں تو ممبران قومی وصوبائی اسمبلی کی تنخواہوں اور دیگر مراعات پر خرچ ہونے والے اربوں روپے بچ جائیں گے۔ اسمبلیوں کا حصہ بننا ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ کسی کا پیدائشی حق نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہمارے باپ اور دادا بھی ایوان اقتدار کا حصہ تھے لہٰذا اب یہ ہمارا بھی حق ہے۔ یقین کیجیے کہ اگر ان کی تنخواہیں اور ان کے عہدوں سے وابستہ مراعات ختم کردی جائیں اور ان کا ویسا کڑا احتساب کیا جائے کہ جیسے خلافت راشدہ میں حکمرانوں کا ہوتا تھا، تو آج ان میں سے کوئی بھی انتخابات میں کھڑا ہی نہیں ہوگا۔

ہر کوئی مستِ مے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے!
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

۱۶

خلافت راشدہ اور ہمارے عدالتی نظام میں فرق

خلافت راشدہ میں بائیس لاکھ مربع میل پر قائم ہونے والی جس سلطنت کی ہم بات کر رہے ہیں وہ نپولین، چنگیز خان اور سکندر اعظم کی سلطنت سے زیادہ بڑی تھی۔ اس میں جو نظام حکومت ترتیب دیئے گئے اور جو اقدار فروغ پائیں، وہ اس قدر آزاد اور مستقبل سے ہم آہنگ ہیں کہ صاف نظر آتا ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان قوم دنیا پر حکومت کرے گی تو انہی اقدار پر کرے گی۔ اگر ہم پاکستان کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں تو بلا شبہ ہمیں خلافت راشدہ کا نظام اپنانا پڑے گا۔ ہمیں کسی کی بدعا نہیں لگی ہوئی کہ ہم مغرب کی جمہوریت یا پھر اشتراکیت ہی کو نافذ کریں۔ ہمیں تو خلافت راشدہ کے نظام کو نافذ کرنے کی دعا لگی ہوئی ہے۔ یہ نظام ہمارے نصاب کا حصہ نہیں ہے لہذا ہماری نئی نسل کو اس کی تفصیل معلوم نہیں۔ ہمارے نام نہاد دانشور جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں یا پھر جاہل ہیں۔ خلافت راشدہ کے نظام کو پرانا اور فرسودہ کہنے والے سے زیادہ بڑا جاہل کوئی نہیں ہوسکتا کیونکہ دنیا کے تمام موجودہ نظاموں میں پائی جانے والی مثبت چیزیں چاہے وہ انسانی حقوق ہوں یا معاشرتی نظام، معاشی ترقی ہو یا معاشرتی عدل وانصاف، خلافت راشدہ کے نظام سے ہی مستعار لی گئی ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک تو اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عمرؓ

اور حضرت عثمانؓ سے سیکھا ہے۔ ایسا نظام فرسودہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ ایسے خوبصورت نظام کو فرسودہ کہنے والے کو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں تباہ و برباد کرے۔ اگر ہم خلافت راشدہ کا نظام یہاں نافذ کر دیں تو یہ پاکستان کیلئے رحمت ہوگی۔

خلافت راشدہ کے نظام میں عدل و انصاف مثالی تھا۔ انصاف اتنا تھا کہ مقدمات ختم ہوگئے تھے۔ مقدمات تبھی ہوتے ہیں کہ جب کسی کو پتہ ہو کہ وہ ظلم کرسکتا ہے اور تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں لوگوں کو اللہ کا خوف بھی تھا اور انہیں جرائم پر فوری سزا ملنے کا ڈر بھی ہوتا تھا، لہذا وہ جرم کرنے سے باز رہتے تھے۔ اس نظام کی موجودگی میں امن عامہ کا مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ حکومتی معاملات اتنے نظم وضبط سے چلائے جاتے تھے کہ ہر شخص مطمئن تھا۔

ہم نے جنیوا کنونشن کے حوالے سے بھی بات کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ چودہ سو سال پہلے ہی اس سے سو گنا بہتر جنگی قوانین بنا کر حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو دے چکے تھے۔ جنیوا کنونشن میں لوگوں کے ذاتی کردار کی بلندی کے حوالے سے کچھ نہیں کہا گیا۔ آج کا فوجی چاہے اپنی ذاتی زندگی میں شراب پیئے، زنا کرے یا کسی اور اخلاقی برائی کا شکار ہو، کہا جاتا ہے کہ یہ اس کی نجی زندگی ہے۔ مگر خلافت راشدہ میں یہ ممکن نہیں تھا۔ خلافت راشدہ کے نظام کے تحت فوجیوں کے ذاتی کردار کی جانچ پرکھ بھی کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا کردار اس قدر اعلیٰ ہوتا تھا کہ نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز ہوتی تھی، وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو تھے۔ وہ حلقہء یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت ہوتے تھے۔ وہ رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہوتے تھے۔ ان کے سامنے مال غنیمت اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگے ہوتے تھے مگر وہ ایک ایک اشرفی لا کر خلیفہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ انسان ہیں۔ جبھی تو ایرانیوں نے انہیں دیکھ کر شور مچا دیا تھا ''دیواں آمدند، دیواں آمدند''۔ اقبال نے انہی مسلمانوں کے حوالے سے فرمایا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے

جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

یہ کونسے پراسرار وجود تھے؟ یہ کونسی نسل تھی؟ یہ کردار کیسے پیدا ہوگیا؟ ان مسلمانوں کا اخلاقی کردار اس قدر اعلیٰ اس لیے تھا کیونکہ ان کا خلیفہ اور انکا حکمران بہت بلند کردار کا حامل ہوا کرتا تھا۔جیسا باپ ہوتا ہے، اولاد بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔قوموں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔جیسا امیر ہوتا ہے،قوم بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے۔حضرت عمرؓ نے عدل وانصاف کے حوالے سے نئے معیار قائم کیے۔آج دنیا کا بڑے سے بڑا نظام عدل بھی ویسا معیار نہیں اپنا سکتا جو حضرت عمرؓ نے بنایا تھا۔اسی لیے آج دنیا کے کئی ممالک یہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کے نظام عدل کی ہی پیروی کررہے ہیں۔

اسلام کی دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں مختلف جرائم کی جو سزائیں دی گئی ہیں،ان کا مقصد معاشرے کی فلاح ہے۔آج مختلف ممالک میں بھی ایسا نظام رائج ہے کہ کچھ جرائم کی سزاؤں کے طور پر ایسے کام کروائے جاتے ہیں کہ جن سے معاشرے کا بھلا ہوجائے مثلاً کسی مجرم کو یتیم خانے میں خدمت پر لگا دیا جاتا ہے یا پھر کسی کو ٹریفک حادثہ کرنے کی صورت میں زخمیوں کی تیمارداری کیلئے ہسپتال میں متعین کردیا جاتا ہے۔اسلام کی تجویز کردہ تمام تر سزائیں بھی معاشرے کا تزکیہ کرنے میں مدد دیتی ہیں۔یعنی اسلام میں پرتشدد جرائم کی سزائیں تو سخت رکھی گئیں ہیں مثلاً سولی چڑھانا،کوڑے لگانا، ہاتھ کاٹنا وغیرہ جبکہ بہت سی سزائیں ایسی ہیں کہ اس سے معاشرے کے مساکین کا بھلا ہوجاتا ہے۔مثلاً روزہ توڑنے کی سزا یہ ہے کہ ساٹھ روزے رکھواور اگر یہ نہ کرسکو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔اسلام میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ گناہ کرنے کی صورت میں فوراً ہی صدقہ خیرات کرکے اس کا کفارہ ادا کردیا جائے۔یعنی انسانوں کے گناہ کی سزا بھی معاشرے کے مساکین کی فلاح کا باعث بن جاتی ہے۔اسی طرح قتل کی سزا میں بھی خون بہا لینے کی اجازت موجود ہے کہ جس سے مقتول کے ورثاء کا بھلا ہوجاتا ہے۔قاتل کو صرف قتل کردینا مقصود نہیں ہے۔اگر بہتری اس میں ہے کہ اس جان بخش دی جائے اور مقتول کے خاندان کی کفالت کا بندوبست ہوجائے تو دین پھر اسکی اجازت بھی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ شریعت میں انسانوں کو جیلوں میں بند کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔آجکل مغرب میں قتل کرنے پر بھی لمبے عرصے کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ قیدی جیلوں

میں بند ہیں۔ ان پر اربوں ڈالر سالانہ خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن مجرموں نے درجنوں انسانوں کو قتل کیا ہوتا ہے ان کو بھی سوسو، دودو سو سال کی قید سنا کر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ شریعت کہتی ہے کہ مجرموں کو قتل کر دو یا ان سے خون بہا لو تا کہ مقتولین کے ورثاء کا کچھ بھلا ہو سکے۔ اسکے علاوہ تیسرا حل معاف کرنا ہے جو کہ مقتولین کے ورثاء ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ انسانیت پر مبنی نظام اور کیا ہو سکتا ہے کہ جہاں معاف کر دینے، خون بہا لینے یا پھر جان کے بدلے جان، تینوں اختیارات موجود ہیں؟

جہاں تک ریاست کا تعلق ہے تو اس کا کام صرف اللہ کے حکم کا نفاذ ہے۔ یہ بڑا فرق ہے خلافت راشدہ اور موجودہ نظام عدل میں۔ ریاست کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اسکے برعکس ہمارے ہاں ایک قاتل جس کی تمام اپیلیں رد ہو چکی ہوتی ہیں، اسے بھی صدر مملکت معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ عدالتی مرحلے سے گزرنے کے بعد مجرم کو معافی دینے کا اختیار صدر مملکت کو دے دیا گیا ہے حالانکہ شریعت کی رو سے اس کے پاس یہ اختیار نہیں ہے۔ یہ قطعاً حرام ہے۔ شریعت میں صدر کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

صدر مملکت اللہ کے دین کو نافذ کرنے والا ہونا چاہیے، اس کی دھجیاں اڑانے والا نہیں۔ ایک بھارتی دہشت گرد، سربجیت سنگھ، جو کہ پاکستان میں کئی بم دھماکوں میں ملوث رہا ہے، اسکی فائل کئی برس سے صدر مملکت کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ بھارتی حکومت اسے معاف کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے اور صدر مملکت کے پاس چونکہ اسے معاف کرنے کا اختیار ہے لہذا وہ کسی بھی وقت اسے معاف کر سکتا ہے۔ حالانکہ شریعت کے تحت اسے پھانسی پر ٹانگ

دینا چاہیے یا دیت ادا ہو، مقتولین کے ورثاء کو۔

اسلام اگرچہ جیل خانوں کے نظام سے اجتناب برتتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ جرائم کے نتیجے میں حضرت عمرؓ کے دور میں کچھ چھوٹے جیل خانے بھی بنائے گئے مگر ساتھ ہی ساتھ ضمانت دینے کے سلسلے کو بھی فروغ دیا گیا۔ یہ نظام آج تک دنیا میں رائج ہے۔ ضمانت کا تصور ہی حضرت عمرؓ نے شروع کروایا۔ پاکستان میں ۸۰ فیصد لوگ صرف اس لیے جیلوں میں بند ہیں کیونکہ ان کے مقدمات کے فیصلے کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے تو نہ صرف ریاست پر بوجھ کم پڑے گا بلکہ ان ملزموں کے خاندان بھی تباہی سے بچ جائیں گے۔ پاکستان کے نظام میں ایک بے گناہ شخص کیلئے بھی اپنی ضمانت کروانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہزاروں بے گناہ لوگ صرف اس لیے جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ ضمانت کی رقم یا جائیداد نہیں رکھتے۔ جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ صرف شک وشبہ کی بناء پر کسی کو قید نہیں کیا جانا چاہیے۔ خلافت راشدہ میں صرف سزا یافتہ مجرم ہی جیل جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے خلافت کی مسند سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ انتظامیہ اور عدلیہ کو الگ کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں یہ دونوں ادارے اکٹھے تھے۔ لہذا دونوں نظام جائز ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق دونوں کام کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں نئے قاضی تعینات کیے اور عدلیہ کو آزاد کر دیا۔ خلافت راشدہ کے دور سے پہلے کہیں آزاد عدلیہ کا نظریہ نہیں پایا جاتا تھا۔ آزاد عدلیہ کا نظام بھی سب سے پہلے خلافت راشدہ میں ہی شروع ہوا اور آج ہمیں مغرب یہ سکھاتا ہے کہ آزاد عدلیہ کیا ہوتی ہے؟ حالانکہ اسلام کی برکت سے یہ خیر دنیا کو ملی۔ تبھی تو حضرت علیؓ بھی اپنا مقدمہ لے کر قاضی کے پاس گئے اور مقدمہ ہار گئے۔ موجودہ عدلیہ اتنی آزادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی کہ جو خلافت راشدہ میں عدلیہ کو حاصل تھی۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (گورنر) کو قاضی کی تعیناتی کے حوالے سے نصیحت کرتے ہوئے لکھا کہ ایسے شخص کو قاضی مقرر کرو کہ جو صاحب اثر اور صاحب عظمت ہو۔ کسی گھٹیا آدمی کو جج نہ بنانا۔ یہ بہت کمال کی نصیحت تھی۔ صاحب اثر اور صاحب عظمت قاضی کی تعیناتی کا یہ فائدہ تھا کہ وہ کسی گورنر یا

جنرل کے رعب میں نہیں آتا تھا۔ اگر ایک غریب کسان کو قاضی مقرر کردیا جائے اور اس کے سامنے کسی جاگیردار یا سپہ سالار کا مقدمہ پیش ہوتو وہ ان شخصیات کے رعب میں آجائیگا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے پہلا اصول یہ بتایا کہ ایسے شخص کو قاضی مقرر کیا جائے جو کہ معاشرے میں طاقتورترین ہو اور جو کسی کے رعب میں نہ آئے۔ ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہو کہ جس کی معاشرے میں عزت ہو۔ یعنی پورا معاشرہ اس قاضی کی عزت کرتا ہو۔

ہمارے اپنے معاشرے کی حالت دیکھیں تو امریکی سفیر کے سامنے ہمارے حکمرانوں کی بولتی بند ہوجاتی ہے۔ انگریزی تک بھول جاتے ہیں۔ کچھ سال پہلے برطانیہ کی ملکہ پاکستان کے دورے پر آئیں تو پاکستان کی پارلیمنٹ کے سپیکر نے ان کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ ہم ابھی تک آپ کے وفادار غلام ہیں۔ یہ انتہائی بے شرم اور بے حیاء لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر منصف بنادیا جائے تو وہ کیا انصاف فراہم کریں گے؟ اسی لیے کہا گیا ہے کہ باکردار اور بااثر شخص کو منصف بنانا چاہیے، کسی گھٹیا شخص کو نہیں۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی نصیحت کی کہ جب تم عدالت میں طلب کیے جاؤ تو فوراً فریق مقدمہ کے ساتھ حاضر ہوجاؤ۔ یعنی مقدمے کو التواء میں نہیں ڈالنا۔ آجکل لوگ اس کے برعکس کام کرتے ہیں۔ عدالت نوٹس پہ نوٹس بھجواتی رہتی ہے، مگر فریقین حاضر نہیں ہوتے۔ یوں مقدمہ کئی سالوں پر محیط ہوجاتا ہے۔ چاہے وہ مکان کے کرائے کے جھگڑے کا چھوٹا سا مقدمہ ہی کیوں نہ ہو۔ انصاف کی خوبصورتی یہی ہے کہ وہ نہ صرف مفت ملے بلکہ فوری اور گھر کی دہلیز پر ملے۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ نے مزید فرمایا کہ اگر مدعاعلیہ (جس کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ہو) انکار کرے تو گواہ پیش کروتا کہ وہ جبراً حاضر کیا جاسکے۔ قاضی کو اختیار ہے کہ وہ پولیس بھیج کر مدعاعلیہ کو طلب کرسکے۔ یہ اصول بھی دیا گیا ہے کہ اگر مدعاعلیہ بھاگنا چاہے تو اسے پولیس کے ذریعے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ مفرور مجرم کو پکڑ کر جیل میں بند کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ شرافت سے مقدمے کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی نصیحت کی کہ اگر مدعاعلیہ بیمار یا بوڑھا ہوتو اسے سواری دو، ورنہ اس پر حاضری کیلئے جبر نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر اس کیلئے عدالت آنا ہی ممکن نہ ہوتو پھر عدالت اس کی دہلیز پر جائے گی۔ آج پوری

دنیا کی عدالتوں میں بھی ہمیں ایسے سنہرے اصول وقواعد نہیں ملیں گے کہ جیسے حضرت عمرؓ نے بنائے تھے۔ یہ بات انسانی حقوق کے زمرے میں آتی ہے۔اب تو یہ ہوتا ہے کہ جس کے خلاف مقدمہ کیا گیا ہو، اسکا پورا خاندان تھانے کچہری کے چکر میں رسوا ہو جاتا ہے۔آج دنیا کی عظیم ترین جمہوری قوتیں بھی خلافت راشدہ کی طرح کے نظام عدل کی مثال پیش نہیں کرسکتیں۔

حضرت عمرؓ کی اگلی نصیحت یہ تھی کہ اگر مدعا علیہ ضامن پیش کرے تو اسے چھوڑ دو۔یعنی اگر کوئی اس کی ضمانت دے تو اسے جیل میں قید مت رکھو۔ ہمارے ملک میں بھی ضمانت کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا جائے تو ۸۰ فیصد لوگ جیلوں سے باہر آجائیں گے اور جیلوں پر پڑنے والا دباؤ بھی کم ہو جائیگا۔ حضرت عمرؓ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ دولتمند کا ضامن دولتمند شخص ہی ہونا چاہیے۔یعنی یہ نہ ہو کہ ایک ارب پتی شخص کسی غریب شخص کو پیسے کے زور پر اپنا ضامن بنالے۔ ضامن ہم پلہ ہونا چاہیے تاکہ اگر مدعا علیہ بھاگے تو ضامن کو پکڑا جاسکے۔اس نصیحت میں معاشرتی مساوات کا پہلو نظر آتا ہے۔ یہ تمام باتیں انصاف کے تقاضے پورے کرتی ہیں۔فی الحال پاکستان سمیت دنیا بھر میں یہ اصول کہیں بھی نافذ نہیں ہیں۔

اسکے بعد نصیحت کی گئی کہ قاضی کو دونوں فریقین کو سننے کے بعد ہی فیصلہ سنانا چاہیے۔یکطرفہ فیصلہ نہیں سنایا جاسکتا۔اسکے علاوہ جج صبح سے دوپہر تک مقدمہ سنے گا اور دوپہر کے بعد فیصلہ فریقین کی حاضری میں کیا جائیگا۔حضرت عمرؓ پندرہ منٹ میں قتل کے مقدمات کا فیصلہ سنا دیا کرتے تھے۔قتل ثابت ہو جاتا تو سزا کے نفاذ میں دیر نہیں کی جاتی تھی۔ ہمارے ہاں قتل کے مقدمات بیس سال سے پہلے نہیں نمٹتے۔

مغرب کے بعد عدالت بند رکھنے کی بھی نصیحت بھی کی گئی۔اسکے علاوہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر فریقین ثالث پیش کرنا چاہیں تو وہ کرسکتے ہیں یعنی اگر فریقین ثالث کے ذریعے صلح کرنا چاہیں تو وہ بھی کی جاسکتی ہے۔آج پاکستان کے عوام یہی نظام چاہتے ہیں۔وہ صلح کرنا چاہتے ہیں مگر عدالتیں صلح نہیں کرنے دیتیں اور وکیل اپنا پیسہ کمائے جاتے ہیں۔اسلامی نظام میں وکیل کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص گواہ نہ پیش کرسکے، وہ مدعا علیہ کے دروازے پر اپنا دعویٰ پکار کر کہے۔

یعنی اگر آپ کے پاس واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے تو آپ مدعا علیہ کے دروازے پر اونچی آواز میں ایک نوٹس دے دیں کہ میں تمہارے خلاف مقدمہ کررہا ہوں، تاکہ سب کو پتہ چل جائے۔

حضرت عمرؓ نے یہ نصیحت بھی کی کہ قاضی کو قانونی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سب کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ عدالت میں تشریف لے گئے۔ قاضی نے کھڑے ہوکر آپؓ کا استقبال کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ تم نے ناانصافی کی، کیونکہ تم نے مجھے خلیفہ ہونے کے ناطے عزت دی۔ تم میرے رعب میں آگئے۔ خلافت راشدہ کے نظام میں یہ بات طے کردی گئی تھی کہ عدالت میں بادشاہ وقت اور چرواہا دونوں برابر کھڑے ہونگے۔

حضرت عمرؓ نے بارثبوت مدعی پر ڈالا۔ یعنی جو مقدمہ قائم کرے، وہی ثبوت بھی مہیا کرے۔ اگر ثبوت نہ ہوتو الزام بیکار تصور کیا جائیگا۔ لیکن اگر مدعا علیہ کے پاس بھی ثبوت نہ ہوتو اس سے قسم لی جائے گی۔ جھوٹا الزام لگانے پر تہمت اور بہتان کی سخت سزا دی جاتی تھی۔ اگر یہ نظام آج پاکستان میں نافذ کردیا جائے تو ۹۰ فیصد مقدمات ختم ہوجائیں گے جہاں صرف جھوٹ اور انتقام کی وجہ سے مقدمات درج کیے جاتے ہیں۔

فریقین ہر حالت میں صلح کرسکتے ہیں مگر سوائے اس کے کہ جو امر خلاف قانون ہے، اس میں صلح نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اگر کسی نے ریاست کے راز افشا کردیئے ہوں تو اس کو لازمی سزا ملے گی۔ وہاں صلح نہیں ہوسکتی۔ ذاتی معاملات میں صلح ہوسکتی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ ملک کا اربوں روپیہ خرد برد کرنے کے بعد آپ عدالت سے کہیں کہ تھوڑے سے پیسے لے کر مجھے چھوڑ دو۔ آجکل ہمارے ملک میں یہی کچھ ہورہا ہے۔ وہ تمام لوگ کہ جنہوں نے اربوں روپے کی خیانت کی ہے وہ عدالت سے معاہدے کرکے تھوڑی سی رقم ادا کرنے کے بعد باعزت بری ہوجاتے ہیں۔ این آر او اسی طرح کا گھناؤنا قانون ہے۔ این آر او جیسا قانون تو بنایا ہی نہیں جاسکتا، یہ شرعاً حرام ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی نصیحت کی کہ مقدمے کی پیشی کی تاریخ بھی مقرر ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہوکہ بیس بیس سال مقدمے کو لٹکایا جارہا ہے۔ اگر مقررہ تاریخ پر مدعا علیہ حاضر نہ ہوتو مقدمے کا یکطرفہ فیصلہ سنادیا جائے۔

ہر مسلمان قابل ادائے شہادت ہے یعنی ہر مسلمان گواہی دے سکتا ہے، سوائے اس شخص کے کہ جو مجرم اور سزا یافتہ ہو اور جس کی گواہی جھوٹی ثابت ہو چکی ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کسی مقدمے میں جھوٹے اور مجرم شخص کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی تو انتخابات میں اسکی رائے کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے؟ ہمارا پورا عدالتی نظام جھوٹی گواہیوں پر چل رہا ہے۔ ایف آئی آر سے لیکر مقدمے کے فیصلے تک جھوٹی گواہی ہی چلتی ہے۔ جج جھوٹ سنتے ہیں اور وکیل جھوٹ بولتے ہیں۔ چھوٹی عدالتوں کے باہر لوگ جعلی کاغذات کی تھیلیاں لیے کھڑے ہوتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ "گواہ چاہیے؟ ہم گواہ بننے کے لیے تیار ہیں"۔ ہمارے آئین میں بھی "تزکیۃ الشہود" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی معیار شہادت۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جتنے بھی گواہ پیش کیے جاتے ہیں وہ جھوٹے ہوتے ہیں یا مجرمانہ پس منظر کے مالک ہوتے ہیں۔

اسلامی عدالتی نظام کا کمال یہ ہے کہ اس میں وکیل نہیں ہے۔ ہمارے ہاں سیشن کورٹ میں کسی گھٹیا سے شخص کو جج مقرر کر دیا جاتا ہے۔ ہائی کورٹ میں کچھ پڑھا لکھا شخص تعینات کرتے ہیں اور پھر سپریم کورٹ میں کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص آ جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سیشن کورٹ (جو معاشرے کی سب سے نچلی سطح کی عدالت ہوتی ہے) میں معاشرے کا اعلیٰ ترین شخص قاضی کی حیثیت سے تعینات کیا۔ اسکا فائدہ یہ ہوتا کہ ۹۹ فیصد مقدمات کا فیصلہ وہیں ہو جاتا۔ ہم اس کے بالکل برعکس کام کرتے ہیں اور جب تک مقدمہ سپریم کورٹ تک پہنچتا ہے، انصاف لیتے لیتے مدعی اپنی تمام جائیداد بیچ چکا ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں عدل و انصاف مفت فراہم کیا جاتا تھا۔ ریاست کی ذمہ داریوں میں یہ شامل ہوتا تھا کہ عوام کو مفت عدل فراہم کرے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ اس سے زیادہ حیرت انگیز اور مستقبل سے ہم آہنگ نظام عدل اور کیا ہو سکتا ہے؟

جب ہم اپنے موجودہ عدالتی نظام کو کرپٹ کہتے ہیں تو اسکا مطلب یہی ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرنے کے باوجود یہ نظام عدل و انصاف فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر آپ حق پر بھی ہیں اور کوئی مقدمہ دائر کرتے ہیں تو بھی آپ کے نہ صرف کروڑوں روپے خرچ ہونگے بلکہ کئی سال مقدمے کی پیشیاں بھگتانے میں لگ جائیں گے۔ ایسے نظام کو اسلامی نظام نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حرام نظام ہے۔

خلافت راشدہ کے عدالتی نظام کے تحت ہر شہر میں ایک قاضی تعینات کیا جاتا تھا اور اس کا فیصلہ حتمی تصور ہوتا تھا۔ اپیل ہونے پر قاضی اپنا فیصلہ بدل سکتا تھا یا پھر مدعی اپنی شکایت خلیفہ تک لے جا سکتا تھا۔ مگر خلیفہ تک معاملہ لے جانے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی کیونکہ قاضی اتنی ایمانداری سے فیصلہ کرتا تھا کہ تمام فریقین اس سے مطمئن ہوتے تھے۔

فرض کیجیے کہ اس نظام کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اپنے مکان کے کرائے کا مقدمہ لے کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو قاضی اس کرائے دار کو طلب کریگا جو مکان خالی نہیں کر رہا۔ مدعی اور مدعا علیہ کی موجودگی میں قاضی مقدمے کی سماعت کریگا اور ظہر کی نماز کے بعد فیصلہ بھی سنا دیگا۔ شام تک مدعی کو اپنا گھر مل جائیگا اور وہ بھی کوئی پیسہ خرچ کیے بغیر۔ تھانہ کچہری اور وکیلوں کے معاوضے کے بغیر معاملہ طے ہو جائے گا۔ جبکہ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ اگر کسی کو پھنسانا ہو یا انتقام لینا ہو تو اس کے خلاف کوئی جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ مسکین ساری زندگی عدالتوں اور جیلوں کے چکر ہی لگاتا رہتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا مستشرق برنارڈ لوئیس کہتا ہے کہ مغربی نظام کی بنیاد دو پیشوں پر ہے، ایک وکالت اور دوسرا صحافت۔ اسلامی نظام میں بھاری فیسیں لیکر مقدمات کو طوالت دینے اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والے وکیلوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں یہ تصور ہی نہیں ہے کہ بڑے بڑے وکلاء قاتلوں، چوروں، ڈاکوؤں اور این آر او زدہ سیاستدانوں کو بھاری فیسوں کے عوض باعزت بری کروا دیں اور پھر کہہ دیں کہ ہم نے تو اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری پوری کی ہے۔ خلافت راشدہ میں ایک گڈریا بھی خلیفہ پر مقدمہ کر سکتا تھا۔ مگر آج ایک چھوٹے سے مقدمے کے لیے بھی وکیل کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب آپ بتائیں کہ موجودہ نظام بہتر ہے یا خلافت راشدہ کا نظام؟ یقیناً خلافت راشدہ کا نظام۔ اگر ہم اسے پاکستان میں نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس میں سب کا بھلا ہے۔ اسکے نفاذ سے تکلیف صرف اسی کو ہوگی کہ جس کے ذاتی مفادات کو اس نظام سے زک پہنچتی ہے اور جو تکمیل پاکستان نہیں چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عدالتی نظام کو قائم کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ صرف سیاستدان ہی

نہیں بلکہ آج کے دور کے وکیل اور جج بھی شامل ہیں کہ جن کی بقاء کفر کے اسی نظام سے وابستہ رہنے میں ہے۔مگر ہم،ان شاء اللہ،اذان دیتے رہیں گے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

۱۷

خلافت راشدہ کا معاشی نظام

پچھلے ابواب میں ہم خلافت راشدہ کے سیاسی اور عدالتی نظام پر تفصیلاً بحث کر چکے ہیں۔اس باب میں ہم خلافت راشدہ کے معاشی نظام کو موضوعِ بحث بنائیں گے۔معاشی نظام پر بات کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جس طرح پورے جسم میں خون دوڑتا ہے،اسی طرح معاشرے میں دولت گردش کرتی ہے۔اگر آپ خون کی گردش روک دیں تو پورا جسم گل سڑ جائیگا۔کچھ ایسا ہی معاملہ اسلامی معاشی نظام میں بھی ہے، جو کہ قرآن وسنت کی بنیاد پر بنایا گیا ہے،اور جس میں دولت کی گردش کو یقینی بنایا جاتا ہے۔اگر دولت کی گردش روک دی جائے یا چند ہاتھوں میں محدود کردی جائے تو معاشرہ ترقی نہیں کر پاتا اور امیر،امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور غریب،غریب تر۔اسلامی معاشی نظام کی بنیادی حکمت بھی یہی ہے کہ قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق معاشرے میں دولت کی گردش کو یقینی بنایا جائے اور دولت صرف امراء کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے۔ایسا معاشی نظام جو کہ معاشرے سے متوسط طبقے کو ختم کردے، بہت تباہ کن معاشی نظام ہوتا ہے، جو کہ صرف آقا اور غلام کے رشتے پر قائم ہوتا ہے۔ایسے معاشرے کے لوگوں میں بھائی چارہ نہیں ہوتا۔سود اور رباء پر مبنی موجودہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام بھی یہی ہے۔

اس کے برعکس ایسا معاشی نظام کہ جس کی بنیاد کاغذ کے جعلی نوٹوں کے بجائے سونے اور چاندی کے درہم و دینار پر ہو، سود اور رباء پر مبنی بینک کے بجائے بیت المال کا ادارہ ہو، معاشرے میں دولت کی مساویانہ تقسیم ہو کہ جس کی بنیاد اس بات پر ہو کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرے، کوئی بھی سرمایہ دار اپنی اجارہ داری قائم نہ کر سکے، کسی طبقے کا استحصال نہ ہو اور معاشرے کے وہ وسائل کہ جن کا تعلق مفاد عامہ سے ہے، انہیں ریاست خود کنٹرول کرے اور ان کی نجکاری نہ کی جائے، خلافت راشدہ کا معاشی نظام ہے۔ یہ اتنا حیرت انگیز اور مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظام ہے کہ اگر ہم دیگر نظاموں سے اس کا موازنہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ آج پوری دنیا معاشی پالیسیوں کے حوالے سے ایک ایسے تاریک گڑھے میں گری ہوئی ہے کہ جہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ہم نے اشتراکیت کے معاشی نظام کو دیکھا کہ وہ انسانیت کو تباہ و برباد کر کے خود بھی فنا ہو چکا ہے۔ ستر، اسی سال کے اندر ہی اسکی معاشی پالیسیاں تباہ ہو گئیں۔ سرمایہ دارانہ نظام، کہ جس کا پچھلے ڈیڑھ سو سال میں عروج ہوا، وہ بھی اب تباہ ہو رہا ہے۔ امریکہ میں بھی بے پناہ غربت ہے۔ ان کی معاشی پالیسیاں زوال پذیر ہیں۔ پورا امریکی معاشرہ (حکومت بھی) کھربوں ڈالرز کے قرض میں جکڑا جا چکا ہے۔ ان پر قرض کی زندگی گزارنے کی لعنت ڈال دی گئی ہے۔ انکی جعلی کاغذی کرنسی بھی ختم ہو رہی ہے۔ وہ کریڈٹ کارڈ اور برقی معیشت پر آ گئے ہیں اور اس چکر میں ان کیلئے سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

صیہونی سرمایہ داروں نے سود اور رباء کی بنیاد پر بینک کا نظام بنایا ہے۔ بینکوں کا مطلب ہے کہ چند مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں دولت کا جمع ہونا۔ ایک بینک کی دنیا میں مختلف جگہوں پر بے شک سینکڑوں شاخیں ہوں مگر اس بینک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں دس پندرہ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ آپ جہاں مرضی پیسے جمع کروائیں، کنٹرول تو چند افراد پر مشتمل ایک گروپ ہی کرتا ہے۔ اس طرح تمام معاشرے کی دولت چند افراد کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔

ان کا ایک خاص نظام انکم ٹیکس کا نظام بھی ہے۔ یہ ایک ناپاک تصور ہے کہ ہر شخص کی آمدنی پر ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس صرف انسان کی بچت پر زکوٰۃ رکھی ہے۔ ہم خلافت راشدہ کی قرآن و سنت پر مبنی معاشی پالیسیوں پر بات کریں گے کیونکہ، الحمد وللہ، آج ہمارے نوجوان ایک مرتبہ پھر خلافت راشدہ کے سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام کے نفاذ کی بات کر رہے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت یوسفؑ کا قصہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ بہت حیرت انگیز اور طویل قصہ ہے کہ کیسے آپؑ کے بھائیوں نے آپؑ کو کنویں میں ڈالا اور کس طرح آپؑ وہاں سے نکل کر عزیز مصر کے دربار میں پہنچے اور بعد میں وہاں کے وزیر خزانہ بنے۔ اگر آج کی اصطلاح میں بات کی جائے تو حضرت یوسفؑ اس وقت خزانہ، زراعت، پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے وزیر تھے۔ قرآن میں آپؑ کی ذمہ داریوں کیلئے ''خزائن الارض''، یعنی زمین کے خزانوں کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ زمین کے خزانوں میں ہر وہ چیز شامل ہے کہ جو زمین سے پیدا ہو۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے دور میں مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا، اسی طرح حضرت یوسفؑ کے دور میں مصر کے بادشاہ کو عزیز مصر کہا جاتا تھا۔ مصر کے عزیز کا نظام کفر پر مبنی تھا۔ مصر کے بادشاہ کا خطاب تو فرعون ہی تھا مگر قرآن پاک میں حضرت یوسفؑ کے قصے میں فرعون کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اصل طاقت تو عزیز مصر کے پاس تھی مگر اس نے وزارت خزانہ حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دی تھی۔ آپؑ نے معیشت، زراعت اور قدرتی وسائل کے حوالے سے اتنی خوبصورت حکمت عملی ترتیب دی کہ چند ہی سالوں میں مصر خوراک اور غلے کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا اور اس قدر خود کفیل کہ اس زمانے میں سات سال تک قحط پڑا رہا تو اس وقت بھی مصر نے پوری دنیا کو غلہ فراہم کیا۔ یعنی مضبوط معاشی اور زرعی پالیسی کی وجہ سے ہی کوئی قوم اتنی خود کفیل ہو سکتی ہے۔ یہ خود کفالت حضرت یوسفؑ کے بہترین اقدامات کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشی پالیسیوں کا استحکام اور وزیر خزانہ کی فراست اور ایمانداری کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔

اب ہم بات کرتے ہیں آج کے دور کے صیہونی بینکاروں کی۔ لارڈ روتھس چائلڈ، ان صیہونی بینکاروں کا باپ تصور کیا جاتا ہے کہ جو بینک آف انگلینڈ اور امریکہ کا فیڈرل ریزرو بینک کنٹرول کرتے ہیں اور جو

پوری دنیا کے معاشی نظام پر قابض ہیں۔ روتھس چائلڈ کا کہنا تھا کہ اگر تم مجھے اس بات کی اجازت دے دو کہ میں کسی قوم کی دولت کنٹرول کروں اور اسکی معاشی پالیسیاں بناؤں، تو پھر مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہاں حکومت کون کرتا ہے؟ خواہ جمہوریت ہو یا آمریت، اشتراکیت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام یا پھر بادشاہت ہو یا ملائیت۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

یہ عیش فرواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلی

اس بات سے اندازہ کیجیے کہ جس شخص کے ہاتھ میں دولت کی گردش اور قدرتی وسائل کا کنٹرول ہو، وہ کس قدر طاقتور ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کو تباہ بھی کرسکتا ہے اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن بھی کرسکتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں یہ اختیار آیا تو انہوں نے اپنی قوم کو خوشحال کر دیا۔ روتھس چائلڈ کے ہاتھ میں یہ اختیار آیا تو اس نے پوری دنیا کو قحط میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دیا۔

آج دنیا پر روتھس چائلڈ کا بنایا ہوا معاشی نظام ہی مسلط ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں، کہ جن میں سے اکثر

اقوام متحدہ کے ذریعے کام کررہے ہیں، مثلاً فیڈرل ریزرو بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور بینک آف انٹرنیشنل سیٹل منٹس وغیرہ، نے پاکستان سمیت دنیا بھر کی معیشت کا بیڑا غرق کرکے رکھ دیا ہے۔ ہماری حکومت آئی ایم ایف کی پالیسیوں کے تحت ہر مہینے بجلی، گیس، پٹرولیم اور اشیائے خوردونوش وغیرہ کی قیمتیں بڑھا بڑھا کر عوام کی مشکلات میں اضافہ کررہی ہے۔ عالمی معاشی پالیسیوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ پہلے غلط معاشی پالیسیاں بنا کر ملک کی معیشت کو تباہ کیا جاتا ہے، پھر خائن حکمران مسلط کر کے ملکی خزانے کو خالی کیا جاتا ہے، پھر امداد کے بہانے بھاری سود پر ملکوں کو قرض دیا جاتا ہے اور پھر سود کی ادائیگی کیلئے پوری قوم پر کمر توڑ ٹیکس لگایا جاتا ہے تاکہ عالمی صیہونی بینکاروں کو قرضے کی ادائیگی کی جاسکے۔ اور اس طرح پوری قوم دائمی طور پر سود خوروں کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ یہ ہے آج کے دور کا عالمی مالیاتی نظام۔

مکے کے قریش اور آس پاس کے دیگر قبائل تجارت پیشہ تھے۔ مکہ میں تو زیادہ چیزیں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔ وہ لوگ یورپ سے سامان خریدتے اور چین تک لے جاکر بیچتے۔ پھر چین کے تاجروں سے سامان خرید کر یورپ لے جاکر بیچتے تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارت نہیں ہوتی تھی، بالکل غلط ہے۔ شاہراہ ریشم ہزاروں سال سے چین اور یورپ کے درمیان تجارت کا ذریعہ ہے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ مسلمانوں نے سپین بھی فتح کرلیا۔ اس زمانے میں مسلمان تاجر ایک طرف دمشق سے چلتا اور اندلس تک جاتا۔ دوسری طرف دمشق سے نکل کر عراق، ایران، افغانستان، خراسان، چین، ثمرقند، بخارا اور روس تک مسلمان تاجر جاتے تھے اور تجارت کرتے۔ اُس وقت جو اِس قدر وسیع اور پھیلا ہوا معاشی نظام تھا تو اس کی بنیاد کس چیز پر تھی؟ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مسلمانوں نے اس زمانے میں ''چیک'' بھی ایجاد کرلیے تھے مگر وہ کاغذی رسیدیں اصل اور حقیقی دولت پر مبنی ہوتی تھیں۔ وہ آج کی طرح نقلی کاغذی کرنسی نہیں ہوتی تھی۔ ایک تاجر کہ جس کا بہت بڑا کاروبار ہوتا تھا، اس کا ایک گودام دمشق یا بغداد میں ہوتا تھا، دوسرا گودام

قرطبہ میں ہوتا اور تیسرا چین میں۔ وہ کسی دوسرے تاجر کو دمشق میں بیٹھ کر رسید دیتا تو وہ رسید اندلس سے لیکر چین تک کسی بھی جگہ کیش کرائی جا سکتی تھی۔ چونکہ اس چیک یا رسید کے پیچھے اصل دولت ہوتی تھی لہذا انسان جب چاہتا اس کو کیش کراتا اور اس کے بدلے درہم اور دینار لے لیتا۔

شروع میں جب مسلمانوں نے اپنے سونے اور چاندی کے سکے شروع نہیں کیے تھے تو خلافت راشدہ کے دور میں بھی بازنطینی، ایرانی اور چینی سکے بھی استعمال کر لیے جاتے تھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سکے کس ملک کے ہیں یا ان پر مہر کس کی لگی ہوئی ہے، کیونکہ وزن تو سونے اور چاندی کا تھا۔ کوئی بھی پگھلا کر دوسرا سکہ بنا سکتا تھا اور اس پر اپنی مہر لگا سکتا تھا۔ یہی کمال ہے اصل دولت میں تجارت کرنے کا کہ آپ کسی بھی صورت میں نقصان نہیں اٹھاتے۔ آپ زمانے اور علاقے کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اُس زمانے کا دفن شدہ چین کا سونے کا سکہ آج بھی نکالیں تو وہ آپ کو فائدہ ہی دے گا کیونکہ وہ سونا ہے۔

کرنسی کے حوالے سے یہ انسانیت کے تمام معاشی نظاموں کا بنیادی پہلو ہے۔ آپ قرآن اٹھا کر دیکھ لیں۔ قرآن پاک میں سونے، چاندی اور درہم و دینار کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی معاشی نظام انتہائی مستحکم تھا۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد تھا۔ آپ کسی بھی ملک میں چلے جاتے، وہ کرنسی قابل قبول ہوتی۔ ایسا نظام انسانوں کو حقیقی معنوں میں آزاد کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس چین کے سکے ہیں اور کسی وجہ سے چین کی حکومت ختم ہو جاتی ہے یا وہاں بغاوت ہو جاتی ہے اور دوسری حکومت آ جاتی ہے تو اس شخص کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ اس کے پاس سکوں کی شکل میں سونا چاندی محفوظ ہے۔ جس کو وہ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ اور کسی بھی دور میں استعمال میں لا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کے پاس، اس حکومت کے جاری کردہ، کاغذ کے نوٹ ہیں اور وہ حکومت تبدیل ہو جاتی ہے اور نئی حکومت نئے نوٹ چھاپ دیتی ہے تو تمام پرانے نوٹ بیکار ہو جائیں گے۔ وہ شخص کہ جس نے اپنی ساری زندگی کی کمائی کاغذی نوٹوں کی شکل میں رکھی ہوگی، وہ تو تباہ و برباد ہو جائیگا۔ اس کی بہت سی مثالیں آج کے دور میں ہمارے سامنے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جب خلیجی جنگیں ہوئی تھیں تو کویتی دینار پاکستان میں ۷۵ روپے کا بکا کرتا تھا۔ یہ کویت پر

عراقی قبضے سے پہلے کی بات ہے۔ جب عراق نے کویت پر قبضہ کرلیا اور کویت بالکل ہی تباہ و برباد ہو گیا تو کویتی دینار ردی میں ایک ایک روپے کا بکتا تھا۔ وہ دوسری بات ہے کہ امریکہ نے زور لگا کر عراق کو نکال باہر کیا اور کویت کو دوبارہ اسی مقام پر لے گئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس زمانے میں اپنی جمع پونجی کویتی دینار میں رکھی ہوئی تھی، وہ تو تباہ ہو گئے تھے۔ اگر انہوں نے اس کویتی دینار کا سونا خرید کر رکھا ہوتا تو کویت میں کوئی بھی حکومت آتی یا جاتی، انہیں کیا فرق پڑنا تھا؟ سونا تو موجود ہوتا۔ اس حوالے سے ہم نے ''معاشی دہشت گردی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان معاملات پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔ وہ کتاب ضرور پڑھیئے گا۔

لہذا پہلی اہم بات کہ جو ہم خلافت راشدہ کے معاشی نظام میں دیکھتے ہیں، وہ کرنسی ہے۔ صرف خلافت راشدہ کے دور میں ہی نہیں بلکہ اس کے بعد آنے والے بنو امیہ، بنو عباس اور خلافت عثمانیہ میں بھی سونے اور چاندی کے سکوں کو ہی اہمیت دی گئی۔ اس کے علاوہ بازنطینی، یورپی، چنگیز خان کی منگول اور اس کے بعد ایرانی سلطنت سبھی نے اپنی کرنسی سونے اور چاندی کے سکوں میں ہی رکھی۔ یہ انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ صرف اسلام ہی سونے اور چاندی کی کرنسی نہیں لے کر آیا۔ اس کرنسی کو اللہ نے شرف قبولیت بخشا ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں ڈال دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کے کسی بھی دور میں پیدا ہوا ہو، اس نے کرنسی سونے اور چاندی کی ہی رکھی یا پھر مال تجارت میں، یعنی حقیقی دولت میں۔ کرنسی کبھی بھی جعلی رسید کی شکل میں نہیں ہو سکتی کہ جس طرح آج کی کاغذی کرنسی ہے۔ آپ اس کائنات میں ایسا کوئی بھی مستحکم معاشی نظام نہیں بنا سکتے کہ جس کی بنیاد جعلی کاغذی کرنسی پر ہو۔ سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہو یا اشتراکیت دونوں کی بنیاد جعلی کاغذی کرنسی ہے۔

آجکل انہوں نے اسلامی بینکاری کے نام پر جو خرافات شروع کی ہیں، اس میں وہ یہی ڈرامہ کرتے ہیں کہ

کرنسی تو کاغذی ہی رہے گی یعنی کرنسی تو جعلی ہی ہوگی، مگر ہم نے نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔ اس سے بڑا کوئی جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ نفع اور نقصان بانٹنے سے کاغذی کرنسی حلال نہیں ہو جائے گی۔ آج کی جعلی کاغذی کرنسی بذات خود حرام ہے۔ اسلامی معاشی نظام کی بنیادی شرط ہی حقیقی دولت پر مبنی کرنسی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے دور کے بعد مسلمانوں نے اپنے سکے جاری کرنا شروع کر دیئے تھے۔ بنو امیہ کے دور حکومت کے دوران انہوں نے بھی اپنے سکے جاری کیے۔ اس سے پہلے دوسری تہذیبوں کے سکے قبول اور استعمال کیے جاتے تھے۔ چونکہ وہ سونے اور چاندی کے ہوتے تھے لہذا اکثر جگہ پر درہم اور دینار تول کر دیئے جاتے تھے۔ چینی چاندی کا سکہ، بازنطینی چاندی کے سکے سے مختلف ہوتا تھا۔ لہذا ان چیزوں کا لین دین وزن کے حساب سے ہوتا تھا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ سونے اور چاندی کا وزن کتنا ہے، تولا اور ماشہ کے لحاظ سے اس کے کتنے سکے بنتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ایک چینی سکے کے بدلے ایک بازنطینی سکہ دے دیا جائے کیونکہ جو چیز معنی رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سکوں میں سونے اور چاندی کا وزن کتنا ہے۔ وہ خالص سونے یا چاندی کے سکے ہوتے تھے۔ یہ خلافت راشدہ کے معاشی نظام کا بنیادی پہلو تھا۔

دوسری بات آپ نوٹ کیجیئے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے یا تو مشرکوں سے جنگ کا ذکر کیا ہے یا سود اور رباء کے نظام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اتنے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ انسان خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سود اور رباء کے نظام میں کیسی ناپاکی چھپی ہوئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس نظام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ جبکہ آج دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہے، وہ تمام تر سود اور رباء پر مبنی ہے۔ قرآن پاک میں یہ درج ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور رباء کو حرام قرار دیا ہے۔ مشرکین اور سود اور رباء کا کام کرنے والے یہ بہانہ کرتے ہیں کہ رباء بھی تجارت کی ہی ایک شکل ہے۔''

جبکہ اللہ تعالیٰ واضح کرتا ہے کہ تجارت مختلف ہے اور رباء مختلف۔ آپ نوٹ کریں کہ عرب بنیادی طور پر تجارت پیشہ تھے۔ ایک جگہ سے چیز خریدتے تھے اور دوسری جگہ لے جا کر بیچ دیتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو

اپنے کام کے لیے سرمایہ بھی درکار ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے خیبر کے سود خور یہودی وہاں بیٹھے تھے۔ یہودی دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں، سودخور ہی رہتے ہیں۔آپ شیکسپیئر کا شائے لاک کا کردار دیکھ لیجیئے یا جیو آف مالٹا کے کردار کو دیکھ لیجیئے۔تمام عیسائی اور مغربی تہذیب میں یہودی کو سودخور کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔ یہی ذہنیت ہندو بنیئے کی بھی ہے۔ ہندو بنیئے اور یہودی کی فطرت ہی یہی ہے۔ اقبالؒ نے بھی یہودیوں کی اس ناپاک فطرت پر بھرپور طنز کیا تھا۔

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخوار

جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ

خودبخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح

دیکھیئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ!

یہ یہودی سود پر قرضے دیا کرتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حرام قرار دیا ہے۔اس دور میں یہ بہت عام تھا کہ تاجر سود پر قرض لیتے اور کاروبار کرتے۔ پھر کاروبار سے منافع کما کر سود کی ادائیگی کرتے تھے۔ خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر حضورﷺ نے دو چیزوں کو قطعاً حرام قرار دے دیا۔آپﷺ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ میں آج جاہلیت کے تمام خون معاف کرتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا خون معاف کرتا ہوں۔ پھر آپﷺ نے فرمایا کہ میں جاہلیت کے سارے سود معاف کرتا ہوں اور آپﷺ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے کچھ لوگوں کے سود معاف فرمائے۔ حالانکہ سود کے حرام ہونے کی آیات بہت پہلے نازل ہوچکی تھیں۔مگر اس حکم پر عملدرآمد آہستہ آہستہ کروایا گیا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے اگر جسم میں خون خراب ہوجائے تو آپ راتوں رات سارا خون نہیں نکال دیتے، بلکہ آہستہ آہستہ خراب خون نکالتے ہیں اور نیا خون ڈالتے ہیں۔اگر سارا خون ایک ساتھ نکال دیا جائے تو انسان مرجاتا ہے۔اسی طرح اگر معاشرے میں معاشی نظام کو بھی راتوں رات تبدیل کیا جائے اور اس کا نعم البدل نہ دیا جائے تو معاشرہ ختم ہوجائیگا۔

جب سونے پر مبنی معاشی نظام کو کاغذی کرنسی سے تبدیل کیا گیا تو اس عمل میں بھی ڈیڑھ سو سال لگے۔ یہ راتوں رات تبدیل نہیں ہوا۔ اگرچہ اس دور میں بھی یہ کام راتوں رات نہیں ہوسکتا مگر ہم بتدریج سود اور رباء کا نظام تبدیل کر کے اس کی جگہ حقیقی دولت پر مبنی اسلامی معاشی نظام لا سکتے ہیں۔اس سلسلے میں ہمیں حضرت یوسفؑ کی مثال ملتی ہے کہ کفر کے نظام میں رہ کر بھی وہ معاشی پالیسیاں بنائی جاسکتی ہیں کہ جو اسلامی ہوں اور جن کی بنیاد حقیقی دولت پر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کی فلاح ہوتی ہو۔ حضرت یوسفؑ نے معدنیات، قدرتی وسائل اور زراعت کے حوالے سے ایسی اسلامی پالیسیاں بنائیں کہ سارا خطہ خوشحال ہوگیا۔ معاشرے میں برکت آگئی۔ ایسے نتائج حاصل کرنے کے لیے صادق اور امین ہونا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ یوسفؑ نے فرمایا تھا کہ میں امانت دار بھی ہوں اور اپنے کام کو بھی جانتا ہوں۔

خلافت راشدہ کے دور میں لاکھوں کروڑوں درہم و دینار اور اشرفیوں کی تجارت ہو رہی تھی مگر اس میں آپ کو کہیں بھی سود اور رباء کا نظام نہیں ملے گا۔ سودخوری نہیں نظر آئے گی۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت آپ کو کہیں بھی نجی بینک نہیں ملتے۔ نجی بینکوں کا تصور ہی یورپ سے شروع ہوا۔ پہلے یہ پیسے کے خرید و فروخت کنندہ کے طور پر سامنے آئے تھے کہ جو سکے تبدیل کرتے تھے یعنی آج کی اصطلاح میں (Money Changers)۔ پھر آہستہ آہستہ یہ قرض دینے اور سودخوری پر آگئے۔ اور پھر سودخوری کا وہ میز یا بینچ ہی بینک بن گیا۔ بنیادی طور پر بینک کا
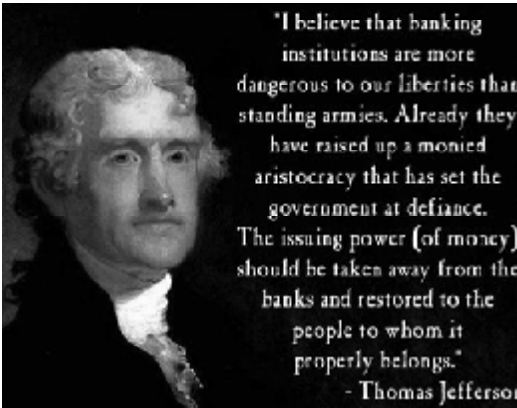
لفظ انگریزی لفظ (Bench) بینچ سے ہی نکلا ہے۔شروع میں ایک بینچ ہوتا تھا کہ جہاں بیٹھ کر یہ لوگ سکے تبدیل کرتے تھے۔وہ بینک میں تبدیل ہوگیا۔آج بھی بینک میں میزیں اور کاؤنٹر ہی لگے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہر چیز ذرا ترقی یافتہ ہوگئی ہے۔برقی روشنیاں زیادہ لگ گئی ہیں، ٹیلی ویژن پر اشتہارات دیئے جاتے ہیں،لیکن نسل ان کی وہی ہے جو شروع میں میز لگا کر بیٹھے ہوتے تھے اور سود پر قرضے دیتے تھے۔

خلافت راشدہ کے نظام میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حقیقی دولت پرمبنی نظام ہے۔یہ نجی بینکوں کی طرح نہیں ہے کہ دولت ایک آدمی کے پاس جمع ہو۔اس میں ریاست کا ایک بیت المال ہوتا ہے۔یعنی آج کی اصطلاح میں سٹیٹ بینک کہہ لیں۔مگر بیت المال،سٹیٹ بینک سے مختلف اس طرح ہوتا ہے کہ بینک میں تو آپ صرف کرنسی یا کیش رکھتے ہیں مگر بیت المال میں آپ گندم، آٹا، اونٹ غرض کہ حقیقی دولت پرمبنی ہر چیز رکھ سکتے ہیں اور وہ ریاست کی ملکیت ہوتی ہے۔بیت المال براہ راست خلیفہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔جتنی بھی آمدنی ہوتی ہے وہ ریاست کے اکاؤنٹ یعنی بیت المال میں جمع ہوتی ہے۔یعنی نجی یا مرکزی بینک کے مقابلے میں ریاستی بیت المال ہوتا ہے۔

خلافت راشدہ میں کاغذی کرنسی کے مقابلے میں سونے، چاندی پرمبنی حقیقی دولت ہے۔سود اور رباء کے مقابلے میں تجارت ہے۔بینک کے مقابلے میں بیت المال ہے۔دولت پر شخصی کنٹرول کے بجائے ریاستی کنٹرول ہے۔آمدن پر ٹیکس کے بجائے بچت پر زکوۃ ہے۔یہ کیسا فرق ہے؟ ہر چیز ہی مکمل طور پر مختلف ہے۔

آج کے پورے کفر کے نظام میں انکم ٹیکس ہے۔ایک شخص جان مار کر ہزار روپیہ رزق حلال کما رہا ہے مگر اس کو وہ ہزار روپیہ اس وقت تک نہیں ملتا جب تک کہ اس میں سے سودوسو روپیہ کاٹ کر سرکاری خزانے میں نہ جمع کروا دیا جائے۔اسی طرح جب دو مسلمان آپس میں تجارت کرتے ہیں تو اس میں سے بھی سیلز ٹیکس کے نام پر حکومت ''غنڈہ ٹیکس'' وصول کرتی ہے۔حالانکہ انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس دونوں ہی دین میں حرام ہیں۔ دین نے ٹیکس کا جو تصور دیا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔اسلام میں آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں ہے، بچت پر ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ اگر ایک ملک میں انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس ہی نہ ہو تو لوگوں کی آمدنی کتنی بڑھ جائے گی اور

عام ضرورت کی اشیاء کتنی سستی ہو جائیں گی؟ یہ لوگ کہتے ہیں کہ نظام چلتا ہی سود، رباء، انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس سے ہے۔ اگر حکومت کیلئے آمدنی ہی لانی ہے تو اس کیلئے اسلامی معاشی نظام میں اور بھی بہت سے حلال طریقے موجود ہیں۔ مسلمانوں کی جیبوں اور تجارت پر ڈاکے ڈال کر ہی حکومتی آمدنی لانا ضروری نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی ظلم کے نظام محصولات پر یہ طنز کیا تھا:

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار

عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار

حکم حق ہے لیس للانسان الا ماسعی

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

خلافت راشدہ کے دور میں آمدنی کیسے آتی تھی؟ خلافت راشدہ کے دور کو دیکھیں تو اس میں زکوٰۃ کا نظام تھا۔ یعنی آپ نے سارا سال جو بچت کی ہے، سال کے آخر میں اس کا اڑھائی فیصد نکالنا پڑے گا۔ یہ زکوٰۃ حقیقی دولت میں ادا کی جاتی تھی۔ نقلی تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر چیز اصلی تھی۔ انسان، نظریات، معیشت سب کچھ اصلی تھا۔ جبکہ آجکل ہر چیز نقلی ہے۔ وہ مضبوط اور مستحکم لوگ تھے۔ کرنسی بھی حقیقی دولت پر مبنی تھی۔ سارا سال جمع کیے گئے پیسے پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ہوتی تھی۔ وہ اڑھائی فیصد نکال کر اپنا پیسہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ مگر معاشرہ اس قدر اخلاقیات پر مبنی تھا کہ ترغیب دی جاتی تھی کہ یتیموں اور مسکینوں کو صدقہ خیرات بھی کثرت سے کرنا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دی تو کافی ہے۔ اگر غلطی کوتاہی ہو جائے تو صدقہ کرو۔ یہ بھی کہا گیا کہ روزہ توڑو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ یا پیسے تقسیم کرو۔ یعنی پیسہ چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے دیا جاتا۔ یہ بڑا حیرت انگیز تصور ہے۔

زمین سے جو فصل نکلتی ہے، اس پر بھی ایک ٹیکس ہے۔ اس کی زکوٰۃ اسی وقت ادا کر دی جاتی ہے کیونکہ فصل کو ایک سال تک محفوظ تو نہیں کر سکتے۔ فصل تو آتی ہے اور استعمال ہو جاتی ہے۔ فصل پر لگنے والے ٹیکس کو عُشر کہتے ہیں۔ عُشر دس فیصد ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کی زمین سے ۱۰۰ من گندم پیدا کی ہے تو اس میں

سے ۱۰ من گندم الگ کر کے بیت المال کو دے دیں۔ یہ ریاست کی آمدنی ہو گی کہ جو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں خرچ ہو گی۔

تیسری چیز خمس ہوتا ہے۔ جو بیس فیصد ہوتا ہے یعنی ۱/۵۔ ہم جب جہاد کی غرض سے افغانستان میں تھے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ سنی مسلمانوں میں خمس کا تصور میدان جنگ کے حوالے سے ہے۔ ہم جب روسی افواج پر حملے کرتے تھے تو مال غنیمت ملتا تھا۔ مثلاً اگر مجاہدین نے روسی فوجی اڈے پر قبضہ کیا اور ۱۰۰ کلاشنکوفیں مل گئیں تو اس میں سے ۲۰ کلاشنکوفیں تنظیم کو چلی جاتیں۔ اور ۸۰ مجاہدین میں تقسیم ہو جاتی تھیں تا کہ وہ انہیں فروخت کر کے اپنے بچوں کی کفالت بھی کر سکیں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اگر تمہیں کوئی چیز غنیمت میں ملتی ہے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا ہے، باقی تمہارا۔ خمس کا خیال اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا کہ مجاہدین جب جہاد پر جایا کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ کاروبار، تجارت یا نوکری نہیں کر پاتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایک ذریعہ آمدن رکھا ہے کہ جو مال غنیمت ملے اس میں سے کچھ حصہ تمہارا تا کہ اپنے بچوں کی کفالت کر سکو۔ اہل تشیع میں بھی خمس کا تصور ہے اور اہل سنت میں بھی۔ مگر اہل سنت اس کو میدان جنگ میں ملنے والے مال غنیمت کے حوالے سے لیتے ہیں۔ اہل سنت میں ایک اور نظریہ یہ بھی ہے کہ ان خزانوں پر بھی خمس لیا جا سکتا ہے کہ جو زمین سے ملتے ہیں یعنی قدرتی ذخائر مثلاً قیمتی پتھر، معدنیات وغیرہ جو کہ زراعت سے متعلق نہیں ہیں۔ یہ قدرتی ذخائر اللہ تعالیٰ تحفے کے طور پر دے رہا ہے لہذا اس میں سے بھی بیس فیصد خمس نکالنا چاہیے۔ جو غریبوں، بیواؤں، یتیموں یا بیت المال میں تقسیم ہو۔

اس کے علاوہ بھی قدرتی معدنی ذخائر کے حوالے سے کچھ اصول بنا دیئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جو مسلمانوں کی اجتماعی جائیداد ہیں۔ ان کی نجکاری نہیں کی جا سکتی۔ آگ، پانی اور جنگلات۔ پانی کے ذخائر مثلاً دریا، جھیلیں، چشمے وغیرہ۔ آپ ان کی نجکاری نہیں کر سکتے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دریا کسی ایک شخص کی ملکیت ہے۔ کیونکہ یہ مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہیں لہذا ہر کوئی انہیں استعمال کر سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تو پانی کی بھی نجکاری کر دی گئی ہے۔ دریا بڑی بڑی کمپنیوں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ پینے کا پانی بھی فروخت ہوتا ہے۔

آگ کی نجکاری بھی منع کر دی گئی ہے۔ اگر آپ اس حدیث شریف کی حکمت کو سمجھیں تو آگ کا مطلب ہے ایندھن کے ذخائر یعنی معدنی تیل، کوئلہ اور گیس وغیرہ۔ پوری دنیا میں تیل اور گیس کی بڑی بڑی نجی کمپنیاں موجود ہیں کہ جو تیل اور گیس کی تجارت کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس سے پوری دنیا تباہ و برباد ہوگئی ہے۔ پوری دنیا میں تیل اور توانائی کے وسائل پر جنگیں جاری ہیں۔

تیسرے قدرتی وسائل کہ جن کی نجکاری نہیں کی جاسکتی وہ جنگلات ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اسلامی ریاست میں یہ ساری چیزیں بیت المال کی ملکیت ہوں اور ان کی نجکاری نہ کی جائے تو سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ ریاست کے تمام تر اخراجات زکوٰۃ، خمس، عشر اور معدنی وسائل سے پوری ہو سکتے ہیں اور اس کے علاوہ عوام پر کسی بھی قسم کا کوئی ناجائز ٹیکس لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کے دور میں اگر کسی معاشرے میں تمام انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس وغیرہ ختم کر دیئے جائیں تو و معاشرہ جنت تصور کیا جائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے تو انگریزی میں ایک عبرتناک کہاوت ہے کہ ''موت اور ٹیکس برحق ہیں اور ان سے فرار ممکن نہیں''، (Nothing is certain execpt death and taxes)۔ آج پاکستان میں تقریباً سالانہ دو ہزار ارب روپے کے ناجائز اور حرام ٹیکس اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ اگر حکومت یہ ناجائز ٹیکس اکٹھے کرنا بند کر دے اور اپنی آمدن کے شرعی ذرائع تلاش کرے تو ملکی معیشت اور مسلمانوں کی ذاتی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کا ہے۔ جہاں تک ان دونوں معاشی فسادوں کا تعلق ہے، تو یہ بھی سرمایہ دارانہ نظام ہی کا کمال ہے کہ یہ لوگ اجارہ داری قائم کرتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں چینی کا بحران پیدا ہوا۔ یہ پانچ یا سات شوگر ملوں کی ذخیرہ اندوزی اور

اجارہ داری کی وجہ سے ہوا ہے کہ جنہوں نے ملک کی پوری منڈی کو کنٹرول کرلیا۔ اسلامی نظام ان اجارہ داریوں کو سختی سے ختم کرتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ آج پوری دنیا میں چاہے خوراک کی رسد اور ترسیل ہو یا تیل اور معدنی وسائل کی، بڑے بڑے عالمی مالیاتی ادارے پوری دنیا کے وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کیے ہوئے ہیں اور وسائل کی ذخیرہ اندوزی کر کے اوران کا مصنوعی بحران پیدا کر کے دنیا میں انکی قیمتوں کو بڑھا چڑھا کر رکھتے ہیں۔ یہ ظالم سرمایہ دار ہر سال کروڑوں ٹن گندم سمندر میں پھینک کر ضائع کر دیتے ہیں مگر ان کو عالمی منڈیوں میں نہیں لاتے تا کہ گندم کی عالمی قیمت کم نہ ہو جائے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں کہ جن کی وجہ سے آج دنیا میں قحط اور جنگیں برپا ہیں۔ اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کیوں اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے اس موجودہ عالمی مالیاتی نظام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہوا ہے۔

اب تک ہم نے جتنا کچھ اس نظام کے متعلق بتایا ہے، اس کے بعد کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اشتراکیت یا سرمایہ دارانہ نظام یا دنیا کا کوئی بھی اور نظام، اسلامی نظام کے قریب بھی پہنچ سکتا ہے؟ اسلامی معاشی نظام انتہائی مستحکم تھا جو حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو سکھایا اور پھر آنے والی صدیوں میں وہ نافذ رہا۔ آج پوری دنیا میں اس نظام کو نہ پڑھایا جاتا ہے نہ ہی اس پر کوئی عمل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ سود اور رباء پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام سے براہ راست متصادم ہے۔

اس نظام سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شدید جنگ کا اعلان کیا ہے۔ اس لیے ہم بھی سود و رباء اور بینکوں کے اس نظام سے اعلان جنگ کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ، ہم خلافت راشدہ کے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کام کریں گے۔ اس سفر میں ہم یا تو مارے جائیں گے یا کامیاب ہو جائیں گے۔ دونوں صورتوں میں ہم کامیاب ہیں۔ مگر سود و رباء کے ناپاک نظام کو ہم کبھی قبول نہیں کریں گے۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو

ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

۱۸

عبوری حکومت کا قیام

مسائل کا قابل عمل حل

خلافت راشدہ کے نظام کا جدید نظاموں سے موازنہ کرنے کے بعد اب یہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ ہم خلافت راشدہ کا نظام اپنے معاشرے میں کس طرح نافذ کریں گے؟ ایک بات تو طے ہے کہ موجودہ نظام کہ جو پاکستان سمیت پوری دنیا میں رائج ہے، وہ نہ صرف کام نہیں کر رہا بلکہ دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اگر ایک بار یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم نے اس بیمار نظام کے ساتھ نہیں چلنا تو پھر اس سے نجات پانے کے ہزار راستے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ خلافت کا نظام ابھی تک پاکستان میں اس لیے رائج نہیں ہو پایا کیونکہ لوگ ایسا چاہتے ہی نہیں ہیں۔

بینکاری کا نظام ہمارے ملک میں کینسر کی طرح پھیل چکا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام اتنا کرپٹ ہے کہ اقتدار کے ایوانوں پر ہمیشہ جاگیرداروں، ظالموں اور ڈاکوؤں کا ہی قبضہ رہتا ہے۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اقتدار حاصل کر لیتی ہے۔ دوسری کے بعد تیسری اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ سیاست میں کرپشن ہے جبکہ معیشت کا بھی بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ وسائل سے مالا مال اس ملک کی یہ حالت کر دی گئی ہے

کہ ہم دنیا سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ عدلیہ کی یہ حالت ہے کہ ملک کو گزشتہ بارہ سالوں سے درپیش دو بڑے مسائل یعنی دہشت گردی یا فساد فی الارض اور کرپشن و خیانت تک کو حل نہیں کر پائی۔ بیت المال میں اتنی خیانت کی گئی ہے کہ اس خوبصورت ملک کے پاس کوئی وسائل ہی باقی نہیں رہے اور یہ آئی ایم ایف کی سخت شرائط پر اس سے قرض لینے پر مجبور ہے اور ان کی شرائط ماننے سے ہمارے معاشرے میں بیروزگاری، مہنگائی، بھوک اور جرائم بڑھ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ حکمران نہ صرف اس کفر کے نظام پر راضی ہیں بلکہ ان کی کرپشن کا احتساب بھی نہیں کیا جاتا۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس پورے نظام کی تصحیح نہیں کی جا سکتی بلکہ اسے مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ جب کینسر بہت زیادہ پھیل جاتا ہے تو طبیب آپریشن کرنے کا کہتے ہیں کیونکہ اگر سرجری نہ کی جائے تو جسم کے باقی حصے بھی بیماری سے متاثر ہو کر کینسر زدہ ہو جاتے ہیں۔ آج یہ کینسر پاکستان کے معاشرے کے ہر جزو میں داخل ہو چکا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ ایک خونریز سرجری کی ضرورت ہے۔

ہم اپنی تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر آن پہنچے ہیں کہ جہاں پاکستان چاروں جانب سے مختلف خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ مغرب کی طرف افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج موجود ہیں کہ جو پاکستان کو ''یوگو سلاویہ'' بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہم (CIA Threats to Pakistan) ''پاکستان کو سی آئی اے سے درپیش خطرات'' سیریز میں کر چکے ہیں۔ مشرق میں بھارت ہمارا پانی روکے بیٹھا ہے اور پاکستان میں مختلف جگہوں پر بغاوتیں بھی برپا کروا رہا ہے۔ اندرونی طور پر ہمیں صوبائیت، لسانیت، فرقہ واریت، مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی میں الجھا دیا گیا ہے۔ پچھلے چند سالوں کے دوران ایک لاکھ سے زائد پاکستانی شہید یا زخمی ہو چکے ہیں اور ملک کے شہروں میں ایک خونریز جنگ جاری ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم کوئی انقلابی قدم اٹھائیں۔ مشکل حالات مشکل فیصلوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ہمیں ان مسائل کا غیر روایتی حل ڈھونڈنا پڑے گا۔

فی الحال ہم جس آئین کے تحت اس ملک کو چلا رہے ہیں، وہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حکم کسی بھی آئین یا کسی شخص کی رائے پر فوقیت رکھتا ہے۔ پینسٹھ سال سے ہمارے ہاں یہی

بحث چل رہی ہے کہ جمہوریت اپنائی جائے یا آمریت بہتر ہے؟ کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اسلامی فلاحی ریاست کی تشکیل کیسے کی جائے؟ اسلامی عدالتی، سیاسی اور معاشی نظام کیسے بنائے جائیں؟ پاکستان کو امت مسلمہ کی قیادت کیسے دی جائے؟ پاکستان کا دفاع کیسے مضبوط کیا جائے؟ ان تصورات پر کوئی بات نہیں کرتا کیونکہ ہمارے نام نہاد سیاستدانوں کو ادب، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، دین، مذہب اور سنت کی الف، ب بھی نہیں معلوم۔ یہ لوگ اس حوالے سے ذہنی طور پر معذور ہیں۔ ہمارے علماء اور دانشور بھی زوال کے اس دور کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ دور امت کیلئے بھی آزمائش کا دور ہے۔ اگر صاحب نظر لوگوں سے بات کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم معاشی قحط سے نہیں گھبراتے، بلکہ ہم قحط الرجال سے گھبراتے ہیں یعنی جب اللہ کے بندے ختم ہونا شروع ہو جائیں۔ ہمارے ملک میں بہت سے دانشور ہیں۔ علمائے حق بھی ہیں اور علمائے سُو بھی۔ لیکن اتنا طوفان بدتمیزی برپا ہے کہ علمائے حق کی اذان یا تو کوئی سن ہی نہیں رہا یا پھر وہ گھبرا کر اپنی اپنی خانقاہوں میں بند ہو گئے ہیں۔ اقبالؒ نے انہی سے کہا تھا۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

یہ میدان جنگ میں نکلنے کا وقت ہے، خانقاہوں میں بیٹھنے کا نہیں۔ آج ہمیں امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ جیسے عالم کہیں نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف ہمیں صلاح الدین ایوبیؒ، نورالدین زنگیؒ اور امام شاملؒ جیسے مجاہد بھی دکھائی نہیں دے رہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ امت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے پیار کرنے والی ہے۔ غلطیاں اور کوتاہیاں بھی بے شک سرزد ہوئی ہیں مگر اب ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ کیا ہم اس ملک میں واقعی یہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں یا اسی طرح کفر اور ذلت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں کہ جیسے گزار رہے ہیں اور یہ سوچ لیں کہ یہی ذلت ہمارا مقدر ہے اور سب ایسا ہی چلے گا؟ نہیں! یہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

یہ بات بالکل طے ہو گئی ہے کہ اب ہم ایسے مقام پر آن پہنچے ہیں کہ اگر یہ نظام تبدیل نہ کیا گیا اور معاشرے میں عدل و انصاف فراہم نہ کیا گیا، چاہے وہ سیاسی عدل ہو یا معاشی عدل ہو یا معاشرتی عدل، تو

یہ معاشرہ تقسیم ہو جائیگا۔حضرت علیؓ کا قول ہے کہ معاشرہ کفر کے ساتھ تو چل سکتا ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔ جبکہ ہمارے معاشرے میں ظلم ہر سطح پر آخری حدیں تک پار کر چکا ہے۔

اب جبکہ ہم اس سوال پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان میں تبدیلی کیسے لائیں؟ ہمیں بہت سے نظام ٹھیک کرنے ہیں۔عدالتی نظام، سیاسی نظام، معاشی نظام۔مگر یہ سب اس وقت تک شروع نہیں ہوگا کہ جب تک حکمران ٹھیک نہیں ہونگے۔اعلیٰ سے اعلیٰ پالیسیاں اور مالی معاونت کامیاب نہیں ہوسکتی اگر حکمران مخلص اور اہل نہ ہوں۔ ہماری قیادت ہی منافق ہے۔اس میں جرأت کردار ہی نہیں ہے۔نگاہ بلند سخن دلنواز اور جاں پرسوز قیادت ہی میسر نہیں ہے۔ایسی حالت میں نچلی سطح پر کوئی بھی پالیسی یا تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ پاکستان کے مختلف اداروں کی حالت ہی دیکھ لیجیے۔

موٹروے پولیس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ملک میں سب سے اچھی پولیس وہی ہے۔ ایک بہتر نظام کام کرر ہا ہے۔ حالانکہ وہی لوگ ہیں، وہی پولیس ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی قیادت کچھ اچھے لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے اور پھر اچھی پالیسیاں بنا دی گئیں۔انہیں نظم وضبط کا پابند بنایا گیا ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ یہی پاکستانی موٹروے پر گاڑی چلاتے ہوئے لین کا دھیان کرتے ہیں،حفاظتی بیلٹ بھی باندھتے ہیں اور حد رفتار عبور نہیں کرتے۔ پاکستان کی ساری پولیس کو کرپٹ کہا جاتا ہے مگر موٹروے پولیس کے بارے میں تو ٹرک والوں نے بھی لکھا ہوتا ہے کہ ''موٹروے پولیس زندہ باد''۔ یہ کیسے ہوا؟ اپنے ہی ملک کے اندر ہم نے ایک چھوٹا سا نظام بنا کر دکھا دیا کہ اچھی قیادت ہو، اچھی پالیسیاں ہوں تو آپ تبدیلی لا سکتے ہیں۔

پاکستان میں دوطرح کے نظام ہیں۔ کچھ نظام ایسے ہیں کہ جن کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔انہیں مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔مثلاً پی آئی اے، ریلوے، واپڈا، سوئی سدرن، سوئی نادرن وغیرہ، یہ

قومی ادارے ہیں۔ موٹروے پولیس ایک ادارہ ہے۔ ان سب کا متبادل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔موٹروے پولیس کو بہتر پالیسیوں اور سخت نظم ونسق کی وجہ سے ٹھیک کرلیا گیا۔ان قومی اداروں میں بھی اسی طرح بہتری لائی جاسکتی ہے۔ پی آئی اے کی مثال لے لیجیئے۔ جب ایئر مارشل نور خان پی آئی اے کے سربراہ تھے تو یہ ادارہ عروج پر تھا۔مگر بعد میں چونکہ قیادت کمزور رہی لہذا آج یہ ادارہ زوال کا شکار ہے۔ یعنی قیادت اچھی ہو تو ادارے ترقی کرنے لگتے ہیں، خواہ پورا ملک زوال کا شکار ہی کیوں نہ ہو۔ پورے ملک پر بھی قیادت اور ترقی کا یہی فلسفہ لاگو ہوتا ہے۔ملک کے بہت سے ادارے ایسے ہیں کہ جن میں طاقتور قیادت کے ذریعے اصلاحات ممکن ہیں۔ واپڈا میں اچھا آدمی تعینات کردیں وہ واپڈا کو ٹھیک کردے گا۔اسی طرح ریلویز کو بھی ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔اسے اختیار اور طاقت دیں وہ اصلاحات لے آئے گا۔اگر ملک کی قیادت اچھی اور مخلص ہو جائے تو یقیناً ملک بھی ترقی کریگا۔

یہ تمام ادارے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اہم ہیں۔مگر یہ قوموں کی تقدیر بدلنے والے ادارے نہیں ہیں۔ قوموں کی تقدیر نظریات، روحانیت اور فکری انقلاب سے بدلتی ہے۔جس کیلیئے نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر ہم نے علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اپنا کردار ادا کرنا ہے تو سب سے پہلے ہمیں عظیم قیادت کی ضرورت پڑے گی۔سب سے پہلے ہمیں اپنی سیاسی قیادت کو مضبوط کرنا ہوگا۔

پاکستان میں اس وقت پارلیمانی جمہوری نظام رائج ہے۔ بار بار یہ ختم ہوتا ہے تو آمریت آجاتی ہے۔ آمریت ختم ہوتی ہے تو پارلیمانی جمہوری نظام ایک بار پھر اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے۔کبھی پارلیمانی جمہوریت اور کبھی آمریت، ملک کا بیڑہ غرق کرچکی ہے۔ دونوں طرح کے نظاموں میں سود اور ربا کا نظام قائم ودائم رہتا ہے۔ معاشرتی مسائل اسی طرح پھلتے پھولتے ہیں۔طوائف الملوکی کی حالت ویسی ہی رہتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایک تیسرا سیاسی نظام اپنائیں جو کہ خلافت راشدہ کی طرز کا ہو۔خلافت راشدہ کے سیاسی نظام میں سیاسی جماعتیں نہیں ہوتیں۔

اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ موجودہ دور میں یہ کس طرح ممکن ہے تو جواب یہ ہوگا ''ویسے ہی جیسے ایرانیوں

نے کیا ہے۔‘‘ ان کے ملک میں ۱۹۷۹ء سے عوام کی مرضی کی حکومت چل رہی ہے۔ ہر پانچ سال بعد ملک میں انتخابات ہوتے ہیں اور آج تک وہاں قیادت کے حوالے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ کے بنائے ہوئے سیاسی نظام کے مطابق ایرانی معاشرے سے چند بہترین افراد کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ پوری قوم اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے اور ان چند بہترین افراد میں سے ایک کو اپنا سربراہ منتخب کر لیتی ہے۔ نہ کوئی سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں اور نہ ہی یہ مغربی جمہوریت ہے کہ جس میں سرمایہ دار پیسہ لگا کر اختیار اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ایرانی آج کے دور میں اپنی پسند کا ایک نیا نظام قائم کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کا نظام نہیں چل سکتا۔ اسے چونکہ ٹھیک بھی نہیں کیا جا سکتا لہذا اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ بہت انقلابی قدم لگے گا مگر اس نظام کی تبدیلی کیلئے ہمیں ایک نگران حکومت کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں ان بہترین افراد کا چناؤ کرنا ہے کہ جن کی پوری زندگی ملک کے دفاع اور خدمت میں گزری ہے۔ ان میں سے کچھ سائنسدان ہونگے، کچھ انجینئر ہونگے، کچھ ڈاکٹر ہونگے اور کچھ تحقیق کار۔ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے اپنے شعبے کے ماہرین اور بہترین انتظامی امور چلانے والے دیانتدار محبّ وطن۔ ان میں یہ خصوصیت ہو کہ انہوں نے ملک کو ہمیشہ کچھ دیا ہو، لیا بہت کم ہو۔ کیا ایسے لوگ ختم ہو گئے ہیں؟ نہیں! ایسے لوگ ہی پاکستان کو چلا رہے ہیں مگر چونکہ وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے لہذا وہ کبھی سینیٹر یا قومی اسمبلی کے رکن نہیں بن سکتے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان بہترین افراد کا انتخاب کریں اور ان کے ہاتھ میں اقتدار اور اختیار دے دیں کہ ملک میں بہتری لاؤ۔ یہ نگران حکومت پانچ سال تک کام کرے اور ان پانچ سالوں کے دوران انہوں نے کم از کم دو مقاصد حاصل کرنے ہونگے۔ کرپشن کا خاتمہ اور امن عامہ کی بہترین صورتحال۔ جب وہ نگران حکومت اربوں روپے سالانہ ہونے والی کرپشن و خیانت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو ہمیں کسی بیرونی قرضے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ پیسہ پورے ملک میں گردش کریگا اور ملک میں خوشحالی آئے گی۔ دہشت گردی اور فساد فی الارض کو ختم کرنے کیلئے قرآن کے احکامات کے مطابق قصاص اور عدل کو نافذ کرنا پڑے گا۔

چونکہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے اوراس کو اندرونی اور بیرونی خطرات بھی لاحق ہیں لہذا ہم یہاں کسی قسم کی کوئی بغاوت برپا نہیں کرنا چاہتے۔اگر یہاں انگریزوں کی حکومت ہوتی تو ہم یقیناً بغاوت کر دیتے مگر یہ ہمارا اپنا ملک ہے لہذا ہم انقلاب لانے کیلئے ایک شیشہ بھی نہیں توڑنا چاہتے۔ہم اس پاک سرزمین اوراس کی کسی چیز کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچانا چاہتے۔تبدیلی اپنے ہی لوگوں کے ذریعے آئے گی اور ایسے عمل کے ذریعے آئے گی کہ جو خونی انقلاب نہ برپا کرے بلکہ مسائل حل کرے۔ہمیں پاکستان کو مستحکم رکھتے ہوئے اس میں تبدیلی لانی ہے۔اس سے تبدیلی مثبت ہوگی۔لہذا پہلا قدم نگران حکومت کا قیام ہے۔ یہ حکومت جمہوریت اور انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتی لہذا اس کو براہ راست لانا ہوگا جس کیلئے صرف فوج ہی کا ادارہ باقی رہ گیا ہے۔فوج کی نگرانی میں یہ نگران حکومت ان لوگوں پر مشتمل ہوگی کہ جو محبّ وطن ہوں۔محبّ وطن کی تعریف یہ ہے کہ بندہ اٹھارہ گھنٹے کام کرے،اور وہ رات کو سوئے بھی تو پاکستان کی محبت سے بھرپور خواب دیکھے۔ وہ خیانت نہ کرتا ہو اور جسے خریدا نہ جاسکتا ہو۔علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کی یہی خصوصیات بیان کی تھیں کہ ان کے سامنے ساری دنیا کی دولت بھی ڈھیر کردی جائے تب بھی وہ پاکستان سے خیانت نہ کریں گے۔

آج ہمیں ایسے ہی محبّ وطن اشخاص چاہیں کہ جو اس قدر دلیر اور جرأت مند ہوں کہ اللہ کے سوا کائنات میں کسی سے نہ ڈریں اور اپنے آپ کو اپنے ضمیر کے سامنے رسوا نہ کریں۔ جہاں سے مرضی چاہیں ایک ایسا پاکستانی تلاش کر کے اسکو اپنا سربراہ بنالیں۔خواہ وہ کسی بھی شعبے یا پس منظر سے تعلق رکھتا ہو۔وہ اپنی ذاتی زندگی میں حقوق اللہ پورے کرتا ہو یا کم ازکم اس حوالے سے مخلص ضرور ہو۔ وہ اللہ کے دین سے غداری اور بغاوت نہ کرتا ہو۔ہم سب میں کوئی نہ کوئی کمزوری یا کوتاہی ضرور ہوتی ہے مگر اکثر مسلمان اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے جان بوجھ کر غداری اور بغاوت نہیں کرتے۔اگر کسی شخص میں کوئی کمزوری ہو، اس سے کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہو مگر وہ میدان جنگ میں غیرت اور شجاعت سے پاکستان کا جھنڈا بلند کرتا ہے تو یہ اس کی غلطی اور کوتاہی کا کفارہ بن جاتا ہے۔اس کے گناہ اور غلطیاں اللہ معاف کرنے والا ہے مگر وہ امت مسلمہ اور پاکستان کے ساتھ خیانت نہ کرے۔یہی ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ایسے شخص کو اگر تنخواہ دس ہزار ملے تو وہ کام پچاس ہزار کا کرے۔اسکا ہاتھ پاکستان کو دینے والا ہو، لینے والا نہ ہو۔اس نگران

حکومت کے اہلکاروں کو آج کے وزراء کی طرح تنخواہ، بونس، گھر، گاڑی وغیرہ نہیں ملے گی کیونکہ وہ دینے والے ہونگے، لینے والے نہیں۔ قائداعظمؒ بھی تو تھے جو فقط ڈیڑھ روپیہ تنخواہ کے طور پر لیتے تھے۔ اگر کسی کے حالات زیادہ خراب ہوئے اور گھر میں فاقے ہوئے تو اسکا دس پندرہ ہزار روپے وظیفہ مقرر کردیا جائیگا۔ ابھی لوگ اس لیے ایم این اے اور ایم پی اے بنتے ہیں کیونکہ ان کیلئے یہ ایک کاروباری سرمایہ کاری ہوتی ہے کہ ایک کروڑ لگا کر رکن بنیں اور پچاس کروڑ تو کمائیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ان عہدوں سے وابستہ فوائد ہی ختم کردیئے جائیں۔ انہیں کہا جائے کہ تم اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری پر مامور ہو۔ پھر وہی اس طرف آئیں گے جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری ادا کرنا چاہیں گے۔ سادہ سی بات یہ ہے کہ ہمیں محبّ وطن نگران حکمرانوں کی ضرورت ہے۔

کرپشن کے نتیجے میں فساد فی الارض پھیلتا ہے۔ لہذا سرکاری دولت میں خیانت کی سزا بھی پھانسی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص خوراک اور دوائیوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور لوگ بھوکے اور بیمار ہو کر مر رہے ہوں تو ایسے شخص کی سزا بھی پھانسی ہونی چاہیے۔ ایسے شخص کے لیے تو ایک موت کی سزا بھی کم ہے۔ پاکستان کی پہلی ضرورت اچھی قیادت ہے۔ اگر ہمیں سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ جیسی قیادت مل جائے کہ جو مزدوروں کی طرح کام کرے، اپنی ذات پر کچھ نہ خرچ کرے، جس کا کردار قائداعظمؒ کی طرح بلند ہو کہ اگر ان کی بہن کیلئے بھی سات روپے کی کرسی اضافی آجائے تو اس کے پیسے بیت المال کی بجائے اپنی بہن سے ادا کرنے کو کہیں، تو اس ملک کے نصیب راتوں رات چمک جائیں گے۔

ایک مرتبہ کابینہ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ اے ڈی سی نے ممبران سے پوچھا کہ وہ چائے کے ساتھ بسکٹ لیں گے یا کیک؟ تو قائداعظمؒ نے فرمایا کیا یہ لوگ گھر سے کھا پی کے نہیں آتے؟ انہیں صرف پانی پلاؤ۔ کیا ہم آج کے دور میں یہ نہیں کرسکتے؟ اگر ہمارے سارے سیاستدان اس طرح کا رویہ اپنا لیں تو ملک میں انقلاب برپا ہو جائیگا۔ اس کے بعد کسی ادارے کے سربراہ کی یہ مجال نہیں ہوگی کہ وہ خیانت کرے۔ ابھی تو آپ ان کے محل نما کمرے دیکھیے۔ ایک ہزار گز پر ان کا آفس بنا ہوتا ہے جس کی اندرونی آرائش پر ہی کروڑوں روپے خرچ کردیئے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ تمہیں کس نے اتنے

سرکاری وسائل خرچ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ان محل نما دفتروں کے باہر لوگ جھگیوں میں بھوک سے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ایسے میں وہ اپنے آفس کی آرائش وزیبائش پر اتنا خرچ کیسے کر سکتے ہیں جبکہ وہ پاکستان کے عوام اور بیت المال کا پیسہ ہے۔ایسے اشخاص کا احتساب ضروری ہے۔

نگران حکومت بہت سختی سے اپنے احکامات پر عملدرآمد کروائے گی۔ان حالات میں ہمارا موجودہ عدالتی نظام اور آئین کام نہیں کر پائیگا۔ہمیں خصوصی عدالتیں بنانی پڑیں گی۔سول مقدمات کو ثالثی اور مصالحت کے تحت حل کیا جائیگا۔امن عامہ اور کرپشن کا تعلق فساد فی الارض سے ہے،لہذا ان معاملات کیلئے ہمیں ایسی قاضی عدالتیں بنانی پڑیں گی کہ جو مقدمے کی اسی دن سماعت کر کے فوراً فیصلہ سنا دیں۔اگر کسی شخص نے کئی آدمیوں کا خون کیا ہے یا خودکش حملہ آوروں کو تربیت دیتا رہا ہے اور پکڑا گیا ہے تو اس پر دس سال مقدمہ چلانے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اسے پندرہ منٹ میں ہی فیصلہ سنا کر کیفر کردار تک پہنچانا ہوگا۔

معاشرے میں موجود ساری خرابیاں دور ہوسکتی ہیں مگر اس کیلئے پہلا قدم نگران حکومت کا قیام ہوگا۔یہ سب ہماری سیاسی جماعتوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔یہ لوگ کام بھی نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی قابلیت رکھتے ہیں۔لہذا اس سے پہلے کہ ملک میں کوئی خونی انقلاب آئے یا کوئی طالبان قسم کا انقلاب آئے،فساد برپا ہوجائے جو کہ ہوتا نظر آرہا ہے کیونکہ افراتفری اس حد تک پھیل چکی ہے کہ خطرہ ہے کہ یا تو ملک کے اندر بغاوت ہوجائے یا باہر سے کوئی دشمن ملک پر چڑھ دوڑے۔

ہمیں تقریباً چالیس بہترین لوگوں کی ضرورت ہے۔اسکے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ صوبائی خودمختاری کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی جائے گی۔صوبائی خودمختاری اس ملک کو توڑنے کا نسخہ ہے۔قائداعظمؒ نے بھی اسے سختی سے مسترد کر دیا تھا۔صوبائی خودمختاری کے حامی یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے ۱۹۴۰ء کی تقریر میں کہا تھا کہ صوبے خودمختار ہوں گے۔یہ لوگ اصل بات سامنے نہیں لاتے کیونکہ یہ جھوٹے ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ قائداعظمؒ تب برطانوی حکومت کے زیر تسلط ہندوستان کے تناظر میں بات کر رہے تھے۔اس وقت یہ قانون تھا کہ اگر کسی نے آزادی کی بات کی تو اسے جیل بھیج دیا جائیگا۔لہذا آزادی کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس لیے قائداعظمؒ نے خودمختاری کا لفظ استعمال کیا۔

قائداعظمؒ نے کہا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں ہمیں برطانوی حکومت کے تحت خودمختاری دے دی جائے۔ مگر جب پاکستان وجود میں آ گیا تو قائداعظمؒ نے واضح انداز میں کہا کہ اب صوبائی خودمختاری کی بات نہیں ہوگی بلکہ وفاق کو مضبوط کیا جائیگا کیونکہ اب ہم ایک قوم بن چکے ہیں۔ جو لوگ صوبائی خودمختاری کی بات کرتے ہیں، وہ ملک کو توڑنے کی بات کرتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات بھی صوبائی خودمختاری سے شروع ہوئے تھے۔ وہ اس حد تک چلا گیا کہ مشرقی پاکستان کی فوج اور کرنسی بھی الگ کرنے کا مطالبہ کر دیا کہ جس کے نتیجے میں خانہ جنگی ہوئی اور پھر ملک بھی ٹوٹ گیا۔ آج تمام ضمنی قومیت پرست ۱۹۴۰ء کی تقریر کو بنیاد بنا کر خودمختاری کی بات کرتے ہیں مگر وہ سب جھوٹ بول کر قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ وہ ان الفاظ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور ان حالات کا جائزہ بھی نہیں لیتے کہ جو اس وقت تھے۔ اُس وقت انگریز کی حکومت تھی۔ اب ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ تب ہم ملک توڑنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے بھی صوبائی خودمختاری کا نعرہ بلند کیا۔ اب ہم ملک نہیں توڑنا چاہتے۔ آج ضمنی قومیت پرست یہی کھیل ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ پاکستان ایک ریاست ہے۔ اس کی تقسیم نہیں ہوگی۔ یہ بڑا ہوسکتا ہے، چھوٹا نہیں۔ لہذا ہمیں ایک ایسی نگران حکومت چاہیے کہ جو کرپشن کا خاتمہ کرے، دہشت گردی پر قابو پائے اور وفاق کو مضبوط کرے۔

جب ملک میں خیانت ختم ہو جائے گی تو ہر صوبے کو وافر مقدار میں پیسہ ملنا شروع ہو جائیگا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں کرے گا۔ ابھی مسائل اس لیے ہیں کہ نظام کام ہی نہیں کر رہا۔ ابھی بلوچستان، سندھ اور سرحد کے عوام شور مچاتے ہیں کہ ہمیں ہمارے حقوق نہیں مل رہے۔ ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ مگر کیا پنجاب کے دیہی علاقوں میں غربت نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پورا ملک تکلیف میں ہے اور اس کا علاج صوبائی خودمختاری نہیں، نظام کو تبدیل کرنا ہے۔ اسکا حل یہ ہے کہ مرکز کو اتنا مضبوط کیا جائے اور اتنی ایماندار قیادت لائی جائے تا کہ ایک ایک روپیہ غریب عوام تک پہنچے اور بیت المال میں کوئی خیانت نہ ہو۔

معاملات اس قدر صاف وشفاف کر دیئے جائیں کہ سب سرمایہ کاروں کو اطمینان ہو کہ وہ غلط جگہ پیسہ نہیں لگا رہے۔ دنیا میں موجود ارب پتی اور کھرب پتی پاکستانی اگر دوبئی میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں تو حالات

سازگار ہونے پر پاکستان میں بھی سرمایہ کاری کریں گے۔صرف امن وامان کی صورتحال بہتر بنانے کی ضرورت ہےاور یہ کرنا قطعاً ناممکن نہیں ہے۔

نگران حکومت کے قیام کے بعد ممکن ہوجائے گا کہ سیاسی عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ سیاسی عمل کو آگے بڑھانے کیلئے خلافت راشدہ کے نظام کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔یعنی براہ راست صدارتی انتخاب کروانا ہوگا۔ہمیں اپنے ملک کے آئین میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ چاہے ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کرے مگر انتخابات کا یہ طریقہ ہو کہ ملک کے چار پانچ بہترین لوگ نامزد کیے جائیں اور عوام سے کہا جائے کہ کسی ایک کو اپنا امیر منتخب کرلو۔ایران میں ایسے ہی ہوتا ہے۔امریکہ میں بھی صدارتی انتخاب ہوتا ہےاور صدر منتخب ہوکر وہ شخص ہزاروں افراد پر مشتمل اپنی ٹیم کے ارکان کا انتخاب کرلیتا ہے۔خلافت راشدہ کے نظام میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔خلیفہ منتخب کرلیا جاتا ہے۔اس کے بعد خلیفہ اپنی ٹیم ،اپنی کابینہ کے ارکان اور اپنے مشیروں کا انتخاب خود کرتا ہے۔

شوریٰ لازمی چاہیے مگر ہمارے ہاں ہر علاقے کا وڈیرہ اور جاگیردار،خواہ وہ کتنا ہی ظالم و جابر اور ان پڑھ کیوں نہ ہو،منتخب ہوکر اسمبلی میں آن پہنچتا ہے۔اب ہمیں بہترین لوگوں کا انتخاب کرنا ہے،ڈاکٹر،انجینئر، اساتذہ،علماءاور وہ تمام لوگ کہ جن کا وزن ہے معاشرے میں،وہ لوگ جنہوں نے علم حاصل کرنے میں اپنی زندگیاں کھپا دی ہیں،جو صاحب الرائے لوگ ہیں،جن کے پاس سوچ،فہم اور فکر ہےاور جو جاہل نہیں ہیں۔دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے پالتو جانوروں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ان کو نہ شریعت کا علم ہوتا ہے،نہ حرام وحلال کی تمیز۔ایک جاہل شخص کہ جس کے پاس دین و دنیا کا علم پہنچا ہی نہیں،اور ایک عالم،سائنسدان یا انجینئر کہ جس نے اپنی ساری زندگی حصول علم میں گزار دی ہو،ان کی رائے کو برابر کیسے کہا جا سکتا ہے؟

متبادل نظام میں پارلیمنٹ (شوریٰ) کے ارکان کا انتخاب اس بنیاد پر ہوگا کہ ممبران نے ملک کی ترقی کیلئے، امت رسول ﷺ کیلئے کیا خدمات انجام دی ہیں۔اسی بنیاد پر پورے ملک سے تین چار سو افراد کی شوریٰ منتخب کی جائے۔ان افراد کا انتخاب خلیفہ بھی کرسکتا ہے۔آپ اس عہدے کو چاہے جو بھی نام دے لیں

لیکن خلیفہ میں وہ صفات ہونی چاہیں کہ جو سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ میں تھیں۔ وہ خلیفہ پھر دس پندرہ افراد کی بہترین کابینہ منتخب کرے اور شوریٰ یعنی پارلیمنٹ بنائے۔ یہ سب قابل عمل ہے۔ اگلے مراحل کی بنیاد اس نظام پر رکھی جائے گی۔

اس تمام عمل کیلئے ایک محدود عرصہ طے کیا جاسکتا ہے کہ ایک امیر پانچ سال کیلئے کام کرے اور پھر دوبارہ انتخاب کروایا جائے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ لچک رکھی جائے اور کوئی مخصوص مدت طے کیے بغیر بہتر افراد کی دستیابی کی صورت میں پرانا امیر تبدیل کر کے نیا امیر تعینات کر دیا جائے۔ جو مسئلہ درپیش ہو، اس سے متعلق بہترین افراد سے مشورہ لیا جائے جیسا کہ آجکل اکثر عدالتیں کرتی ہیں کہ اگر طب کے حوالے سے کوئی مسئلہ آ گیا ہے تو سب سے اچھے ڈاکٹر کو بلوا کر اس سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ ان کو عدالتی زبان میں عدالت کے دوست کہا جاتا ہے۔ اگر عدالت کو کوئی دینی مسئلہ درپیش ہو تو علمائے دین کو بلایا جاتا ہے۔ یہ لوگ عدالت کے مستقل ملازم نہیں ہوتے لیکن مشکل وقت میں انہیں بلا لیا جاتا ہے۔ خلیفہ یا سلطان کے بھی ایسے مشیر ہو سکتے ہیں۔

یہ نظام آمریت جیسا نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص کے مشورے سے کام انجام پائیں گے۔ حتمی رائے خلیفہ یا سلطان کی ہوگی۔ یہ ایک اعلیٰ نظام ہوگا کہ جس میں پیشہ ور سیاستدان نہیں بلکہ محبّ وطن ماہرین ہونگے۔ یہی بنیادی فرق ہے۔ آپ محبّ وطن، اسلامی اور نظریاتی ماہرین کو لیکر آئیں کہ جو اپنے شعبہ جات میں مہارت رکھتے ہوں۔ اس میں ہر بندے سے مشورہ اس کی اہلیت پر لیا جائے گا نہ کہ اس کے خاندانی و سیاسی پس منظر کی وجہ سے۔ اس طرح سیاسی نظام تبدیل ہو جائے گا۔ اگر دفاع سے متعلق کوئی معاملہ درپیش آ گیا تو فوج کے جرنیلوں سے مشورہ لیا جائیگا یا دفاعی امور کے تجزیہ نگاروں سے۔ طبی اخلاقیات پر ان علماء سے مشورہ لیا جائے گا کہ جو ڈاکٹر بھی ہوں گے۔ معیشت سے متعلق مسائل کے حوالے سے ان ماہرین معاشیات سے رائے لی جائیگی کہ جنہیں مروجہ اور اسلامی معاشی نظام دونوں کے بارے میں مکمل آگاہی ہوگی۔ ایک ایسی شوریٰ کہ جس میں بہترین مسلمان ماہرین ہوں۔ فی زمانہ یہ شوریٰ کا بالکل نیا تصور ہے۔

یہ صرف ایک جھلک ہے ان تبدیلیوں کی کہ جو ہمیں لانی ہیں۔ ان پر بحث کی جا سکتی ہے اور مزید اصلاحات کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ موجودہ پارلیمانی نظام اور آمریت مزید نہیں چل سکتے۔ ہمیں خلافت راشدہ کی طرز کا نظام اپنانا ہوگا کہ جو جدید دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو، جو کرپشن اور دہشت گردی کا بھی خاتمہ کرے اور اس میں بہترین لوگ حکومت کو مشورہ دیں۔ اس کے بعد ہی ہم معاشرے میں تبدیلی لا کر پورے نظام کو خلافت راشدہ کی بنیادوں پر استوار کرسکیں گے۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

۱۹

عبوری حکومت کے ابتدائی اقدامات

گزشتہ باب میں ہم عبوری حکومت کے قیام اور ترجیحات کے حوالے سے بات کی تھی۔ ہم نے اس پر بحث کی تھی کہ پاکستان کا موجودہ پارلیمانی جمہوری نظام عملی طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ یہ نظام ملک کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ان کے پاس نہ ہی افرادی قوت اور وسائل ہیں اور نہ ہی رہنمائی کی صلاحیت۔ موجودہ رہنما عوام کے مسائل سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ ان کی سوچ وفکر گلیاں ٹھیک کروانے اور پینے کا ٹھنڈا پانی فراہم کرنے سے آگے نہیں جا سکتی۔ قوم کیا ہے اور قوموں کی امامت کیونکر کی جاسکتی ہے، ان کے ذہن یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کا نہ تو کوئی نظریہ ہے، نہ ہی کوئی روحانی اساس۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ان کی گفتگو سنیں تو انسان بلڈ پریشر کا مریض بن جاتا ہے۔ ان کی گفتگو انتہائی فحش اور سطحی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ سب بے شرم لوگ ہیں۔ اپنی لڑائی کے دوران یہ گالم گلوچ سے بھی باز نہیں آتے اور دنیا تماشا دیکھ رہی ہوتی ہے۔ کیا ایسے لوگ اکیسویں صدی میں مسلم امہ کی رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دے پائیں گے؟

یہ بات ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اب ہمیں ایک نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز قیادت کی ضرورت ہے جو کہ محبّ وطن اور ایماندار افراد پر مبنی نگراں حکومت کے ذریعے ہی آسکتی ہے، موجودہ نظام کے تحت نہیں۔

وہ نگران حکمران اقتدار میں آ کر اس نظام کو تبدیل کریں۔ وہ ظالموں کے لیے بے رحم اور سنگدل ہوں، تاکہ کرپشن اور امن عامہ کے حوالے سے صورتحال کو بہتر بنا سکے۔ جو لوگ خودکش حملے کرتے ہیں اور دہشت گردی میں ملوث ہیں، ان کا جڑ سے صفایا کریں۔ یہ دہشت گرد مذاکرات اور پیار محبت سے ماننے والے نہیں ہیں۔ جن کے منہ کو حرام لگ چکا ہو، ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ظلم کے اس نظام کو ختم کرنے کیلئے ان مجرموں کو وہ سزائیں دی جانی چاہئیں کہ جو قرآن نے مقرر کر دی ہیں۔ کم از کم ان دو مسائل پر یعنی کرپشن اور فساد فی الارض پر عبرتناک سزاؤں کی ضرورت ہے۔

ہمیں فوری طور پر ایک قومی فوج تشکیل دینی ہے۔ ہماری آبادی سترہ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ جس میں سے بارہ کروڑ نوجوان ہیں۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کو جنگ کی تربیت دے دیں تو وہ ضرورت پڑنے پر ملت کے سپاہی بن سکتے ہیں۔ چھ لاکھ فوج اور دس کروڑ کے اضافی دستے۔ ان حالات میں کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ پاکستان کی طرف میلی نگاہ سے دیکھے۔

اکیسویں صدی میں تمام جنگیں شہروں میں لڑی جا رہی ہیں۔ افغانستان، عراق، لیبیا اور شام کی مثال ہی لے لیجیے۔ اس سے پہلے یوگوسلاویہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یوگوسلاویہ میں جنگ بوسنیا کے بچوں نے لڑی ہے۔ چھوٹے چھوٹے سکول جانے والے بچے ہتھیار اٹھائے سربوں کا مقابلہ کر رہے ہوتے تھے۔ عراق میں بھی طالبعلم ہی مزاحمت کر رہے ہیں۔ افغانستان میں بھی عام کسان عالمی طاقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آنے والا دور اسی قسم کی جنگوں کا ہے کہ جنہیں ''کثیر الجہتی شہری'' جنگوں کا نام دیا گیا ہے۔

ہمیں ثالثی عدالتیں یا قاضی عدالتیں بنانی ہونگی کہ جو کم از کم تین یا چار قسم کے مسائل حل کریں۔ جیسا کہ ابھی خاندانی مسائل کے حل کیلئے علیحدہ عدالتیں موجود ہیں۔ ہمارے معاشرے میں نوے فیصد مسائل ایسے ہیں کہ جو ثالثی اور تصفیے کے ذریعے حل کیے جا سکتے ہیں۔ لوگ انصاف کیلئے متبادل ذرائع کیوں تلاش کرتے ہیں؟ کبھی مجرمانہ گروہ بنا لیتے ہیں، غنڈے بن جاتے ہیں یا کبھی جرگے میں چلے جاتے ہیں مگر ریاست کے پاس نہیں آتے کیونکہ انہیں ریاستی نظام عدل سے خوف آتا ہے۔ اس لیے پھر ریاست کے اندر ریاستیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ ریاست کو کام کرنا پڑے گا۔ ریاست کو انصاف کی فراہمی کیلئے قاضی عدالتیں بنانی

پڑیں گی۔ ملک کی ۹۹ فیصد آبادی کے مسائل اس نوعیت کے ہیں کہ جو ثالثی، تصفیے اور قاضی عدالتوں کے ذریعے حل کیے جاسکتے ہیں۔ بے شک انہیں سیشن کورٹ کا نام ہی دے دیا جائے لیکن وہاں سے تمام کچرا ہٹا دیا جائے کہ جو انگریزی عدالتی نظام سے وابستہ ہے۔ لوگوں کو قاضی تک براہ راست آنے کی اجازت دی جائے اور معاملہ وہیں طے پا جائے۔ انصاف کے حصول کیلئے تھرپارکر سے اسلام آباد نہ آنا پڑے یا سوات میں رہنے والے شخص کو پشاور نہ جانا پڑے۔

میں ترکی گیا تو وہاں ایک بڑی سی عمارت دیکھی کہ جس پر لکھا تھا ''عدالت سرائے''۔ یقیناً وہاں بھی وکیلوں وغیرہ کا نظام موجود ہے مگر ترکوں میں اور اس سے پہلے مغلوں میں بھی ایسا عدالتی نظام رائج تھا کہ جس کے تحت جگہ جگہ عدالت سرائے قائم تھیں جہاں ریاست کے عدالتی افسر بیٹھے ہوتے تھے اور انصاف کے حصول کیلئے کسی کے پاس بھی جایا جاسکتا تھا۔

ریاست کے پاس پولیس کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ طرز حکومت میں پولیس بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ پولیس کہ جس کا کام مجرموں کو پکڑنا اور امن عامہ کی صورتحال کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ دوسری وہ پولیس ہوتی ہے جس کا کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یعنی اچھائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے منع کرنا۔ وہ پولیس حرام اور حلال چیزوں کے حوالے سے لوگوں پر نظر رکھتی ہے کہ کوئی نشہ نہ کرے، جواء نہ کھیلے، معاشرے میں فحاشی اور بدکاری نہ پھیلے۔ اس پولیس کا کام نگرانی کرنا ہے جو کہ بہت ضروری ہے۔ یہ پولیس معاشرتی بے ضابطگیوں پر بھی نظر رکھتی ہے اور انہیں روکنے کیلئے اقدامات کرتی ہے مثلاً کسی بڑے شخص کی شادی ہو تو اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ پوری سڑک کو گھیر لیتے ہیں اور ہوائی فائرنگ ہوتی ہے، کوئی روکنے اور پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اس سے عوام کو پریشانی اور تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر والی پولیس ایسے کاموں پر نظر رکھتی ہے اور ان مسائل کا سدباب کرتی ہے۔ ان کا مقصد معاشرے میں نظم وضبط برقرار رکھنا ہوتا ہے۔

خلافت راشدہ کے طرز حکومت میں جیل کے نظریے کی بھی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ جیلوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن پر مقدمات چل رہے ہوتے ہیں۔ جیل کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں کم از کم دس بارہ

قیدی موجود ہوتے ہیں کہ جن میں کوئی سائیکل چور ہوتا ہے، کوئی بینک ڈکیت ہوتا ہے اور کوئی اغواء کار۔ ایک غریب سائیکل چور، جو کسی مجبوری کے تحت سائیکل چراتا ہے، جیل میں جا کر اسکا واسطہ بڑے مجرموں سے پڑتا ہے اور جب وہ جیل سے باہر نکلتا ہے تو اس وقت تک وہ ان بڑے عادی مجرموں کا ساتھی بن چکا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جیل میں جا کر انسان سدھرتے نہیں ہیں بلکہ زیادہ بڑے مجرم بن کر نکلتے ہیں، لہذا جیل کا موجودہ تصور معاشرے میں فساد کا باعث ہے، نہ کہ خیر کا۔ لہذا جیل کے تصور کو از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں عورتوں کی جیلیں الگ ہوتی تھیں، سول جرائم سے متعلقہ لوگوں کی جیلیں الگ ہوتی تھیں۔ سزائے موت پانے والوں کی جیلیں الگ تھیں۔

شریعت کی رو سے آج کے عدالتی نظام میں ہونے والی وکالت کا پیشہ بھی حرام ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اگر کسی نے خیانت یا جرم کیا کی ہے تو کوئی بھی وکیل اسکا دفاع نہ کرے۔ خواہ اس شخص نے مذہب کے نام پر خیانت کی ہو یا سیاست کے نام پر۔ یہ تصور ہی شریعت کے خلاف ہے کہ وکیل پیسے لے کر کسی بھی چور، ڈکیت، قاتل، اغواء کار، خیانت کار اور رشوت خور کو معافی دلوا دے یا بے گناہ ثابت کر دے۔ اگر عدالتی نظام میں سے وکیلوں کا وجود خارج کر دیا جائے تو ۹۹ فیصد عدالتی مسائل بہت جلد حل ہو جائیں گے۔ موجودہ نظام میں صحافت اور سود خوری کے ساتھ ساتھ سب سے ظالمانہ پیشہ ہی وکالت کا ہے۔ ہمارا یہ نظام انگریز کا بنایا ہوا ہے جو انہوں نے ایک قوم کو غلام بنائے رکھنے کیلئے بنایا تھا۔

بعض اوقات ہمیں مضبوط طاقت کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ سختی سے ان اقدامات پر عملدرآمد کروائے کیونکہ لوگ خود اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کرنا چاہ رہے۔ نظام کی تبدیلی کے لیے کبھی تو نچلی سطح پر انقلاب برپا ہوتا ہے جیسا کہ فرانسیسی انقلاب میں ہوا تھا۔ لوگوں نے جب روٹی نہ ملنے کا گلہ کیا تو ملکہ نے کہا کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھالو۔ تب لوگوں نے اس ملکہ کی گردن کاٹ کر رکھ دی۔ عوام کی برداشت کی حد ختم ہو جائے تو وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ ہم حالات کو اس نہج تک نہیں پہنچانا چاہتے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ریاستی ادارے خود دخل دے کر ایک محبِّ وطن حکومت قائم کریں کہ جو لوگوں کو عدل و انصاف دے۔ ورنہ جو موجودہ حالات چل رہے ہیں ان میں نہ صرف اندرونی بغاوت بلکہ بیرونی جارحیت کا بھی شدید خطرہ ہے۔

خلافت راشدہ سے لیکر مغل دور حکومت تک یہی ہوتا رہا ہے کہ وکیل نہیں ہوتا تھا بلکہ مقدمہ براہ راست جج کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور وہ فوراً مقدمے کا فیصلہ کر دیتا تھا۔ ایسا دنیا میں آج بھی کئی جگہوں پر ہو رہا ہے۔ امریکہ میں Small Claims Courts ہوتی ہیں یعنی کہ اگر آپکا کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہے تو آپ وہاں چلے جائیں۔ وہاں فوراً ہی

مسئلہ حل کر دیا جاتا ہے۔ انہوں نے سارے اچھے نظام ہم سے لیے ہوئے ہیں جبکہ ہم وہ نظام اپنائے ہوئے ہیں کہ جو ایک نوآبادیاتی طاقت نے ہمیں غلام بنانے کیلئے تشکیل دیئے تھے۔ ہم ۱۸۶۰ء کی بنی ہوئی لاہور ہائیکورٹ میں آج اکیسویں صدی میں بھی وہی نظام چلا رہے ہیں۔ اگر یہ نظام تبدیل نہیں کیا گیا تو خطرہ ہے کہ پورے ملک میں خونی انقلاب برپا ہو جائیگا جیسا کہ سوات میں ہو چکا ہے۔

سوات ہمارے ہاتھ سے صرف اس لیے نکل گیا تھا اور ہمیں جنگ کر کے دوبارہ وہاں پر قبضہ حاصل کرنا پڑا کیونکہ وہاں کا عدالتی نظام تباہ ہو چکا تھا اور طالبان نے اس کے متوازی اپنا نجی عدالتی نظام قائم کر لیا تھا۔ اگر ریاست اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھائے تو متوازی نظام تشکیل ہی نہ پائیں اور بغاوتیں برپا نہ ہوں۔ وہ حالات جن کی وجہ سے سوات میں بغاوت برپا ہوئی، وہی حالات پورے ملک میں پنپ رہے ہیں۔ ہمیں سوات والے واقعے سے سبق سیکھنا چاہیے۔

بھارتی سپریم کورٹ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر بھارتی عدالتوں میں موجود زیرالتواء مقدموں کا فیصلہ کیا جائے تو اس میں انہیں ۳۲۰ سال لگ جائیں گے۔ ہمارا عدالتی نظام بھی اتنا ہی تباہ شدہ ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ جب تک اس کے سر پر تلوار نہ لٹک رہی ہو، وہ سیدھا نہیں ہوتا۔ ہماری قوم کی تو یہ خصوصیت ہے۔ جب تک سختی نہیں کی جائے گی، مثبت نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اور مقصد کیا ہے؟ لوگوں کو ایک مشق سے گزارنا ہے یا پھر انصاف کی فراہمی؟ اگر چند دنوں میں انصاف دیا جا سکتا ہے تو کئی سالوں کی تاخیر بے معنی ہے۔ اگر ایک شخص پکڑا گیا ہو اور وہ یہ اعتراف بھی کر لے کہ میں نے ۱۰۰ قتل کیے ہیں تو اس مقدمے کو پچاس سال تک التوا میں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ فوراً سزا سنا دی جانی چاہیے۔ اس حوالے سے قرآن کا یہ حکم ہے کہ یہ سزا بھی لوگوں کے سامنے دی جائے تا کہ لوگ عبرت پکڑیں اور ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر ہم نے ظلم کیا تو ہمارا بھی یہی حشر ہوگا۔ صبح فجر کے وقت کوٹ لکھپت جیل کی اندھیری کوٹھڑی میں پھانسی پر لٹکانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ظلم تو دنیا دیکھتی ہے مگر اسکی سزا اندھیرے کمرے میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا۔ وہ حکم دیتا ہے کہ مجرموں کو سر عام سزا دی جائے تا کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔ قتل و غارت، ڈکیتی اور فساد فی الارض کی تو سزا ہی انتہائی سخت ہے۔ ان لوگوں سے بے رحمانہ انداز میں نبٹا جانا چاہیے۔

ہم ایک بار پھر یہ بات کہیں گے کہ یہ سب کچھ قابل عمل ہے۔ خلافت راشدہ کا نظام ہی پاکستان کی منزل ہے اور اسی لیے ہم نے پاکستان بنایا تھا۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

۲۰

عبوری حکومت اور معاشی محاذ

تجاویز اور حکمت عملی

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مکمل اور جامع تبدیلی کیلئے حکومت وقت کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ کسی بھی قانون کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ اگر ہمیں حکومت وقت کو یہ بتانا پڑے کہ قوم کی فلاح و بہبود اسکی ذمہ داری ہے تو اسکا مطلب ہے کہ وہ حکومت اس منصب پر رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ اگر حکومت نا اہل لوگوں پر مشتمل ہو تو ہم خواہ پالیسیاں اور ان پر عمل درآمد کا طریقہ کار بتا بھی دیں، وہ اس پر عمل نہیں کریں گے۔ ایک مخلص حاکم کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسے رعایا کی فلاح اور ملکی دفاع کیلئے کیا کرنا ہے۔ ہم انہی امور پر بات کرینگے اور مجوزہ عبوری حکومت کو تجاویز دینگے۔ جو بھی حکومت ان پر عمل کریگی وہ پاکستان کی ترقی کی ضامن ہوگی اور جو حکومت ان پر عمل نہیں کرے گی، وہ خائن ہوگی۔

اس وقت پاکستان کی مثال ایک ایسے گھرانے کی سی ہے کہ جس میں باپ اور بچے رہتے ہوں۔ گھر کے صحن میں خزانے دفن ہوں اور انہیں معلوم بھی ہو کہ وہاں خزانے ہیں۔ اسکے باوجود باپ کا یہ حال ہو کہ وہ اپنے

خزانے نکالنے کے بجائے ہمسایوں سے قرض لے اور پھر اس قرض کی ادائیگی کے لیے اپنے بچوں کی جیبیں کاٹے، بچوں کو بھوکا مارے اور ان بچوں سے پیسے لے کر سود کی ادائیگی کرے۔ ایسے باپ کو آپ کیا کہیں گے؟ وہ اپنے بچوں کا خائن ہے اور اپنے آپ سے بھی خیانت کر رہا ہے۔ وہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا مجرم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کو بھی اپنے ہی ہاتھوں برباد کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پاکستان کی بھی تقریباً یہی صورتحال ہے۔ اللہ کی قسم! ہمارے پاس کسی ایسی چیز کی کمی نہیں ہے کہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوسکیں اور اپنا ایک آزاد اقتصادی نظام قائم نہ کرسکیں۔

یہ ایک ایسا دور ہے کہ تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ تاریخ اسلام میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوری دنیا نقلی کاغذی کرنسی کے نظام پر قائم ہوگئی ہو جو کہ صیہونی معیشت اور بینکاری کا نظام کنٹرول کر رہا ہو۔ یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ امت مسلمہ کی تمام دولت یہودیوں اور صیہونیوں کے ہاتھوں میں ہو۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ خلافت عثمانیہ اسلامی ہو اور اسکے سارے خزانے یورپ کی عیسائی قوتوں کے ہاتھ میں ہوں یا مغل حکومت قائم ہو اور سارے خزانے انہوں نے دنیا کی کسی اور طاقت کے حوالے کر دیئے ہوں۔ ہمیشہ وہ ممالک، خلافتیں اور حکومتیں اپنے خزانے اپنے پاس رکھتی تھیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کا ہر انسان مقروض ہو۔

ہمیں ان فتنوں کے حوالے سے ماضی سے بہت زیادہ فتوے، راہنمائی یا ہدایات نہیں ملیں گی۔ ہمیں قرآن و سنت کی حکمت اور روح کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لیے خود راستے تلاش کرنے ہونگے۔ ہمیں اس راستے پر چلنا ہے کہ جس کی سمت کا تعین اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے کر دیا ہے۔ امت مسلمہ آج معاشی طور پر بہت زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ جو دولت ہماری ہے وہ بھی یہودیوں کے ہاتھ میں ہے یعنی تمام مسلمان ممالک کے زرمبادلہ کے ذخائر یا تو ڈالر میں ہیں یا یورو میں، اور یہودی مالیاتی نظام میں رکھے ہوئے ہیں۔

موجودہ نظام معیشت راتوں رات وجود میں نہیں آیا۔ اسے قائم ہونے میں کم از کم ڈیڑھ سو سال لگے۔ معاشی نظام کسی بھی معاشرے کی سوچ اور تہذیب بھی بدل سکتا ہے۔ جب ہم ایک ایسے معاشی نظام کی

تبدیلی کی بات کرتے ہیں کہ جس کی بنیاد ظلم، زیادتی اور استحصال پر ہو تو ایسے نظام کو معاشرے کی رگ رگ اور جڑ سے اکھاڑنا پڑتا ہے۔ ایسا نظام جو کہ دوسروں کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی ترغیب دیتا ہو، آپس کے تعلقات خراب کر کے نفرتیں پیدا کرنے کا باعث بنتا ہو، ہم نے ایسے نظام سے پیدا شدہ نقصان کا بھی ازالہ کرنا ہے اور پورے معاشرے کی از سر نو تشکیل کر کے اسے ایک اچھا اخلاقی اور روحانی انسانی معاشرہ بنانا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں ایک شیطانی معاشرہ قائم کر دیا گیا ہے۔ مسئلہ صرف معاشی پالیسیاں تبدیل کرنے کا نہیں بلکہ پہلے ہمیں اصل مسئلے کو سمجھنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آج دنیا میں قائم تمام نظام اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے حالت جنگ میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے رباء اور سود کے نظام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ ''اللہ نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، تم نے کب سے ان کو غلام بنالیا۔'' معاشی طور پر غلام بنانے کا عمل شروع ہی قرض لینے سے ہوتا ہے۔

جو لوگ رباء اور سود کے نظام سے بچنے کی کوشش کریں، ان کو غلام بنانے کیلئے وہ ٹیکسوں کا نظام یعنی انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ کفر کے نظام کو قائم رکھنے کیلئے رباء کیساتھ ساتھ یہ ظالمانہ ٹیکس بھی بنیادی ستون ہیں۔

آجکل کسی بھی حکومت کی آمدنی کے دو ذرائع ہوتے ہیں۔ بلاواسطہ اور بلواسطہ ٹیکس۔ بلواسطہ ٹیکس وہ ہوتا ہے کہ آپکو تنخواہ ملنے سے پہلے ہی آپکی تنخواہ میں سے ٹیکس کٹ جاتا ہے۔ آپ حکومت کے ملازم ہوں یا پرائیویٹ کمپنی کے، آپ کو ٹیکس کی کٹوتی کے بعد تنخواہ دی جاتی ہے اور ٹیکس حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔ دوسرا بلاواسطہ ٹیکس ہے۔ جو ان اشیاء پر لگایا جاتا ہے کہ جو ہم خریدتے ہیں۔ چاہے وہ خورد و نوش کا سامان ہو یا گاڑی میں ڈلنے والا پٹرول۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مستحق بے چارہ غریب مزدور صبح و شام محنت مزدوری کرنے کے باوجود جب اپنے بچوں کیلئے روٹی بھی خریدتا ہے تو اس پر بھی حکومت کو ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ ظالمانہ نظام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جبکہ دوسری طرف حکمران طبقہ خیانت، بدکاری اور عیاشی میں لت پت ہوتا ہے۔

آمدن اور خریداری پر ٹیکس، شریعت کی رو سے ایک ناجائز اور حرام تصور ہے۔ سعودی عرب میں عوام پر ٹیکس

نہیں لگایا جاتا کیونکہ سعودی حکومت اپنی تمام تر آمدنی تیل سے حاصل کرتی ہے یعنی قدرتی وسائل کو بروئے کار لاتی ہے۔ پاکستان میں بھی اللہ کے فضل سے اتنے قدرتی ذخائر موجود ہیں کہ اگر ہم انہیں استعمال کریں تو ہمیں بھی اپنی قوم پر ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

بلوچستان میں وافر مقدار میں سونا، تیل اور دوسرے قدرتی وسائل موجود ہیں۔ تخمینوں کے مطابق کم از کم کئی سوارب ڈالر کا سونا اور پیتل وہاں موجود ہے کہ جسے نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ پاکستان کوئلہ درآمد کر رہا ہے جبکہ یہاں دنیا کے کوئلے کے سب سے بڑے ذخائر موجود ہیں لیکن ساٹھ سال سے ان کو کام میں نہیں لایا گیا۔ ان کی قیمت ۵۰۰ ارب ڈالر سے لیکر ایک کھرب ڈالر تک ہے۔ پاکستان تقریباً ۶۵ ارب ڈالر کا مقروض ہے جبکہ ہمارے پاس سینکڑوں ارب ڈالر کے سونے اور تیل کے ذخائر اور تقریباً ایک کھرب ڈالر کے کوئلے کے ذخائر موجود ہیں۔ آج تک ہمارے جتنے بھی وزرائے خزانہ آئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ''علیم'' اور ''حفیظ'' کے درجے پر پورا نہیں اترتا تھا۔

ہمارے ملک میں اصل تزویراتی ذخائر معدنیات پر مشتمل ہیں مثلاً تیل، گیس، کوئلہ، سونا، چاندی وغیرہ لیکن ان کا صحیح طرح سے استعمال کرنے کیلئے صنعتیں نہیں لگائی گئیں۔ پاور پلانٹ ایسے لگائے گئے ہیں جو فرنس آئل، ڈیزل اور پٹرول پر چلتے ہیں۔ لہذا ہم مجبور ہیں کہ باہر سے تیل درآمد کریں۔ جہاں تک وسائل کی بات ہے تو اللہ کے فضل سے ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ ہماری سات نسلوں کیلئے کافی ہیں۔ جہاں تک غلے کی پیداوار کا تعلق ہے، پاکستان کا نہری نظام، روس کے نہری نظام سے پانچ گنا بڑا ہے۔ حالانکہ پاکستان روس سے کئی گنا چھوٹا ملک ہے۔ دنیا میں غلے، پھل اور سبزیوں کی اقسام کے حوالے سے پاکستان کا شمار دنیا کے پہلے پانچ ممالک میں ہوتا ہے۔ اسکے باوجود لوگ بھوک سے خودکشی کرتے پھر رہے ہیں۔ اسے حکمرانوں کی نااہلی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

تیسرا طریقہ وہ ہے کہ جسے انگریزی میں Money saved is Money Earned کہا جاتا ہے یعنی آپ کی بچت بھی آپکی آمدنی ہے۔ حکومت وقت جو عیاشیاں، خیانتیں اور فضول خرچیاں کرتی ہے، اگر انکو کنٹرول کرلیا جائے تو بھی اربوں، کھربوں کی بچت ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ

ایک ایم این اے کا خرچ کروڑوں روپے بنتا ہے۔ کروڑوں روپے ان کی تنخواہوں پر خرچ ہوتے ہیں۔اگر وہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ اپنے خرچے کم کرلیں تو ملک پر اربوں روپے کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔آپ کو ایران کے صدر کی مثال دیتے چلیں کہ وہ ابھی بھی 1977ء کی پرانی گاڑی استعمال کرتا ہے اور اپنے باپ کے 60 سالہ پرانے گھر میں رہتا ہے۔کیوبا کا صدر فیڈل کاسترو بھی اپنی قوم کا ساتھ دیتا ہے۔اسی لیے 50 سال سے حکومت کررہا ہے اور قوم اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ بھی تو ایک حکمران تھے کہ جو امانت کا اس قدر اہتمام کیا کرتے تھے کہ ایک پیسے کی خیانت بھی ممکن نہ تھی۔قائداعظمؒ بھی بیت المال سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے اور اپنی جیب سے حکومت پاکستان کو کروڑوں روپے کا ہدیہ دیتے رہے۔جب حکمران مال کو امانت سمجھ کر خرچ کرتا ہے تو پوری قوم میں خودبخود امانت و دیانت کا تصور بیدار ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

سورۃ قریش میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو وہ نعمتیں یاد کروائیں ہیں کہ جو اللہ نے ان کو عطا کی تھیں۔ان سب نعمتوں کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ اللہ نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا یعنی اللہ نے ان کی معیشت کو بہتر کیا اور امن عامہ کی صورتحال کو بہتر بنایا۔اگر موجودہ دور کی بات کریں تو یہ کسی بھی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ بھوک میں لوگوں کو کھانا کھلائے اور ملک میں امن و امان قائم کرے۔

اللہ کے فضل سے حکومت کے پاس وسائل،اختیار اور طاقت سب کچھ ہے۔لہذا اسے یہ ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ قائداعظم نے بھی اپنی پہلی تقریر میں پہلا نقطہ یہی بیان کیا ہے کہ

امن عامہ کی درستگی حکومت وقت کی اولین ذمہ داری ہے۔ کیونکہ جس ملک میں فتنے، فساد اور ہنگامے برپا ہوں، وہاں نہ تو کوئی نظام قائم ہوسکتا ہے اور نہ ہی معیشت درست ہوسکتی ہے۔ اس وقت ملک میں مسائل کی جڑ رشوت اور کرپشن (خیانت) ہے۔ ہمارا سب سے بڑا بحران، اخلاقی بدحالی ہے۔ ملک میں ایسی ایماندار قیادت ہی نہیں ہے کہ جسے حکومت دی جاسکے یا اگر اسے مسلمانوں کے بیت المال کی ذمہ داری دی جائے تو وہ خیانت نہ کرے۔

اس ضمن میں قائداعظم کے پہلے چار نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ قائداعظم نے کالے دھندے اور ذخیرہ اندوزی سے بچنے کی بات کی۔ آج ملک میں خوراک کی کمی ہے کیونکہ ذخیرہ اندوزی کیساتھ ساتھ سمگلنگ بھی عروج پر ہے۔ جسکی وجہ سے مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ چوتھا مسئلہ اقربا پروری کا ہے۔ جب میرٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے رشتہ داروں، قبیلے والوں، اپنے گاؤں والوں، وفاداروں اور جیالوں کو نوکریاں دی جائیں اور انکو ایسے عہدوں پر فائز کردیا جائے کہ جن کے وہ اہل نہ ہوں تو عوام میں مایوسی جنم لیتی ہے اور ملکی خزانے میں خیانت ہوتی ہے۔ شریعت اور سنت میں بدترین حکمرانوں کی یہ خصوصیات بتائی گئی ہیں کہ وہ بیت المال کے پیسے کو اپنے ذاتی مال کی طرح خرچ کرتے ہیں، اقربا پروری اور سفارش کرتے ہیں اور فلاح عامہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے۔

اسلامی اقتصادی نظام کی بات کی جائے تو اس میں رباء جائز نہیں ہے کیونکہ رباء ایک ایسا عمل ہے کہ جسکے خلاف اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے اعلانِ جنگ کیا ہوا ہے۔ پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت اور وفاقی شرعی عدالت نے حکومتِ وقت کو احکامات جاری کرر کھے ہیں کہ رباء کے نظام کو ختم کیا جائے۔ مگر ایک طرف تو سپریم کورٹ اپنے فیصلے پر عملدرآمد نہیں کراتی اور دوسری طرف کسی کو معلوم بھی نہیں ہے کہ یہ نظام کیسے تبدیل کرنا ہے؟ اور پھر یہ لوگ اس نظام کو تبدیل بھی نہیں کرنا چاہتے۔ آج حالت یہ ہے کہ پاکستان کا تمام تر معاشی نظام رباء پر قائم ہے۔ سٹیٹ بینک ہو یا پرائیویٹ بینک، کسی کی کرنسی کی پشت پر سونا نہیں ہے۔ ساری جعلی کاغذی کرنسی ہے۔ فریکشنل ریزرو بینکنگ (Fractional Reserve Banking) کی وجہ سے افراط زر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کا واحد حل یہی ہے کہ ہم دوبارہ اصل زر،یعنی سونے اور چاندی پر مبنی معاشی نظام کی طرف لوٹیں۔ پاکستان کو اپنے زر مبادلہ کے ذخائر ڈالروں میں رکھنے کے بجائے سونے میں رکھنے چاہئیں۔آجکل اکثر مسلمان ملکوں کے ڈالروں کے ذخائر یہودی بینکوں میں رکھے ہوئے ہیں جبکہ سونا ملک اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے۔آج دنیا کی تمام بڑی طاقتیں سونا جمع کررہی ہیں کیونکہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام تباہی کی طرف جارہا ہے اور یہ واضح نظر آرہا ہے کہ آنے والے وقتوں میں تمام کاغذی کرنسی ردی ہوجائے گی۔وہ تمام ممالک کہ جنہوں نے اپنے زرمبادلہ کے ذخائر کاغذی کرنسی میں رکھے ہوئے ہیں وہ بغیر جنگ کے ہی تباہ ہوجائیں گے۔

بین الاقوامی سطح پر مسلمان ریاستیں دوسرے مسلم ملکوں کیساتھ مل کر یا پھر ان غیر مسلم ریاستوں کیساتھ مل کر کام کریں کہ جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کام کرنا چاہتے ہوں۔دیگر ممالک مثلاً کیوبا اور وینزویلا وغیرہ بھی اس جنگ میں مسلمانوں کے حلیف ہوسکتے ہیں۔

بہت سے اسلامی مالیاتی ادارے اسلامی معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ ابھی ان کو اسلامی بینک کہا جاسکتا ہے، کیونکہ کرنٹ اکاؤنٹ کو سود اور رباء سے پاک ہونے کے باوجود بھی اسلامی اکاؤنٹ نہیں کہا جاسکتا۔موجودہ معاشی نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے اسلامی مالیاتی ادارے بھی پیپر کرنسی استعمال کرتے ہیں۔کئی ''اسلامی بینک'' ایسے ہیں کہ جو سود اور رباء سے آلودہ بینکوں میں اپنا پیسہ رکھ کر سود بھی لیتے ہیں اور پھر اسلامی بینک ہونے کا دعویٰ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اکاؤنٹ ہولڈرز کے پیسے اس کاروبار میں لگاتے ہیں کہ جو حرام نہ ہو، مثلاً پراپرٹی وغیرہ۔ایسے نظام کو اسلامی معاشی نظام کہہ دینا اور اس پر مطمئن ہوجانا کہ ہم نے اسلامی معاشی نظام بنادیا ہے، ایک خود فریبی اور نعوذ باللہ، اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش ہے۔

موجودہ بحران ایسا ہے کہ جسکی مثال مسلمانوں کی چودہ سوسالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔مسلمان فلسفیوں اور علماء کو ان فتنوں کو سمجھنا چاہیے۔مسلمان مفکرین اور ذرائع ابلاغ وغیرہ کو ان پر بات کرنی چاہیے۔یہاں پر بہت بڑے بڑے مسلم دانشور اور علماء غلطی کررہے ہیں کیونکہ وہ فریکشنل ریزرو بینکنگ کے نظام کو سمجھتے ہی نہیں۔

اس نظام کے تحت تمام بینکاری سود پر مبنی ہوتی ہے۔ اس طریقے کو اسلامی طریقہ نہیں کہا جا سکتا۔ محض دل بہلانے کو ''اسلامی بینک'' کی اصطلاح ایجاد کر لی گئی ہے۔

بہت سے کام ایسے ہیں کہ جو انسان انفرادی سطح پر کر سکتا ہے مگر کچھ اقدامات صرف حکومت ہی کر سکتی ہے۔ کفر کا پورا نظام حکومتیں ہی رائج کرتی ہیں اور ایک مسلمان حکومت ہی اس نظام کو تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ انفرادی یا اجتماعی سطح پر مسلمان کچھ ادارے تو بنا سکتے ہیں مگر پورے نظام کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس کیلئے ریاستی طاقت کا ہونا لازم ہے۔

اسی لیے یہاں دی گئی تجاویز حکومتی سطح کی ہیں۔ گو کہ اسلامی معاشی نظام انفرادی اور معاشرتی سطح پر بھی بہت سے امور کی تلقین کرتا ہے کہ جن سے معاشرے میں کسی حد تک معاشی مساوات اور خوشحالی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف کی کتاب ''معاشی دہشت گردی'' سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

۲۱

حرف آخر اور نوشتہء تقدیر!

ہمارے اسلاف نے اس ملت کی شیرازہ بندی لاکھوں جانوں اور عزت و آبرو کی قربانی دے کر کی ہے۔ایک مقدس سرزمین کیلئے یہ عظیم انسانی قربانیاں درحقیقت اس رومانوی وآفاقی تصور کیلئے تھیں کہ جس کی بنیاد خلافت راشدہ ہے۔

اپنے اسلاف کے ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اب ہمارے کندھوں پر ہے۔اگر ہم اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے تو روزِ محشر ایک سخت ترین احتساب اور اس دنیا میں ایک المناک انجام ہمارا مقدر ہوگا۔اس ارض پاک کا قیام انگریز کے قوانین،مغرب کی لادین جمہوریت اور سود ورباء پر مبنی بینکاری کیلئے عمل میں نہیں لایا گیا تھا۔

ہم اپنے نصیب کا انتخاب کر چکے ہیں۔مشیت ایزدی کے مطابق، تکمیل پاکستان کیلئے ایک پروقار زندگی یا اس مقصد کے حصول کے دوران یا بعد،ایک باعزت موت! چاہے پوری دنیا بھی ہماری مخالف ہوجائے، وقت کے کفر،اور اس کی دجالی اور طاغوتی قوتوں کے خلاف ہمارا اعلان جنگ ہے۔

جب ہم خلافت راشدہ کے نظام کی بات کرتے ہیں تو کئی نادان بیوقوفانہ سوالات پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔مثلاً خلیفہ کون ہوگا؟ وہ کس فقہ کو نافذ کرے گا؟ ایک کم علم جاہل یا پھر ایک دشمن ہی ایسے سوالات پوچھ

سکتا ہے۔

جب ہم خلافت راشدہ کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد قرآن وسنت کے حدود و قیود اور شریعت کا نفاذ ہے۔اس سے مزید مراد ایک اخلاقی اور روحانی معاشرے کا قیام ہے۔ یہ شخصیت اور افراد سے آزاد نظام ہے۔ کیونکہ اس میں حکمران فقط اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے کہ جسکے ذمے قرآن کے پہلے سے متعین شدہ قوانین کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی اچھا مسلمان یہ کر سکتا ہے کہ جو باعلم اور مخلص ہو، چاہے وہ ایک نکٹا سیاہ فام غلام ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نظام فقہی اور مسلکی تقسیم سے بھی بالاتر ہے۔کوئی بھی فقہ یا فرقہ نہ تو انگریز کے قانون،سود رباء پر مبنی بینکاری،آوارہ ذرائع ابلاغ یا لادین جمہوریت کی حمایت کرتا ہے اور نہ ہی اتحاد بین المسلمین قائم کرنے یا مشرکین کے خلاف جہاد کی مخالفت کرتا ہے۔

لہذا جس کسی کو بھی اس آفاقی نظام سے مسئلہ ہے،اس سے ہم کہیں گے کہ یا تو اس مشن کا حصہ بن جائے یا پھر خاموشی اختیار کرے۔خود کو اندھا، گونگا اور بہرہ ثابت نہ کریں۔ اللہ ایسے افراد کو اپنے عتاب کا نشانہ بناتا ہے اور خیر کی طرف انکی رہنمائی نہیں کرتا۔ لہذا اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے ،توبہ کیجیئے اور اللہ سے ہدایت اور ہمت طلب کریں اور اللہ کی منشاء کے مطابق آنے والی تقدیر کا حصہ بنیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔خلافت راشدہ کا نظام یا پھر شہادت! اس کے علاوہ ہماری کوئی اور منزل اور تقدیر نہیں ہے۔(ان شاءاللہ)

یہ اللہ کا وعدہ ہے مومنین سے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِىْ لَا يُشْرِكُونَ بِىْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُون(النور،۵۵)

ترجمہ: ''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے،اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اُن کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی گئی تھی اور اُن کے دین کو، جسے اُس

نے ان کیلئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں۔"

بے شک اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے سچ فرمایا ہے!

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگاہ زلزلہء عالمِ افکار

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ

۲۲

قرارداد تکمیل پاکستان

پاکستان کے نوجوانوں نے راقم کی قیادت میں ۲۳ مارچ ۲۰۱۰ء کو لاہور میں جمع ہو کر تکمیل پاکستان کے عہد کی تجدید کی اور یہ قرارداد پاس کی گئی کہ جس کی بنیاد پر آنے والے وقتوں میں پاکستان اور امت مسلمہ کی تعمیر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

۱۔ تمام فرمانروائی کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور پاکستانی عوام کے ذریعے پاکستان کی ریاست کو دیئے گئے تمام اختیارات کو اللہ کی قائم کی گئی حدود میں رکھنا ایک عظیم امانت اور ذمہ داری ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پاکستان کو اب خلافت راشدہ کے مقدس طریق پر دوبارہ قائم کیا جائے اور ان اصولوں کے تحت اس کی سیاسی، اقتصادی، عدالتی، سماجی اور فوجی تشکیل کی جائے۔ پاکستان میں نہ مغربی جمہوریت ہوگی نہ آمریت، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں خلافت راشدہ کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ اس سرزمین کے تمام ادارے، تمام اطوار صرف قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے مطابق ہونگے۔

۲۔ پاکستان کی ریاست پاکستان کی عوام کے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے اپنی طاقت کو استعمال کرسکتی ہے جو لوگ پاکستانی عوام کی نمائندگی کے اہل قرار دیئے جائیں ان کا کردار اور اخلاق قرآن وسنت کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترتا ہو۔ ان نمائندگان کا چناؤ سیاسی جماعتوں کے بجائے

ان اصولوں اور طریقوں پر جس کی مثال ہمیں خلافت راشدہ میں ملتی ہے۔

۳۔ ایک ایسی ریاست جس میں اسلام کے دیئے گئے جمہوری اصول، آزادی، مساوات، فاہمی محبت اور بھائی چارہ، برداشت اور تحمل اور سماجی انصاف کے اصولوں پر اسی طرح عمل ہو جیسا کہ خلافت راشدہ میں کیا گیا۔

۴۔ ایک ایسی جس میں تمام مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن وسنت کے دیئے گئے اصولوں پر زندگی گزار سکیں۔ سود اور رباء کے کاغذی معاشی نظام کو ختم کر کے معیشت کی بنیاد سونے اور چاندی پر ڈالی جائے جیسا کہ قرآن وسنت میں بتایا گیا ہے اور جس کی مثال ہمیں خلافت راشدہ میں ملتی ہے۔

۵۔ ایک ایسی ریاست جس میں مذہبی اقلیتیں اپنے تمام مذہبی امور انجام دے سکیں۔ خلافت راشدہ میں رائج کیے گئے قوانین کے مطابق ان کی جان و مال کی اور عزت کی حفاظت کی جائے۔

۶۔ جو بھی علاقے پاکستان سے منسلک ہیں یا آئندہ مستقبل میں منسلک ہوں وہ مل کر ایک مضبوط وفاق قائم کریں، ایک مضبوط ترین مسلمان ملک کی حیثیت سے پاکستان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے ساتھ نظریاتی، اقتصادی، سیاسی اور فوجی بلاک کو نہ صرف تشکیل دے بلکہ اس کی قیادت بھی کرے۔

۷۔ پاکستان کی قیادت میں ایک مشترکہ مسلم دفاعی بلاک اپنی حدود میں تمام اختیارات کا حامل ہوگا اور ان حدود کے اندر اپنی طاقت اور اختیارات کو استعمال کر سکے گا۔

۸۔ ایک ایسی ریاست کا قیام جس میں انسان کو بنیادی حقوق حاصل ہوں مواقع کے لحاظ سے قانونی، معاشی اور سیاسی عدل کے لحاظ سے، آزادیء افکار، اظہار، عبادت، وابستگی جو معاشرتی ادوار اور قانون کے مطابق ہوں۔ عدل وانصاف کی آسان اور مفت فراہمی بغیر کسی ڈر، خوف یا جانبداری کے ہو۔ ان شاء اللہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگا جیسا کہ خلافت راشدہ تھی۔

۹۔ خلافت راشدہ کے طرز پر مذہبی اقلیتوں اور معاشرے کے پس ماندہ اور مظلوم طبقات کے جائز مفادات کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

۱۰۔ عدلیہ مکمل طور پر آزادی ہوگی اور نظام عدل کو خلافت راشدہ کی طرز پر تبدیل کیا جائے گا۔ مفت، غیر جانبدارانہ اور فوری انصاف فراہم کیا جائے گا۔

۱۱۔ پاکستانیوں کو بین الاقوامی امن، ترقی اور بنی نوع انسان کی خوشحالی کی جدوجہد میں ایک بہت اہم کردار ادا کرنا ہوگا اور اپنے آپ کو ایک قابل عزت مقام پر لانا ہوگا تا کہ مسلم امت کی جو قیادت ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے اس کو استعمال میں لاتے ہوئے ہم تمام مسلم امت کو ایک نظریاتی پرچم کے نیچے یکجا کر سکیں۔

۱۲۔ پاکستان کی عزت و آبرو اور اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ہر قیمت پر کی جائیگی۔ چاہے وہ زمین پر ہو، ہواؤں میں یا پانیوں میں۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی، قومی دفاعی پالیسی اور فوجی حکمت عملی کا مقصد دنیا میں ایک غیرت مندانہ اور پرامن طریقے سے پاکستان، مسلم امت اور دوست مما لک کی حفاظت کرنا ہے۔

۳۲

اعلانِ قائداعظمؒ

قائداعظمؒ نے مولانا ظفر علی خانؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ کی موجودگی میں مندرجہ ذیل بیان دیا تھا جو ماہنامہ ''منارہ'' کراچی میں شائع ہوا۔ جسے روزنامہ ندائے ملت، لاہور نے اپنی ۱۵ اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں نقل کیا۔

''میں لندن میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر انڈیا اس لیے آیا ہوں کہ یہاں لا الٰہ الا اللہ کی مملکت یعنی پاکستان کے قیام کے لیے کوشش کروں گا۔ اگر میں لندن میں رہ کر سرمایہ داری کی حمایت کرنا پسند کرتا تو سلطنتِ برطانیہ جو دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی، مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب اور مراعات سے نوازتی۔ اگر میں روس چلا جاؤں یا کہیں بیٹھ کر سوشلزم، مارکسزم یا کمیونزم کی حمایت شروع کردوں تو مجھے بڑے سے بڑا اعزاز بھی مل سکتا ہے اور دولت بھی۔ مگر علامہ اقبالؒ کی دعوت پر میں نے دولت اور منصب دونوں کو تج کے انڈیا میں محدود آمدنی کی دشوار زندگی بسر کرنا پسند کیا ہے تاکہ پاکستان وجود میں آئے اور اس میں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو کیونکہ دنیا کی نجات اسلامی نظام ہی میں ہے صرف اسلام ہی کے ملی، عملی اور قانونی دائروں میں آپ کو عدل، مساوات، اخوت، محبت، سکون اور امن دستیاب

ہوسکتا ہے۔ برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے سارے بڑے بڑے سیاستدان مساوات کا راگ الاپتے ہیں۔ روس کا نعرہ بھی مساوات اور ہر مزدور اور کاشت کار کے لیے روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کے لیے جگہ مہیا کرنا ہے۔ مگر یورپ کے بڑے بڑے سیاستدان عیش و عشرت کی جو زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ وہاں کے غریبوں کو نصیب نہیں۔ محمد علی جناح کا لباس اتنا قیمتی نہیں جتنا قیمتی لباس یورپ کے بڑے بڑے لوگ اور روس کے لیڈر زیب تن کرتے ہیں۔ نہ محمد علی جناح کی خوراک اتنی اعلیٰ ہے۔ جتنی سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈروں اور یورپ کے سرمایہ داروں کی ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ اور خلفائے راشدینؓ نے سارا اختیار ہوتے ہوئے خود غریبانہ زندگی بسر کی مگر رعایا کو خوش اور خوش حال رکھا۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ انڈین کانگرس حکومت بنانے کے بعد برطانوی ٹھگوں کو تو یہاں سے نکال دے گی مگر پھر ٹھگ خود بن جائے گی۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں ہی کی آزادی ختم نہیں کریں گے بلکہ اپنے لوگوں کی آزادی بھی ختم کر دیں گے۔ اس لیے ہم سب کو پاکستان کے قیام کے لیے زبردست کوشش کرنی چاہیے۔ ذرا خیال فرمایئے کہ اگر لا الـٰـه الا اللـّٰـه پر مبنی حکومت قائم ہو جائے تو افغانستان، ایران، ترکی، اردن، بحرین، کویت، حجاز، عراق، فلسطین، شام، ٹیونس، مراکش، الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان بلاک بن سکتا ہے۔

اقبالؒ کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان نہیں ہوسکتا خواہ وہ پیر مولانا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ سوشلزم اور کمیونزم کے سارے بانی یہودی تھے۔ آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ سوشلزم اور کمیونزم مسلمانوں کے لیے ایسا زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہودی، انگریز، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سکھ سب مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں''۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
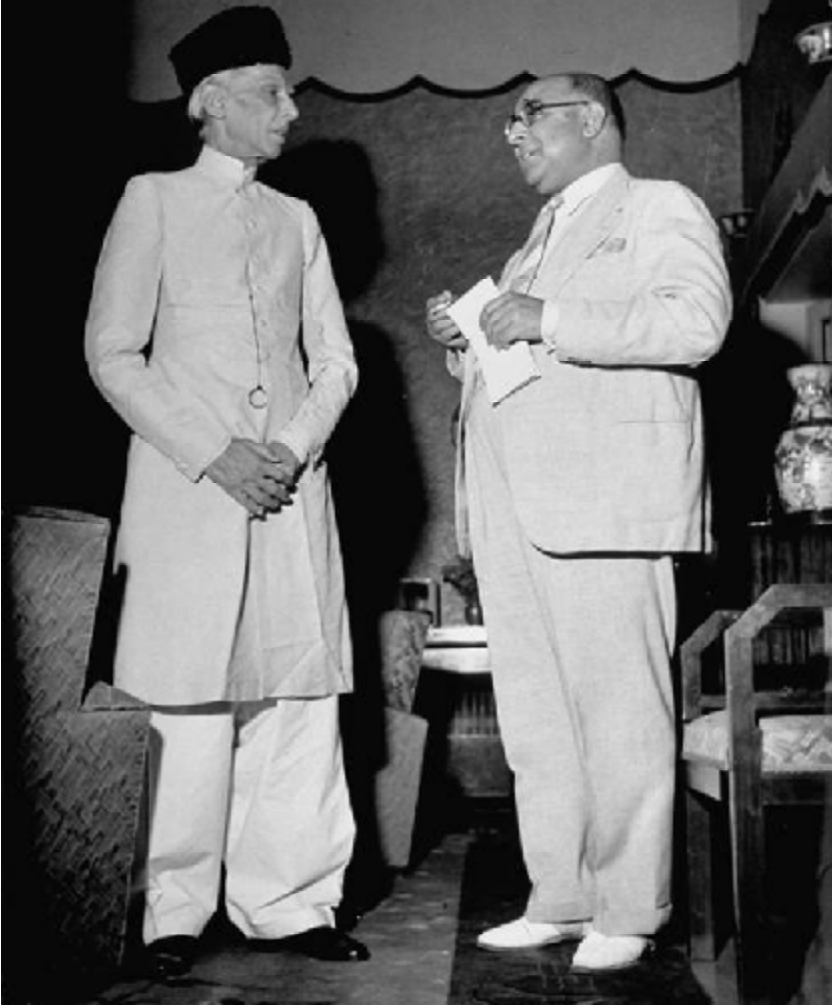
امت مسلمہ کے دو عظیم قائد

امین راز ہے مردانِ حر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی

its noble ideals, and Destiny itself will lead it to its place of glory in the affairs of the world, and make it immortal in the annals of humanity. Sir, this people has traditions of great achievement to its credit; its history is replete with deeds of glory; in every sphere of life it has contributed its full measure of achievement; its heroism adorns the pages of military chronicles; its administrators created traditions which have withstood the ravages of time; in creative art, its poverty, architecture and sense of beauty have won their tribute of appreciation; in the matter of spiritual greatness it has few parallels. It is this people which is again on the march, and, given the necessary opportunities, it will surpass its previous record of glorious achievement. This Objectives Resolution is the first step in the direction of the creation of an environment which will again awaken the spirit of the nation. We, whom Destiny has chosen to play a part, howsoever humble and insignificant, in this great drama of national resurrection, are overwhelmed with the magnitude of the opportunities which are before us. Let us use these opportunities with wisdom and foresight, and I have not the least doubt that these humble efforts will bear fruit far in excess of our wildest expectations, through the help of a Providence which has brought Pakistan into existence. It is not every day that great nations come into their own; it is not every day that peoples stand on the threshold of renaissance; it is not every day that Destiny beckons the down-trodden and the subjugated to rise and greet the dawn of a great future. It is the narrow streak of light heralding the brilliance of the full day, that we salute in the form of this Resolution.

base our polity upon freedom, progress and social justice. We want to do away with social distinctions, but we want to achieve this without causing suffering or putting fetters upon the human mind and lawful inclinations.

Sir, there are a large number of interests for which the minorities legitimately desire protection. This protection the Resolution seeks to provide. The backward and depressed classes are our special charge. We are fully conscious of the fact that they do not find themselves in their present plight for any fault of their own. It is also true that we are not responsible by any means for their present position. But now that they are our citizens, it will be our special effort to bring them up to the level of other citizens, so that they may bear the responsibilities imposed by their being citizens of a free and progressive State, and share them with others who have been more fortunate than themselves. We know that so long as any sections amongst our people are backward, they will be a drag upon society and, therefore, for the purpose of building up our State we must necessarily took to the interests of these sections.

Mr. President, in the end we firmly believe that by laying the foundations of our constitution on the principles enunciated in this Resolution, we shall be able to put Pakistan on the path of progress, and the day is not far distant when Pakistan will become a country of which its citizens, without distinction of class or creed, will be proud. I am confident that our people have great potentialities. Through their unparalleled sacrifices and commendable sense of discipline, displayed at the time of a grave disaster and crisis, they have earned the admiration of the world. Such a people, I am sure, not only deserves to live, but is destined to make a contribution to the welfare and progress of humanity. It is essential that it should keep alive its spirit of sacrifice, and its adherence to

sections of our population than exists today. For this purpose the Constituent Assembly will have to think a new as to what will be the best method for the distribution of subjects between the Centre and the units, and how the units should be defined in our new setup.

Mr. President, it has become fashionable to guarantee certain fundamental rights, but I assure you that it is not our intention to give these rights with one hand and take them away with the other. I have said enough to show that we want to build up a truly liberal Government where the greatest amount of freedom will be given to all its members. Everyone will be equal before the law, but this does not mean that his personal law will not be protected. We believe in the equality of status and justice. It is our firm belief and we have said this from many a platform that Pakistan does not stand for vested interests or the wealthy classes.

It is our intention to build up an economy on the basic principles of Islam which seeks a better distribution of wealth and the removal of want. Poverty and backwardness - all that stands in the way of the achievement of his fullest stature by man - must be eradicated from Pakistan. At present our masses are poor and illiterate. We must raise their standards of life, and free them from the shackles of poverty and ignorance. So far as political rights are concerned, everyone will have a voice in the determination of the policy pursued by the Government and in electing those who will run the State, so that they may do so in the interests of the people. We believe that no shackles can be put on thought and, therefore, we do not intend to hinder any person from the expression of his views. Nor do we intend to deprive anyone of his right of forming associations for all lawful and moral purposes. In short, we want to

In our desire to build up an Islamic society we have not ignored the rights of the non-Muslims. Indeed, it would have been un-Islamic to do so, and we would have been guilty of transgressing the dictates of our religion if we had tried to impinge upon the freedom of the minorities. In no way will they be hindered from professing or protecting their religion or developing their cultures. The history of the development of Islamic culture itself shows that cultures of the minorities, who lived under the protection of Muslim States and Empires contributed to the richness of the heritage which the Muslims built up for themselves. I assure the minorities that we are fully conscious of the fact that if the minorities are able to make a contribution to the sum total of human knowledge and thought, it will redound to the credit of Pakistan and will enrich the life of the nation. Therefore, the minorities may look forward, not only to a period of the fullest freedom, but also to an understanding and appreciation on the part of the majority which has always been such a marked characteristic of Muslims throughout history.

Sir, the Resolution envisages a federal form of government because such is the dictate of geography. It would be idle to think of a unitary form of Government when the two parts of our country are separated by more than a thousand miles. I, however, hope that the Constituent Assembly will make every effort to integrate the units closer and forge such ties as would make us a well-integrated nation. I have always advocated the suppression of provincial feelings, but I want to make it clear that I am not an advocate of dull uniformity. I believe that all the areas and units, which form Pakistan, should contribute to the richness of our national life. I do, however, want to make it clear that nothing should be permitted which, in any sense, tends to weaken national unity, and provision should be made for bringing about a closer relationship amongst the various

the teachings of Islam as embodied in the Quran and the Sunnah. There can be no Muslim who does not believe that the word of God and the life of the Prophet are the basic sources of his inspiration. In these there is no difference of opinion amongst the Muslims and there is no sect in Islam which does not believe in their validity. Therefore, there should be no misconception in the mind of any sect which may be in a minority in Pakistan about the intentions of the State. The State will seek to create an Islamic society free from dissensions, but this does not mean that it would curb the freedom of any section of the Muslims in the matter of their beliefs. No sect, whether the majority or a minority, will be permitted to dictate to the others and, in their own internal matters and sectional beliefs, all sects shall be given the fullest possible latitude and freedom. Actually we hope that the various sects will act in accordance with the desire of the Prophet who said that the differences of opinion amongst his followers are a blessing. It is for us to make our differences a source of strength to Islam and Pakistan, not to exploit them for narrow interests which will weaken both Pakistan and Islam.

Differences of opinion very often lead to cogent thinking and progress, but this happens only when they are not permitted to obscure our vision of the real goal, which is the service of Islam and the furtherance of its objects. It is, therefore, clear that this clause seeks to give the Muslims the opportunity that they have been seeking, throughout these long decades of decadence and subjection, of finding freedom to set up a polity, which may prove to be a laboratory for the purpose of demonstrating to the world that Islam is not only a progressive force in the world, but it also provides remedies for many of the ills from which humanity has been suffering.

Sunnah. It is quite obvious that no non-Muslim should have any objection if the Muslims are enabled to order their lives in accordance with the dictates of their religion. You would also notice, Sir, that the State is not to play the part of a neutral observer, wherein the Muslims may be merely free to profess and practice their religion, because such an attitude on the part of the State would be the very negation of the ideals which prompted the demand of Pakistan, and it is these ideals which should be the corner-stone of the State which we want to build. The State will create such conditions as are conductive to the building up of a truly Islamic society, which means that the State will have to play a positive part in this effort.

You would remember, Sir, that the Quaid-I-Azam and other leaders of the Muslim League always made unequivocal declarations that the Muslim demand for Pakistan was based upon the fact that the Muslims had a way of life and a code of conduct. They also reiterated the fact that Islam is not merely a relationship between the individual and his God, which should not, in any way, affect the working of the State. Indeed, Islam lays down specific directions for social behaviour, and seeks to guide society in its attitude towards the problems which confront it from day to day. Islam is not just a matter of private beliefs and conduct. It expects its followers to build up a society for the purpose of good life - as the Greeks would have called it, with this difference, that Islamic "good-life" is essentially based upon spiritual values. For the purpose of emphasizing these values and to give them validity, it will be necessary for the State to direct and guide the activities of the Muslims in such a manner as to bring about a new social order based upon the essential principles of Islam, including the principles of democracy, freedom, tolerance and social justice. These I mention merely by wayof illustration; because they do not exhaust

a haven for all who were persecuted and who fled from tyranny. It is a well-known fact of history that, when anti-Semitism turned the Jews out of many a European country, it was the Ottoman Empire which gave them shelter. The greatest proof of the tolerance of Muslim peoples lies in the fact that there is no Muslim country where strong minorities do not exist, and where they have not been able to preserve their religion and culture. Most of all, in this sub-continent of India, where the Muslims wielded unlimited authority, the rights of non-Muslims were cherished and protected. I may point out, Sir, that it was under Muslim patronage that manyan indigenous language developed in India. My friends, from Bengal would remember that it was under the encouragement of Muslim rulers that the first translations of the Hindu scriptures were made from Sanskrit into Bengali. It is this tolerance which is envisaged by Islam, wherein a minority does not live on sufferance, but is respected and given every opportunity to develop its own thought and culture, so that it may contribute to the greater glory of the entire nation. In the matter of social justice as well, Sir, I would point out that Islam has a distinct contribution to make. Islam envisages a society in which social justice means neither charity nor regimentation. Islamic social justice is based upon fundamental laws and concepts which guarantee to man a life free from want and rich in freedom. It is for this reason that the principles of democracy, freedom, equality,tolerance and social justice have been further defined by giving to them a meaning which, in our view, is deeper and wider than the usual connotation of these words.

The next clause of the Resolution lays down that Muslims shall be enabled to order their lives in the individual and collective spheres in accord with the teachings and requirements of Islam as set out in the Holy Quran and the

fact that such an idea is absolutely foreign to Islam. Islam does not recognize either priesthood or any sacerdotal authority; and, therefore, the question of a theocracy simply does not arise in Islam. If there are any who still use the word theocracy in the same breath as the polity of Pakistan, they are either labouring under a grave misapprehension, or indulging in mischievous propaganda.

You would notice, Sir, that the Objectives Resolution lays emphasis on the principles of democracy, freedom, equality, tolerance and social justice, and further defines them by saying that these principles should be observed in the constitution as they have been enunciated by Islam. It has been necessary to qualify these terms because they are generally used in a loose sense. For instance, the Western Powers and Soviet Russia alike claim that their systems are based upon democracy, and, yet, it is common knowledge that their polities are inherently different. It has, therefore, been found necessary to define these terms further in order to give them a well-understood meaning. When we use the word democracy in the Islamic sense, it pervades all aspects of our life; it relates to our system of Government and to our society with equal validity, because one of the greatest contributions of Islam has been the idea of the equality of all men. Islam recognizes no distinctions based upon race, colour or birth. Even in the days of its decadence, Islamic society has been remarkably free from the prejudices which vitiated human relations in many other parts of the world. Similarly, we have a great record in tolerance, for under no system of Government, even in the Middle Ages, have the minorities received the same consideration and freedom as they did in Muslim countries. When Christian dissentients and Muslims were being tortured and driven out of their homes, when they were being hunted as animals and burnt as criminals - even criminals have never been burnt in Islamic society - Islam provided

in the governance of the people and, therefore, it is also perhaps a little out of fashion to remind ourselves of the fact that the State should be an instrument of beneficence and not of evil. But we, the people of Pakistan, have the courage to believe firmly that all authority should be exercised in accordance with the standards laid down byIslam so that it may not be misused. All authority is a sacred trust, entrusted to us by God for the purpose of being exercised in the service of man, so that it does not become an agency for tyranny or selfishness. I would, however, point out that this is not a resuscitation of the dead theory of Divine Right of Kings or rulers, because, in accordance with the spirit of Islam, the Preamble fully recognizes the truth that authority has been delegated to the people, and to none else, and that it is for the people to decide who will exercise that authority.

For this reason it has been made clear in the Resolution that the State shall exercise all its powers and authority through the chosen representatives of the people. This is the very essence of democracy, because the people have been recognized as the recipients of all authority and it is in them that the power to wield it has been vested.

Sir, I just now said that the people are the real recipients of power. This naturally eliminates any danger of the establishment of a theocracy. It is true that in its literal sense, theocracy means the Government of God; in this sense, however, it is patent that the entire universe is a theocracy, for is there any corner in the entire creation where His authority does not exist? But in the technical sense, theocracy has come to mean a Government by ordained priests, who wield authority as being specially appointed by those who claim to derive their rights from their sacerdotal position. I cannot over-emphasise the

and its polity in accordance with our ideals. I would like to remind the House that the Father of the Nation, Quaid-I-Azam, gave expression to his feelings on this matter on many an occasion, and his views were endorsed by the nation in unmistakable terms. Pakistan was founded because the Muslims of this subcontinent wanted to build up their lives in accordance with the teachings and traditions of Islam, because they wanted to demonstrate to the world that Islam provides a panacea to the many diseases which have crept into the life of humanity today. It is universally recognized that the source of these evils is that humanity has not been able to keep pace with its material development, that the Frankenstein Monster which human genius has produced in the form of scientific inventions, now threatens to destroy not only the fabric of human society but its material environment as well, the very habitat in which it dwells. It is universally recognized that if man had not chosen to ignore the spiritual values of life and if his faith in God had not been weakened, this scientific development would not have endangered his very existence. It is God-consciousness alone which can save humanity, which means that all power that humanity possesses must be used in accordance with ethical standards which have been laid down by inspired teachers known to us as the great Prophets of different religions.

We, as Pakistanis, are not ashamed of the fact that we are overwhelmingly Muslims and we believe that it is by adhering to our faith and ideals that we can make a genuine contribution to the welfare of the world. Therefore, Sir, you would notice that the Preamble of the Resolution deals with a frank and unequivocal recognitionof the fact that all authority must be subservient to God. It is quite true that this is in direct contradiction to the Machiavellian ideas regarding a polity where spiritual and ethical values should play no part

WHEREIN adequate provision shall be made for the minorities freely to profess and practise their religions and develop their cultures;

WHEREBY the territories now included in or in accession with Pakistan and such other territories as may hereafter be included in or accede to Pakistan shall form a Federation wherein the units will be autonomous with such boundaries and limitations on their powers and authority as may be prescribed;

WHEREIN shall be guaranteed fundamental rights including equality of status, of opportunity and beforelaw, social, economic and political justice, and freedom of thought, expression, belief, faith, worship and association, subject to law and public morality;

WHEREIN adequate provision shall be made to safeguard the legitimate interests of minorities and backward and depressed classes;

WHEREIN the independence of the judiciary shall be fully secured;

WHEREIN the integrity of the territories of the Federation, its independence and all its rights including its sovereign rights on land, sea and air shall be safeguarded;

So that the people of Pakistan may prosper and attain their rightful and honoured place amongst the nations of the World and make their full contribution towards international peace and progress and happiness of humanity."

Sir, I consider this to be a most important occasion in the life of this country, next in importance only to the achievement of independence, because by achieving independence we only won an opportunity of building up a country

۲۴

Speech of Prime Minister Liaquat Ali Khan

On the occasion of passing of Objectives Resolution, March 9, 1949

This historic speech, by one of the founding fathers, defines the spiritual and ideological direction of the Islamic State of Pakistan.

"In the name of Allah, the Beneficent, the Merciful;

WHEREAS sovereignty over the entire universe belongs to God Almighty alone and the authority which Hehas delegated to the State of Pakistan through its people for being exercised within the limit prescribed by Him is a sacred trust;

This Constituent Assembly representing the people of Pakistan resolves to frame a constitution for the sovereign independent State of Pakistan;

WHEREIN the State shall exercise its powers and authority through the chosen representatives of the people;

WHEREIN the principles of democracy, freedom, equality, tolerance and social justice, as enunciated by Islam, shall be fully observed;

WHEREIN the Muslim shall be enabled to order their lives in the individual and collective spheres in accord with the teachings and requirements of Islam as set out in the Holy Quran and the Sunnah;

پاکستان کیلئے خلافت راشدہ کا نظام
آمریت رحمانی اور
جمہوریت روحانی

محترم زید حامد کی زیر نظر تصنیف پاکستان ذرائع ابلاغ پر پیش کیے جانے والے پروگرام ''خلافت راشدہ'' پر مبنی ہے۔ جس میں آپ نے اپنے منفرد انداز میں خلافت کے تصور، روحانیت، خلفائے راشدینؓ کی خصوصیات، جدید ریاست، جمہوریت، آمریت اور خلافت راشدہ کے سیاسی، معاشی اور عدالتی نظام پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور باور کرایا ہے کہ موجودہ دور میں پاکستان میں تمام سیاسی نظام ناکام ثابت ہوئے ہیں اور یہ عوام کو قانون و انصاف اور بنیادی ضروریات کی فراہمی دینے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ اس لیے اس ملک کا نظام خلافت راشدہ کے نظام طرز کا ہونا چاہیے۔ تاکہ یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو اور عوام کو ان کے حقوق ان کی دہلیز پر فراہم کیے جائیں۔

یاد رہے کہ جناب زید حامد ایک ممتاز دفاعی تجزیہ نگار اور مبصر ہیں۔ وہ دفاعی حکمت عملی سے متعلقہ معاملات میں وسیع تر تجربہ رکھتے ہیں۔ ریاستی اور غیر ریاستی دہشت گردی، قومی سلامتی، دہشت گردی کے خلاف قابل عمل اقدامات، غیر روایتی جنگ، بغاوتیں اور انکا سدباب، نفسیاتی اور معلوماتی جنگ، مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد سے نمٹنے سے متعلق امور میں بھی انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ جناب زید حامد ایک منفرد لکھاری ہیں۔ دفاعی امور پر آپ کے درجنوں کتابچے اور مضامین شائع بھی ہو چکے ہیں۔ آپ باقاعدگی کے ساتھ بحثیت ایک ماہر تجزیہ نگار مختلف ٹی وی چینلز پر مدعو کیے جاتے ہیں

House # 686, Ammar Shaheed Road(Askari Road)
Chaklala Scheme 3, Rawalpindi, Pakistan.
Land line: +92-51-5598046 -7
Website: www.zaidhamid.pk
E-mail: zaidhamid@zaidhamid.pk